# انتخاب کلام وحید اختر

مرتب

سرورالہدیٰ

# انتخاب کلام وحید اختر

مرتب

سرور الہدیٰ

# انتخاب کلام وحید اختر


مرتب

سرور الہدیٰ



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی


| | | |
|---|---|---|
| پہلی اشاعت | : | 2017 |
| تعداد | : | 550 |
| قیمت | : | -/215 روپے |
| سلسلۂ مطبوعات | : | 1953 |


**Intekhabe Kalame Waheed Akhtar**

By: Sarwarul Hoda

ISBN :978-93-5160-197-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی۔110020

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

# پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

# فہرست


| | |
|---|---|
| ○ ابتدائیہ | xi |
| 1- نظمیں | 1 |
| • تنہائی | 3 |
| • عہدِ آشوب | 8 |
| • چہروں کا سخن | 12 |
| • کھنڈر، آسیب اور پھول | 15 |
| • ازل تا ابد | 17 |
| • دادگر کون ہے | 20 |
| • ز کنارِ ما بہ ز کنارِ ما | 22 |
| • ماورا | 24 |
| • فریب | 26 |
| • شاعری | 27 |

- اجنبی 30
- جلاوطن 32
- کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل 35
- دوام 43
- عدم سے عدم تک 45
- جبر 50
- تشبیب 53
- عکس در عکس 57
- خاموشی کی آواز 60
- ایک اور عالم آشوب 64
- عمرِ رائگاں 73
- بیا تا گل بیافشانیم 74
- مفاہمت 77
- مرگِ انبوہ 79
- صحرائے سکوت 81
- شجرِ ممنوع 106
- جھوٹی سچائی 109
- دیوار 111
- رات کا مکان 114
- دیمک 117
- معراج 119
- یہی تو ہوگا 121
- ایک شام 124

- نقطوں کا سفر 128
- شب کا رزمیہ 131
- راکھ کا گھر 134
- لفظوں کی پوجا 136
- زبان کی موت 140
- معانی کی تلاش 143
- موت کی جستجو 147
- لوحِ غیر محفوظ 149
- ایک اور عالم آشوب 151
- دوری کا نغمہ 160
- وہ ایک شعلہ، منور تھے جس سے لاکھوں دماغ 163
- شب و روز تماشا 166
- ''میں'' کی تلاش 170
- آدمیوں کا چڑیا گھر 173
- بازگشت 176
- ملفوظات 178
- سوادِ دشتِ ندامیں 182
- دُعائیں 201
- مٹی کی صدا 207
- چہل سال عمرِ عزیزم گذشت 211
- لوریؤل کا نیگرو مزدور 216
- ایک شکستہ یورپی انقلابی کے نام 218
- زادِ نجات 222

- چہرہ خانے میں 226
- محوروں کی تلاش 231
- شجرِ نور 235
- ایک تصویر 237
- مکتوبِ زمستاں 239
- ماں 242
- شبِ برات 243
- دفینہ 248
- دشتِ سکوت 251
- کلّ یوم عاشورہ کلّ ارض کربلا 254
- آنکھ سوجا 261
- منظر خواب و شکستِ خواب کے 263
- سخن، اے ہمدمِ دیرینہ 268
- تسخیرِ فطرت 272
- مائیکل انجیلو کے ساتھ ایک دعا 275
- ساقی نامہ 279
- عبادت بے زباں ہے 297
- نوحہ 299
- سمندر میرا رقیب 302
- رفیقِ بیست و پنج و نیم سال 307
- مقتل سے مقتل تک 309
- کال بیل 315

2- غزلیں

317
- اے روشنیِ ماہ اگر تو اُدھر بھی جا 319
- تم گئے ساتھ اُجالوں کا بھی جھوٹا ٹھہرا 319
- دل کے مکیں نے اہلِ شہر سے روٹھ کے اپنا وطن چھوڑا 320
- صبح گل گشت کو نکلی تو یہ تھا حال صبا کا 321
- جس کو مانا تھا خدا، خاک کا پیکر نکلا 322
- خواب شب زندہ داراں میں بیداریوں کا نگر ہے کھلا 323
- دل وہ شعلہ ہے جو بجھ بجھ کے بھی ٹھنڈا نہ ہوا 323
- زبانِ خلق پہ آیا تو اک فسانہ ہوا 324
- ہنستی ہوئی محفل میں کل دل اُمڈ آیا تھا 325
- یہ آج لے کے ہمیں آ گئی کہاں تنہا 325
- گلے بہت تھے، مگر وہ ملا تو کچھ نہ کہا 326
- گئی سر سے ہوائے جنون و ہوس، مرے دل سے طلب کا خمار گیا 326
- عدم بھی ڈھونڈتا ہے دامنِ غبارِ وجود 327
- ہے زمانہ نگہِ حُسن کی تحریر کا نام 328
- سفر ہی بعدِ سفر ہے تو کیوں نہ گھر جاؤں 328
- اے موسمِ خزاں! میں تیرا نوردیدہ ہوں 329
- فرصت ابھی کہاں ہے کہ بپتی رقم کریں 329
- جاگے ہیں بہت، جی میں ہے کچھ دیر کو سو لیں 330
- تم گئے سارے موسم گئے روٹھ کر، ایک بے موسمی ہے جو ٹلتی نہیں 331
- اپنا سرمایہ جز احساسِ زیاں کچھ بھی نہیں 333
- خواب صحراؤں سرابوں میں پھرائیں گے تمھیں 333
- صبح کو دیر بڑی ہے، سو جاؤ 334

- تمھاری آنکھیں چمکتی ہیں دیکھ کر جو مجھے 335
- خموشیوں کا اندھیرا ہے خیمہ زن ہر سو 335
- خوشی سے اب نہ خوشی ہے، نہ غم سے غم ہم کو 336
- پاؤں اُٹھتے ہیں تو زنجیر کی جھنکار کے ساتھ 336
- کوئی نہ ہو، غم نہیں کچھ، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ 337
- کچھ پتا اُن کا بتا مجھ کو چراغِ سحری 337
- سخن کے مطلعِ رنگیں پہ جو تنویر اُترے گی 338
- تیز کرنوں کی سنانوں سے چھدی رات ملی 338
- نہ سحرِ نغمہ، نہ شیرینیِ دہاں کو ملی 339
- صبا! سنبھال کے رکھ نسخۂ خزانی بھی 340
- دشتِ خاموش بھی ہے دشتِ نوا سے آگے 340
- جاگتے زیست کٹے گی، کوئی ایسا نہ بنے 341
- آنکھ جو نم ہو، وہی دیدۂ تر میرا ہے 341
- گمان و شک کے تلاطم! اُتار پار مجھے 342
- خوشبو ہے کبھی، گُل ہے کبھی شمع کبھی ہے 342
- اک غزل آج بہ اندازِ قصیدہ لکھیے 343
- چراغِ عیش بنیں تو مزاج داں کہیے 343
- جنوں پہ اہلِ خرد کی ہے یہ بھی پابندی 344

3- مرثیے 345

- چادرِ تطہیر 347
- بارگہِ لوح و قلم 376
- شہادتِ نطق 477
- سالارِ قافلۂ صبر و رضا 450

# ابتدائیہ

وحید اختر کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے۔

(1) پتھروں کا مغنی (1966)

(2) شب کا رزمیہ (1973)

(3) زنجیر کا نغمہ (1981)

(4) کربلا تا کربلا (1990)

وحید اختر کا انتقال 1996 میں ہوا۔ 'کربلا تا کربلا' (مراثی) ان کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری مجموعۂ کلام ہے۔ 'زنجیر کا نغمہ' (1981) کے بعد کا کلام بھی یکجا صورت میں سامنے نہیں آیا۔ اردو کے سنجیدہ قارئین کا مسلسل تقاضا بڑھ رہا تھا کہ وحید اختر کے شعری مجموعوں کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ مجموعوں کی یکجائی فطری طور پر کلیات کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ انتخاب کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ انتخاب اور کلیات کی اہمیت اور افادیت کا تعلق شاعر سے بھی اور قاری سے بھی۔ قاری اپنی مختلف ضرورتوں کے تحت مختلف موقعوں پر شاعر کا کلام دیکھتا ہے۔ کبھی وہ کلیات کو دیکھنا چاہتا ہے تو کبھی انتخاب کو۔ جب قاری ایک طرح کا نہیں ہے تو ایسی صورت میں کلیات اور انتخاب دونوں کی اہمیت وقت کے ساتھ بڑھتی اور کم ہوتی رہے گی۔ یہ

بات بہت اہم ہے کہ کلیات یا انتخاب کس شاعر کا ہے۔ وحید اختر نے اپنے ابتدائی کلام کو مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی شاعری کے سلسلے میں جذباتی نہیں تھے۔

گذشتہ دہائیوں میں وحید اختر کی نظمیں بطور خاص موضوع بحث رہیں۔ ان پر لکھا کم گیا مگر 'پتھروں کا مغنی' پر علی سردار جعفری اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے تبصروں نے اس کی تلافی کردی۔ وحید اختر کے مراثی کا حوالہ بھی آتا رہا ہے۔ مجموعی طور پر انھیں نظم نگار کے طور پر دیکھا گیا۔ ان کی طویل نظموں کے سیاق میں انھیں لمبی سانس کا شاعر قرار دیا گیا۔ وحید اختر کی غزل کے چند اشعار بھی زبانی اور تحریری طور پر بطور مثال پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ وحید اختر کی تنقید ان کی شاعری کے ساتھ سامنے آتی رہی ہے۔ کبھی شاعری تنقید کی راہ روکتی ہے تو کبھی تنقید کی راہ میں شاعری حائل ہوجاتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم ایک سے دوسرے کی طرف جاتے ہیں یا جاسکتے ہیں۔ ادب میں ہمیشہ یہ ثابت کرنا ضروری نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا ناقد ہے یا اچھا شاعر یا بہ یک وقت شاعر بھی اچھا ہے اور ناقد بھی۔

وحید اختر کو ایک شاعر اور نقاد کی حیثیت سے اس لیے شہرت نہیں ملی کہ وہ شاعر اور نقاد تھے۔ شاعر اور نقاد تو بہت ہوجاتے ہیں۔ اصل بات تو معاصر ادبی صورت حال میں اپنی انفرادیت کا قائم کرنا ہے۔ معاصر ادبی صورت حال رفتہ رفتہ تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ لیکن اچھی تخلیق اور تنقید وقت کو عبور کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس سیاق میں وحید اختر ان چند ادیبوں میں ہیں جن کی تنقید اور تخلیق کے ایک بڑے حصے کو ادبی معاشرے نے یاد رکھا۔

وحید اختر کی ذہانت اور علمیت نے ان کی تخلیقات کو استحکام بخشا ہے۔ علمیت تخلیق کار کو ایک خاص دائرے کا قیدی بھی بنا دیتی ہے۔ وہ مخصوص فکری اور لسانی دائرے میں رہ کر ادب اور زندگی کے بارے میں سوچتا ہے۔ وحید اختر نے تاریخی اور تہذیبی حوالوں کو خالص ادب یا ادب کے ادبی معیار کے نام پر نظرانداز نہیں کیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ وحید اختر تاریخ اور تہذیب کو بعض جوشیلے اور انتہا پسند ترقی پسندوں اور جدیدیوں دونوں سے مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔ جدیدیوں نے تاریخ اور تہذیب کو اہمیت تو دی مگر خالص ہنرمندی کے تصور کے سبب تاریخ اور تہذیب سے سچی اور گہری وابستگی قائم نہیں ہوسکی۔ ترقی پسندوں کا

مسئلہ تاریخ کو ادب بنانا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ تاریخی حقائق کی تجرید نہ ہوسکے۔ ان انتہاؤں کے درمیان وحید اختر نے جو رویہ اختیار کیا اس میں اپنی ہنرمندی اور تاریخی وتہذیبی حوالوں کا احترام ہے۔ وحید اختر کی نثری اور شعری دنیا اس لیے وسیع ہے کہ انھوں نے فکر و اظہار کی سطح پر کوئی پابندی قبول نہیں کی۔ ترقی پسندی سے ان کی شکایت یہ تھی کہ اس نے خود کو فارمولائی بنا لیا۔ جدیدیت اس روش کے خلاف بطور احتجاج سامنے آئی مگر وہ بھی رفتہ رفتہ فارمولے کی نذر ہوگئی۔ وحید اختر نے 'زنجیر نغمہ' میں پس نوشت کے تحت لکھا ہے۔ ''خاص قسم کی آزادی کا پابند ہوجانا نئی طرح کی پابندی ہے۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے وحید اختر کی شاعری کو اس کے اصل سیاق میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نظریاتی طور پر وحید اختر اور خلیل الرحمٰن اعظمی جدیدیت کے حامی اور طرفدار تھے۔ دونوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ جدیدیت کی روح کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ وحید اختر نے شاعری کو جدید بنانے کی اس طرح کوشش نہیں کی جس کی مثالیں ان کے معاصرین کے یہاں ملتی ہیں۔ جس نقاد نے تواتر کے ساتھ جدید حسیت کو موضوع گفتگو بنایا اس کی شاعری کا مکمل طور پر جدید نہ بن پانا ایک واقعہ ہے۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ وحید اختر کی شاعری جدیدیت کی نمائندہ شاعری نہیں بن سکی۔ میری مراد اس جدیدیت سے ہے جس نے جدید حسیت کو اوڑھی ہوئی پیچیدگی اور صناعی سے مشروط کردیا تھا اور لازماً ترسیل کی ناکامی کو نئی شاعری کی پہچان قرار دیا تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی 'پتھروں کا مغنی' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جن لوگوں نے وحید اختر کی بعض نظمیں اور غزلیں اِدھر اُدھر سے پڑھی ہوں گی یا خود ان کی زبان سے سننے کا موقع انھیں ملا ہوگا ممکن ہے ان کا پہلا تاثر یہ ہو کہ یہ شاعری اپنے انداز و اسلوب کے اعتبار سے اس شاعری سے کچھ مختلف نہیں ہے جسے ہم ترقی پسند شاعری کہتے آئے ہیں۔ اس لیے کہ نئی نسل کے بہت سے دوسرے شعرا کے برخلاف ان کے یہاں اختصار اور پیچیدگی کے بجائے پھیلاؤ اور صراحت ملتی ہے۔'' (ص216)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے وحید اختر کی نظم کے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جدیدیت نے ارتکاز اور ابہام کو اہمیت دی تھی۔ نظم کے پھیلاؤ کو عموماً نظم کی فنی کمزوری سمجھا گیا۔ جو چند طویل نظمیں وجود میں آئیں ان پر اچھی تنقید نہیں لکھی گئی۔ مختصر نظمیں طویل نظموں کے مقابلے میں اگر زیادہ توجہ کا مرکز بنیں تو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ وحید اختر کی مختصر نظموں میں اختصار بھی ہے اور پیچیدگی بھی، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختصر نظموں میں فطری طور پر اختصار ہوگا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس رائے میں بڑی صداقت ہے کہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں وحید اختر کے یہاں پھیلاؤ اور صراحت ملتی ہے۔ وحید اختر نے اختصار اور پیچیدگی کو اپنی شرطوں پر دیکھا۔ وحید اختر کا تخلیقی مزاج جس حد تک نئی نظم کی مخصوص شعریات کو قبول کرسکتا تھا اس سے زیادہ قبول کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پھیلاؤ اور پیچیدگی کا تعلق نظم کی ساخت سے ہے۔ اسے ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک طویل نظم میں کچھ مصرعے زائد ہوسکتے ہیں انھیں حذف کردینے سے نظم کی ساخت متاثر نہیں ہوگی۔ ایسی صورت میں نظم سے زائد مصرعوں کو نکال دینے کے بعد بھی طویل ہوسکتی ہے اور پیچیدہ بھی۔ ہم جسے نظم کا ارتکاز اور پیچیدگی کہتے ہیں ممکن ہے وہ معنی آفرینی کا وسیلہ نہ بنے۔

وحید اختر کا مسئلہ نئی حسیت تھی، اسلوب نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ شعوری اور غیر فطری طور پر نظم کو ہیئتی بنانے کی کوشش کرتے۔ روایت ان کے لیے آسیب نہیں تھی اور وہ کسی اسلوب کو فیشن میں رد کرنا نہیں چاہتے۔ ایک ہی نظم میں واقعے کی مناسبت سے کئی اسالیب سے کام لیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے وحید اختر کی نظموں کے بعض مصرعے اضافی معلوم ہوں مگر تخلیق کار کی طبیعت کی روانی اور وفور کہاں جا کر دم لے گی اس کا فیصلہ کوئی نقاد یا قاری تو نہیں کرسکتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے یہ بھی لکھا ہے:

> ''لیکن اس مجموعہ کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان نظموں اور غزلوں میں ہمیں جو فضا ملتی ہے اور اس کے اندر سے شاعر کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف ہے۔ ان نظموں اور غزلوں کا شاعر اپنے جسم کے اعتبار سے اپنے بزرگ معاصرین سے مشابہ ہو تو ہو اپنی روح اپنے باطن کے

اعتبار سے وہ ایک نئے وجود کا حامل ہے۔''

گویا پرانے اسلوب میں نئی حسیت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس تبصرے میں ترقی پسندی کے لیے کوئی ہمدردانہ جذبہ نہیں ہے۔ 1960 کے آس پاس کی دنیا جیسی تھی اور اس نے جس طرح اذہان کو متاثر کیا اس جانب بھی یہاں اشارہ موجود ہے۔ وحید اختر نے خود بھی نئی نظم پر تفصیل سے لکھا مگر نئی نظم کی وکالت سے ترقی پسند سرمایے کی تضحیک کا پہلو نہیں نکلتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نئی نسل کے داخلی مسائل کو خارجی مسائل کا زائیدہ بناتے ہوئے اس کی سچائی پر اصرار کرتے ہیں لیکن ان کی درج ذیل رائے کی اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی:

''یہ شاعری فرد پرستی اور سماج دشمنی کے نتیجے میں نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ فرد اور جماعت کے حقیقی تعلق کو سمجھنے اور ان کا ادراک حاصل کرنے کی ایک مخلصانہ کاوش ہے۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی کو فرد پرستی اور سماج دشمنی کا خیال یوں ہی نہیں آیا۔ وحید اختر نے 'پتھروں کا مغنی' کے پیش لفظ میں اپنی شاعری اور اپنے عہد کے مسائل کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک سچے اور ذہین تخلیق کار کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ 'پتھروں کا مغنی' ان چند شعری مجموعوں میں ہے جسے ترقی پسندی اور جدیدیت کے بامعنی رشتے کی جستجو کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ ظفر اقبال کی 'گل آفتاب'، شہریار کی 'اسم اعظم'، خلیل الرحمٰن اعظمی کی 'نیا عہد نامہ'، بشیر بدر کی 'اکائی' ان چند مجموعوں میں ہیں جس کے ذکر کے بغیر نئی حسیت پر گفتگو مکمل نہیں ہوگی۔

وحید اختر کی نظموں میں خود کلامی کا وہ انداز نہیں ہے جسے عموماً جدیدیت سے وابستہ شاعری کے لیے لازمی تصور کیا گیا۔ وحید اختر نے کبھی خود کلامی کو ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ان کے تخلیقی اور تنقیدی ذہن میں کسی بھی رجحان یا رویے کا اصل سیاق ہوتا ہے۔ ایک جگہ کوئی چیز غیر اہم اور اوڑھی ہوئی معلوم ہو سکتی ہے اور دوسری جگہ وہ چیز برجستہ اور مناسب ہو سکتی ہے۔ نئی نظم کی تنقید میں جب نظم کو سیاق سے کاٹ کر دیکھا گیا تو غیر ضروری طور پر انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی۔ وحید اختر نے اپنی نظموں کو کسی خاص ہیئت اور فکر کا پابند نہیں بنایا۔ ان کی بعض نظموں کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ پابندی اور بغاوت کا سفر ایک ساتھ جاری

رہتا ہے اور کبھی الگ لگ بھی۔ نظم کی خارجی ہیئت پہلے ہی قاری کو متوجہ کرلیتی ہے۔ آزاد اور پابند نظم میں بہتر کون سی ہیئت اور آزاد نظم کہنے کا حق کسے حاصل ہے، یہ سب باتیں وحید اختر کی نظم نگاری کے سیاق میں اہمیت اختیار کرلیتی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ 60، 70 کی دہائی میں آزاد اور نثری نظم کے تخلیقی عجز کو چھپانے کا وسیلہ بنایا گیا۔ وحید اختر کی نظم یہ بتاتی ہے کہ کسی ہیئت کو اختیار کرنا اپنے تخلیقی عمل اور تخلیقی تقاضے کا خیال رکھنا ہے۔ اول و آخر تو تخلیقی حسیت ہے۔ انھوں نے تخلیقی سطح پر یہ بھی بتایا کہ نظم کہنے کے لیے فکر و خیال کی دنیا کا وسیع ہونا ضروری ہے۔ وسعت کے بعد بھی مختصر نظم بامعنی ہوسکتی ہے۔ مختصر نظم کے چھوٹے بڑے مصرعے غزل کے مصرعوں کی طرح بامعنی اور معنی آفریں ہوسکتے ہیں لیکن اس کے لیے ذہن کا بڑا ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں منیر نیازی اور شہریار کی مختصر نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ وحید اختر نے مختصر نظمیں کم لکھیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس خیال کا حوالہ آچکا ہے کہ وحید اختر کے یہاں پھیلاؤ اور وضاحت ہے۔ اصل میں وحید اختر کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنی بات چند مصرعوں میں سمیٹ سکیں۔ انھوں نے شعوری طور پر مسائل کے اظہار میں کسی طرح کی رکاوٹ قبول نہیں کی۔ جن شعرا کی مختصر نظموں یا ان کی نظم نگاری کی جامعیت اور پیچیدگی کو بطور خاص اہمیت دی جاتی ہے، انھوں نے وحید اختر کی طرح طویل نظمیں نہیں لکھیں۔ وحید اختر کے مراثی اور ان کی طویل نظمیں یہ بتاتی ہیں کہ فکر و خیال کی وسعت کا مطلب کیا ہے۔ آپ مصرعے کو زائد بتا کر نظم کے ارتکاز پر سوالیہ نشان قائم کرسکتے ہیں، اسے جوش کی نظم سے قریب بتا سکتے ہیں لیکن فکری وفور اور قادرالکلامی سے انکار نہیں کرسکتے۔ وحید اختر کے معاصرین میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کو زبان و بیان پر اتنی قدرت ہو اور جو عصری مسائل کو ایک بڑے سیاق میں دیکھ سکے۔ اس کی وجہ بہت سامنے کی ہے۔ وحید اختر نے زندگی اور فن کی بعض قدروں اور سچائیوں کو مستقل تصور کیا۔ رجحانات کی آتی جاتی لہروں سے انھوں نے خود کو الگ نہیں کیا مگر ان کی ایک اپنی نظر تھی جو عالمی ادب کے مطالعے سے بھی بنی تھی۔ وحید اختر کی شاعری میں زمانے اس طرح گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ اسے الگ الگ کرنا دشوار ہے۔ یہ کام وہی کرسکتا ہے جس کا ذہن علم و احساس کی سطح پر کسی ازم یا رجحان کا قیدی نہ ہو اور جو مختلف زمانوں اور انسانی تاریخ و تہذیب کا بوجھ اٹھا

سکتا ہو۔ اس کے بغیر نہ طویل نظم لکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی اچھی مختصر نظم۔ میں لکھ چکا ہوں 1960 کی دہائی میں جو چند اچھے شعری مجموعے منظر عام پر آئے ان میں 'شب کارزمیہ' بھی ہے۔ یہ مجموعہ ترقی پسندی سے جدیدیت کی طرف بڑھتے میلان کا پتہ دیتا ہے لیکن 'شب کارزمیہ' کو اگر توجہ سے پڑھا جاتا تو 'جدیدیت نئی ترقی پسندی' کا مفہوم سمجھ میں آسکتا تھا۔ یہ عنوان محمد حسن نے قائم کیا تھا۔ رفتہ رفتہ جدیدیت ترقی پسندی سے شعوری انحراف کے سبب ہیئت پرست ہوگئی۔ وحید اختر نے اپنی شاعری میں ترقی پسندی کو زندگی اور ادب کی بنیادی قدر کے طور پر دیکھتے ہوئے وجودی انسان کا احترام باقی رکھا۔ اسی لیے وحید اختر کی شاعری کا داخلی اور خارجی آہنگ کسی ایک رویے یا رجحان کا ترجمان نہیں بن سکا۔ وحید اختر کے یہاں ایک فرد کا دکھ اجتماعی دکھ بن جاتا ہے، خاموشی، تنہائی، لاحاصلی، لایعنیت، ان تمام کیفیات اور احساسات کو جدیدیت نے جس طرح دیکھا اور سمجھا تھا ان سے ادب کے سنجیدہ قارئین واقف ہیں۔ وحید اختر نے ان کیفیات کو اس عہد کے ایک ذہین اور حساس تخلیق کار کے طور پر محسوس کیا تھا۔ جیسا کہ اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ یہ کیفیات بیشتر شعرا کے یہاں بہت محدود اور اکہری معلوم ہوتی ہیں، وحید اختر نے انھیں اتنی وسعت عطا کردی ہے کہ وہ انسانی المیہ میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ 'شب کارزمیہ' کی کئی نظمیں ایک ذہین اور حساس تخلیق کار کے دکھ اور اس کے غم وغصہ کا اظہار معلوم ہوتی ہیں۔

وحید اختر نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اقبال کے ساتھ عظیم شاعری کا تصور بھی رخصت ہوگیا، گویا اقبال کے بعد جو شاعری سامنے آئی اس میں عظمت کے عناصر تو تھے لیکن یہ عظیم نہیں تھی، وحید اختر کے ذہن میں وہ اقدار ہیں جن سے کوئی شاعری علم و ذہانت کے ساتھ عظمت کے مقام پر فائز ہوتی ہے۔ جب عقیدہ اور تصور متزلزل ہو اور انسان فکر و احساس کی سطح پر چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا رہا ہو ایسے میں کسی ایسی شاعری کا وجود میں آنا دشوار ہے جو انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ کائناتی بھی ہو۔ وحید اختر نے اپنی شاعری میں اس کائناتی آہنگ کو برتنے کی کامیاب کوشش کی۔ 'شب کارزمیہ' کی پہلی نظم 'شاعری' ہے۔ یہ نظم شاعر کا نظریۂ شعر بھی ہے اور نظریۂ کائنات بھی۔ یہ ایک آزاد نظم ہے جس میں شاعر کا تخیل اپنی ذات کے زنداں سے نکل کر کائنات میں باہیں ڈال دیتا ہے۔ وہ زماں مکاں کی سیر کرتا ہوا ذات کی

طرف آتا ہے۔ اس درمیان اسے زندگی اور کائنات کی مختلف سچائیاں متوجہ کرتی ہیں۔ ان سچائیوں کا رشتہ زندگی کی تلخ سچائیوں سے ہے۔ آپ انھیں زندگی کی بدصورتیاں کہہ لیجیے:

خلوتِ ذات کے محبس میں وہ بے نام اُمنگ
جس پہ کونین ہیں تنگ
چھان کر بیٹھی ہے جو وسعتِ صحرائے زماں
جس کو راس آ نہ سکی رسم و رہِ اہلِ جہاں
نشۂ غم کی ترنگ
خود سے بھی برسرِ جنگ
پستیِ حوصلہ و شوق میں ہے قید وہ رُوحِ امکاں
شورِ بزمِ طرب و شیونِ بزمِ دل میں
دہر کی ہر محفل میں
جس نے دیکھی ہے سدا عرصۂ محشر کی جھلک
بوئے بازار میں گُم کردہ رہی جس کی مہک
عالمِ آب و گل میں
جہد کی ہر منزل میں
اپنے ہی ساختہ فانوس میں ہے قید وہ شعلے کی لپک

نظم کے ابتدائی یہ دو بند جس فکری بلندی اور کائناتی آہنگ کا پتہ دیتے ہیں وہ وحید اختر کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ ان میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے ہم مانوس نہ ہوں مگر شاعر انھیں جس طرح برتنے میں کامیاب ہوا ہے وہ فکری بلندی کے ساتھ لسانی اظہار کی بھی تو بات ہے۔ یہ وہ لسانی اظہار ہے جو لفاظی اور بے معنی لسانی جز یرہ نہیں۔ بہت غور و فکر کے بعد زبان نے اپنا عمل شروع کیا ہے۔ پہلا ہی مصرعہ بظاہر جدیدیت کا زائیدہ معلوم ہوتا ہے۔ 'خلوت ذات کے محبس میں وہ بے نام امنگ' مگر اس بے نام امنگ پر کونین تنگ بھی تو ہے۔ ذات سے کائنات تک کا یہ سفر کس قدر صبر آزما ہے مگر دیکھیے اس امنگ کو بالآخر پناہ خلوت ذات ہی

میں ملی۔ یہاں کوئی نظریہ تیرتا نظر نہیں آتا۔ ایک شعلہ فطری طور پر بھڑکتا ہے مگر اس شعلے کی پرورش و پرداخت میں ایک باشعور تخلیقی ذہن نے حصہ لیا ہے جس کے پاس نظر اور نظریے کی وہ دولت ہے جس سے نہ انسانی اقدار کو خطرہ ہے اور نہ شعر و ادب کی بنیادی قدروں کو۔ اس عمل میں تشکیک بھی سر اٹھاتی ہے اور غم و غصہ بھی۔ یقین کی شمع بھی روشن ہو جاتی ہے اور بے یقینی کے اندھیرے بھی راستہ روکتے ہیں۔ یہ حقائق وحید اختر کے یہاں زندگی اور ادب دونوں کو قوت بخشتے ہیں۔ وحید اختر نے زندانِ ذات کو کائنات کا مرکز قرار دیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ زندانِ ذات کی صورت نئی شاعری میں ایک جیسی نہیں ہے وحید اختر کا ذہن کچھ یوں سوچتا ہے:

اِسی زندان کی دیواروں پہ آتے ہیں نظر شام وسحر
عکس بن کر شجرِ دہر کے سب برگ وثمر
یہیں احساس کی شاخوں پہ کلی بنتی ہے دوشیزۂ گل
یہیں جذبات کے آئینے میں آتا ہے نظر جزو میں کل
یہیں ادراک کو ملتے ہیں تعقل کے حسیں پیمانے
یہیں تخئیل میں نادیدہ جہانوں کے ہیں دولت خانے
اپنا ہر نقشِ قدم چھوڑ کے جاتا ہے یہاں قافلۂ وقتِ رواں

وحید اختر نے خلوت ذات کو تخئیل کی جس اعلیٰ ترین منزل سے ہم آہنگ کر دیا ہے وہ نئی نظم میں ان کا اختصاص ہے۔ خلوت ذات عموماً سسک کر چھوٹی سی فکری دنیا کا حوالہ بن جاتی ہے۔ زنداں کی دیواروں پہ شام سحر کا نظر آنا، احساس کی شاخوں پہ دوشیزہ گل پر کلی کا بننا، جذبات کے آئینہ خانہ میں جزو کا کل نظر آنا۔ ادراک کو تعقل کے حسیں پیمانے کا ملنا، تخئیل کے نادیدہ جہانوں کے دولت خانے کا سراغ ملنا اور پھر قافلہ وقت رواں کا نقش چھوڑ جانا۔ خلوت ذات کی عظمت کی جانب اشارہ ہیں۔ یہاں ماضی اور حال ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ جزو اگر کل نظر آتا ہے تو حال کیوں کر صرف حال رہے گا۔ نادیدہ جہانوں کے دولت خانے کی تعبیر حال کی روشنی میں نہیں ہو سکتی۔ وحید اختر نے شاعری کے فکری و فنی لوازمات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ شاعری کے داخلی اور خارجی مسائل و اسباب کو نثر میں بیان کرنا آسان ہے۔ وہ نظم ان مصرعوں پر ختم ہو جاتی ہے:

یعنی خود ساختہ فانوس میں ہے قید وہ شعلے کی لپک
ہم نفس جس کی ہے صد گونہ جہنم کے عذابوں کی کسک
پھر بھی دکھلاتی ہے ہر آنکھ کو جو جنت فردا کی جھلک

وحید اختر کی شاعری کا یہ پہلا انتخاب ہے جو منظر عام پر آرہا ہے۔ان کے تمام مجموعے اب مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ایسی صورت میں وحید اختر کی شاعری کا یہ انتخاب وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ انتخاب کبھی بھی کلیات کا بدل نہیں ہو سکتا، مگر انتخاب کسی شاعر کے نمائندہ اسلوب سے ہمیں آشنا ضرور کرتا ہے۔ انتخاب کو چاہے جس قدر معروضی بنایا جائے اس عمل میں انتخاب کرنے والے کی ترجیحات بھی خاموشی کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس انتخاب میں میری اپنی پسند کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ وحید اختر کے کلام کا اہم ترین حصہ اس میں شامل ہو جائے، عموماً کسی قاری کی پسند کو غیر معروضی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کسی کی پسند میں ہماری پسند بھی شامل ہو سکتی ہے۔ وحید اختر کے کلام کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے جسے شاد کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے۔

وہ عالم گیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا

اس انتخاب میں نظمیں، غزلیں اور مراثی شامل ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کا ممنون ہوں کہ اس اہم کام کی ذمے داری میرے سپرد کی گئی۔

سرورالہدیٰ
(شعبۂ اردو)
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

30 اکتوبر 2016

# نظمیں

# تنہائی

بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
ہر ایک گام نیا جادہ، مشکلات نئی
نئے تقاضے، نئے تجربے، نئے آلام
ہر اک مقامِ سفر پر ہے کائنات نئی
وہی ستارے، وہی چاند، اور وہی سورج
مگر نیا ہے ہر اک دن، ہر ایک رات نئی
عجیب بات ہے مرنے کی آرزو کرکے
کبھی کبھی تو ملی ہے مجھے حیات نئی
بزورِ جہدِ مسلسل، بہ فیضِ عزم و عمل
ہر ایک مشکلِ راہِ سفر ہوئی آساں
بہ تابِ شمعِ یقین و بہ گرمیِ رفتار
ہر ایک منزلِ دشوار کے ملے ہیں نشاں
جنھوں نے مجھ کو سہارا دیا تھا آج تلک

وہ حوصلے وہ عزائم جوان ہیں اب بھی
جو تنگ تھے مری مشکل پسند ہمت پر
وہی حدودِ زمان و مکان ہیں اب بھی
مگر حیات میں آیا ہے کون سا یہ مقام
ہوا ہے آج مرے دل کو شکوۂ آلام
دلِ جواں سے عبارت ہے زندگی اپنی
اسی سے نشہ ہے کس طرح اس کو ٹھکراؤں
یہ کشت زار مرے ہی لہو نے سینچی ہے
یہی رفیقِ سفر ہے، یہی ہے راہ نما
اسی کے فیض سے ہے سیلِ زندگی جاری
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
بغیر ہمرہیِ دل نہ چل سکوں گا میں

نہ جانے کون سی منزل پہ آج آ پہنچا
نہ جانے کس کا مجھے آج انتظار سا ہے
میں خود کو جتنا بھی بہلاوے دینے کی خاطر
ہجوموں، انجمنوں، محفلوں میں لاتا ہوں
پکارتا ہے یہ دل، تُو تو اب بھی تنہا ہے

اداس رات! طویل و خموش و نوحہ کناں
تمام عرصۂ گہہِ زیست خواب گاہِ عظیم
ہوا بھی چلتی ہے تھم تھم کے سسکیاں بھرتی
دکھا رہا ہے غمِ دل کو جیسے آئینہ

چہار سمت اڑاتا ہے چاندنی کا غبار
بہت گراں ہے شبِ ماہتاب و تنہائی
یہ چاند تارے مرے دردِ دل کو کیا جانیں
ضمیرِ ارض کی اونچائیو سہارا دو
یہ تیرگی ہے کہ گھٹتا ہے دم اجالوں کا
مجھے امید کی پرچھائیو سہارا دو

خوشا کہ موجِ تصور ہوئی ہے بال کشا
مقامِ میکشی و بے خودی پہ آپہنچا
خیالِ یار کا پیکِ سبک خرام آیا
دیارِ دوست سے دل کے لیے پیام آیا
ٹھہر بھی جا کہ ستاروں کو نیند آتی ہے
جگا کے چاند کو ان کی سواری آتی ہے
سکوتِ شب کو بھی اذنِ نواگری دے دو
نفس نفس کو زبانِ پیمبری دے دو
بہت حسیں ہیں شب و روز و آفتاب و قمر
کسی کے حسن کا پرتو ہے یا عروجِ نظر
خیالِ یار کی رنگینیاں معاذ اللہ
وصالِ دوست کی ساعت، گناہِ پاکیزہ
کچھ اتنی مست ہوئی جارہی ہے بزمِ خیال
تمام عشق کا پرتو، تمام عکسِ جمال
یہی صنم کدۂ ذہنِ شاعرِ تنہا
یہی ہے معبدِ فکر و نظر، یہی قبلہ

یہاں نہیں کبھی دل کو ملالِ تنہائی
ہجومِ ناز و ادا کی ہے محفل آرائی
غرورِ حسن ہے خود عشق کا تمنائی
بہت طویل ہے یوں تو حدیثِ بزمِ خیال
مگر زباں کو نہیں شرحِ حرفِ دل کی مجال

بہت عزیز سہی مجھ کو بزمِ فکر و خیال
بہت طویل سہی یہ حضوریِ جاناں
عزیز تر ہیں مگر زندگی کے ہنگامے
طویل تر ہے مگر ساعتِ غمِ دوراں
زمیں پہ کھینچ ہی لاتی ہے بے پناہ کشش
خمار ٹوٹ ہی جاتا ہے ایک منزل پر
جسے کیا تھا بہ مشکل اسیرِ دامِ خیال
نکل ہی جاتا ہے وہ دسترس سے پھر باہر
فقط خیال سے تنہائیاں نہیں کٹتیں
فقط بیان سے دشواریاں نہیں گھٹتیں
مرے صنم کدۂ ذہن کی حسیں معبود
تخیلات کے پردہ سے باہر آجاؤ
زمین کو ہی بنانا ہے جنتِ انساں
فرازِ جنتِ تخیل سے اتر آؤ
نہ جانے کتنے فسانوں کا آج عنواں ہو
حقیقتوں کو بھی اب اپنا رنگ دکھلاؤ
ہزار روپ سے چھپ چھپ کے مسکراتی ہو

کسی بھی روپ میں اب سامنے تو آجاؤ
ڈرا رہی ہے غمِ روزگار کی ظلمت
نظر نظر میں غمِ دل کی روشنی لاؤ
سفر طویل ہے، منزل ہے دور، سخت ہے راہ
اب اور سختیِ ہجراں میں یوں نہ تڑپاؤ
بہت ہی سخت مراحل ہیں زندگانی کے
رفاقتِ دلِ تنہا اب آ کے فرماؤ

تمھاری آنکھوں سے پیتا رہوں شراب اگر
ہر ایک زہر کو پی کر بھی جی سکوں گا میں
تمھاری زلف کے سایہ میں ہے پناہ اگر
بھڑکتی آگ کے شعلوں سے کیا ڈروں گا میں
متاعِ زیست گراں ہے اگر زمانہ میں
تمھارا حرفِ محبت حیات پرور ہے
بہت ہی تیرہ و مایوس کن ہے رات اگر
تمہاری اک نظرِ التفات رہبر ہے
ابھی تو اور بھی دشواریاں ہیں راہوں میں
تمھارا ساتھ اگر ہو تو سہل ہے سب کچھ

(13 اکتوبر 1953)

# عہدِ آشوب

یہ عہدِ کرب، یہ تشکیک و انتشار کا دَور
دماغ دیتے ہیں لَو تیرگی کے دامن میں
اُتر رہا ہے خمارِ شرابِ عہدِ کہن
سمجھ رہی ہیں فضا کو ابھی نئی شمعیں
خموش ہوتے چلے ہیں چراغِ آخرِ شب
دلوں کے داغ ہیں لے دے کے روشنی کے لیے

تمام رات کی بیداریوں نے چھین لیا
بچا بچا کے رکھا تھا جو خونِ تشنہ لبی
اُسی کو صبح کا تارا سمجھ لیا ہوتا
یہ وہ تک آنہ سکا میرا ماہِ نیم شبی
فریضۂ سحری کے لیے وضو کیا ہو
اب اشک ہی نہیں اس طرفہ بندگی کے لیے

سیاہیوں میں بھٹک کر افق سے تا بہ افق
نظر لڑی بھی تو ٹوٹے ہوئے ستاروں سے
کرم کی آس دلانے کے ساتھ ہی، جیسے
شکستہ جام بھی چھن جائیں بادہ خواروں سے
کھڑے ہیں کاسہ بکف ظلمتوں کی چوکھٹ پر
مہ و ستارہ و خورشید روشنی کے لیے
فریب کھائے ہیں اتنے بہ نامِ فصلِ بہار
اب اعتبارِ مسیحائیِ صبا بھی نہیں
حصارِ لالہ و گل توڑ کر کدھر جائیں
جو قید بھی نہیں، پرواز آشنا بھی نہیں
عبارت آج ہے زخموں کے مسکرانے سے
شگفتِ گل کبھی تشبیہ تھی ہنسی کے لیے

چمن سیاستِ گل چیں سے ہے خزاں آثار
نسیمِ صبح پہ در بند ہے، سموم آزاد
وہ جن پہ آج بھی ثابت ہے جرم بے گنہی
قفس میں کاٹ رہے ہیں سزائے بے میعاد
حضورِ مرگ عروسِ حیات رو رو کر
خطا معاف کراتی ہے زندگی کے لیے

علوم و نغمہ و تہذیب و شعر کے خالق
طلا و سیم کے بازار میں ہیں جنسِ حقیر
پیمبرانِ زمانہ، مزاج دانِ حیات
بتانِ جہل و توہم کی زلف میں ہیں اسیر

جنھیں عظمتِ انساں کے رازداں کہیے
صنم کدوں میں بھٹکتے ہیں بندگی کے لیے

کچھ اس طرح سے لٹے رہروانِ راہِ حیات
عقیدتوں کا سہارا نہ تکیۂ تقدیر
ہر اک اُمید گریزاں، ہر ایک خواب تباہ
جو آج دوڑ کے ہوں بھی تو کس کے دامن گیر
ہزاروں صدیوں نے دی تھیں جو گل شدہ شمعیں
پڑا جو وقت، نہ کام آئیں روشنی کے لیے

بہت ہی سخت ہے یہ جادۂ ثباتِ طلب
پُرانے راہنماؤں کے ساتھ چھوٹ گئے
جنھوں نے دی تھیں پناہیں قدم قدم پہ کبھی
وہ آسرے بھی مثالِ حباب ٹوٹ گئے
کچھ ایسی منزلِ دشوار آگئی ہے قریب
خضر بھی سر بہ گریباں ہے رہبری کے لیے

یہ کس مقام پہ واماندگی نے روکا ہے
نظر کے سامنے ہے منزلِ طلب کا سواد
سمیٹنا ہے ابھی تجربوں کو دامن میں
کہ خستگی جنوں بھی ہے مرحلہ ایجاد
دھواں دھواں سے مناظر، تھکی تھکی سی نظر
کمی تو حربے ہیں اب سعی زندگی کے لیے

پکارتی ہے دلِ کائنات کی دھڑکن
کہیں نہ معرکۂ خیر و شر کی منزل ہو
بلند اُٹھ کے بھی موجیں پلٹ پلٹ آئیں
کہیں کہیں نہ یمِ کشمکش کا ساحل ہو
اٹھا رہا ہے نیا جام ساقیِ دوراں
جو ہوگا فتح کی تقریبِ آخری کے لیے

شعاع ریز نہیں دستِ وقت میں ساغر
چمک رہا ہے ہماری ہی تشنگی کا لہو
ہر ایک ریزۂ مینا بنے گا پیمانہ
ہزار بار بھی ٹوٹے جو خونِ دل کا سبو
یہ میکدہ تو نہ اجڑے گا لٹ کے بھی سو بار
ہزار راہ ہیں تسکینِ تشنگی کے لیے

(1955)

# پتھروں کا مغنی

مطربِ خوش نوا زندگی کے حسین گیت گاتا رہا
اُس کی آواز پر انجمن جھوم اٹھی
اُس نے جب زخمِ دل کو زباں بخش دی
سننے والوں نے بیساختہ آہ کی
عشق کے ساز پر جب ہوا نغمہ زن
شورِ تحسیں میں خود اُس کی آواز دب سی گئی

مطربِ خوش نوا پھر بھی تنہا رہا

تشنگیِ مشام اُس کو بادِ صبا کی طرح گُل بہ گُل لے گئی
کاسۂ چشم نے پرتوِ گُل بھی پایا نہیں
درد اُس کا کسی محرمِ درد کے واسطے
در بہ در، شہر در شہر پھرتا رہا

دادِ تحسین کے ہنگامۂ ذوق کش میں اُسے
ہر طرف سے ملامت کے پتھر ملے
مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
پتھروں کو زباں تو ملی، پر تکلّم نہیں
پتھروں کو ملے ہونٹ، لیکن تبسم نہیں
پتھروں کو ملی آنکھ، لیکن نظر کون دیتا اُنھیں
پتھروں کو ملے کان، پر ذوقِ نغمہ نہیں
پتھروں کو خد و خالِ انساں ملے، دولتِ درد و غم کب ملی
پتھروں کو حسیں صورتیں تو ملیں، دل نہیں مل سکا
پتھروں کو ملے پاؤں، پر اعتمادِ سفر کون دے
پتھروں کو ملے ہاتھ، پر عزمِ تیشہ زنی کون دے

سنگ سنتے ہیں، لیکن سمجھتے نہیں
دیکھتے ہیں، مگر فرق کرتے نہیں
بات کرتے ہیں، محسوس کرتے نہیں
ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن پگھلتے نہیں
گرد بن کر یہ اڑ جائیں، سانچوں میں ڈھلتے نہیں

مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
مطربِ خوشنوا پتھروں کو سناتا رہا دردِ دل
اپنا غم
اُن کا غم
سب کا غم

پتھروں نے سنا اور چپ چاپ ہنستے رہے
پتھروں کی اسی انجمن کا مغنّی ہوں میں
اور بے درد، بے حس، ستم گار پتھر سنیں گے کبھی
اُن کا وہ مطربِ خوشنوا

شکوہ سنجِ زماں
اپنے نغمات کی آگ میں جل گیا
یا پھر اُن ہی کے مانند پتھر کا بت بن گیا

(1959)

# کھنڈر، آسیب اور پھول

یہ بھی طلسم ہوش ربا ہے
زندہ، چلتے پھرتے، ہنستے روتے، نفرت اور محبت کرتے انساں
صرف ہیولے اور دھویں کے مرغولے ہیں

ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے توہم کے کاندھوں پر لادے سست قدم وامانده
خاک بہ سر، دامان دریده، زخمی پیروں سے کانٹوں انگاروں پر چلتے رہتے ہیں
ہم سب ایک بڑے قبرستاں کے آوارہ بھوت ہیں
جن کے جسم تو ہاتھ لگانے سے تحلیل خلا میں ہوں
جن کی روحوں کا ظاہر سے ظاہر گوشہ ہاتھ نہ آئے

ہم کو ماضی سے ورثے میں کہنہ قبریں، گرتے ملبے اور آسیب زدہ کھنڈروں کے ڈھیر ملے ہیں
وہ روشن شب تاب دیے جن سے ماضی کو نور ملا تھا
اس آسیب زدہ ماحول میں یوں جلتے ہیں

جیسے اک پر ہول بیاباں کے تیرہ سناٹے میں
کچھ بھوتوں نے
رہ گم کردہ سیاحوں کو بھٹکانے کی خاطر آگ جلائی ہو
اب یہ اُجالے صرف دھواں ہیں
اور آسیب زدہ کھنڈروں کی چھت کے چٹختے شہتیروں کے شور میں کوئی ہنستا ہے
جھڑتا چونا، گرتی مٹی، نیم معلق دیوار و در
چپکے چپکے روتے ہیں
طاقوں کے خاموش دیے ظلمت کو بڑھاوا دیتے ہیں
صحن کے صد ہا سال پُرانے بوڑھے پیڑ
قبروں کے بے درد مجاور بن کر لاشوں پر سوکھے پتوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں

ہم سب اپنی لاشیں اپنے انا کے دوش پہ لادے
اک قبرستاں کی پُر ہول اداسی سے اکتائے ہوئے
ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں
منتظرِ مرگِ انبوہ ہجوم آنکھوں کے خالی کاسے کھولے ہر سو دیکھ رہا ہے
جانے کب کوئی آئے گا جو اپنے دامن کی ہوا سے آگ لگا کر
بھوتوں کا جلنا دیکھے گا
اور بھیانک سائے گلے مل مل کر کھوکھلی آوازوں میں روئیں گے

اس منظر میں جانے پھر ایسا کوئی آئے کہ نہ آئے
جو ویراں مایوس نگاہوں کی خالی جھولی پھیلائے
راکھ میں پھول کریدے گا

(1960)

# ازل تا ابد

آج کی رات اک دوست سے دیر تک تیری باتیں رہیں
بزمِ جام و سبو کے ہر اک قطرۂ مے میں تیرے ہی غم کی مدارات تھی
گریۂ نیم شب میں ترا عکس تھا، شاعری میں تری ہی مناجات تھی
اُلجھے فقرے، جھجکتے ہوئے لفظ، بے ربط یادوں کا سیلاب تھا
سب جہاں ہنس رہے تھے وہاں تیرا غم سینۂ ضبط کی حد میں بے تاب تھا
تجربے نے سرگوشیوں میں کہا، پی چکے، اب اُٹھو
غم غلط ہو سکا ہے، نہ ہو گا کبھی، شب ڈھلی، گھر چلو
تلخیِ گردشِ دہر کے حادثے ہم کو معلوم ہیں
وقت کی دوریاں، فاصلوں کی حدیں حرفِ معدوم ہیں

میکدہ ذہن کا قتل، جذبات کی خودکشی
میکدہ زرد چہروں پہ آئی ہوئی تازگی
میکدہ مسخ روحوں کی بے وجہ افسردگی

میکدہ کھوکھلے قہقہوں کے تلے حبس کا اک خلا
میکدہ بے لباس اور آوارہ معنوں سے بوجھل فضا
میکدہ بے دیار اجنبی، بے کفن زندگی کی چتا
اس فضا میں ترے غم نے آنکھوں سے بہہ کر کہا
بزمِ جام وسبو کی ہر اک بوند میں تم نے میرے ہی غم کی مدارات کی
ہم سخن دوست سمجھے نہ سمجھے، اشاروں میں تم نے مری بات کی
اب اُٹھو، گھر چلو، یہ فضا سخت مسموم ہے
یہ بہکتی ہوئی کاٹھ کی پتلیاں ان کا ہر فعل معصوم ہے

اِن کی بے جان ہنسی، بے سبب سعیِ عشرت بھی مغموم ہے
میکدہ وقت کے سیلِ بے انتہا میں وہ چھوٹا سا نقطہ جو معدوم ہے

پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہنستے رہے، بات کرتے رہے
ایک نے دوسرے سے کہا کیا، کسی نے بھی سمجھا نہیں
جام سے جام ٹکرائے، آنکھوں سے آنکھیں ملیں
پر دلوں کے جہنم میں اک بوند تک بھی تو پہونچی نہیں
دشتِ غم میں کسی بھی نظر سے کوئی آرزو پھول بن کر تو مہکی نہیں
کاگ اڑتے رہے کھنکھناتی رہی ساغروں کی ہنسی

بے خودی ہوش کی سرحدوں سے پرے گیت گاتی رہی، رقص کرتی رہی
شکلیں پہلے تو مدّھم ہوئیں، امتیازات کی سرحدیں مٹ گئیں
ایک دیوار نے دوسری کو چھوا، میز سے میز ٹکرا گئی
کرسیاں چھت سے اونچی ہوئیں اور اُن کے مکیں دیر تک دور تک یوں معلق رہے
جیسے مرغولے اُڑتے رہیں اور آہستہ آہستہ شکل اپنی کھوتے رہیں

پھر جہاں میں تھا، کوئی نہ تھا
ہم سخن تھا کوئی اور نہ تھا راز داں
صرف تو، تیری یادیں، تری بات تھی
صرف میں تھا، مرے ساتھ پیکر ترا
اپنی اِک اِک ادا دشتِ ماضی سے میرے لیے ڈھونڈ کر لے کے آیا ہوا
نشّۂ مے نے سرگوشیوں میں کہا، اب اُٹھو
یہ رفاقت کے لمحات ہی از ازل تا ابد وقت کا ماحصل
یہ رفاقت کی یادیں ہی ہیں جاوداں
اور زبان و مکاں میں ہے جو کچھ بھی، سب جھوٹ ہے
دوریاں، فاصلے، ہجر، غم جو بھی ہے حرفِ موہوم ہے
میکدہ وقت کے سیلِ بے انتہا میں وہ چھوٹا سا نقطہ جو معدوم ہے

میکدہ ایک چمکے ہوئے درد کی بے کراں روشنی
میکدہ اپنے گم گشتہ فردوس کی مختصر زندگی
میکدہ روحِ عریاں کے زخموں کے گلشن کی پایندگی
میکدہ ذہن کی تازگی اور جذبات کی خودسری
میکدہ ہوش کی بازیافت اور پروازِ عقل و خرد کی حدِ آخری
میکدہ ظلمتوں کے سمندر میں مینارۂ نور کی رہبری
میکدہ شہرِ خواب و طلسمات میں جاگتے غم کی پیغمبری
تیری قربت کے احساس نے نشّۂ مے سے ہنس کر کہا
میکدہ جھوٹ ہے، زندگی جھوٹ ہے، یہ زمان و مکاں جھوٹ ہے
تم مرے نشّۂ قرب سے اب بھی سرشار ہو — پہلی اور آخری اِک صداقت ہے یہ

(1960)

# دادگر کون ہے

اک طرف حلقۂ غنچہ دہناں، گل بدناں، سیم تناں
اک طرف حلقۂ ہجراں زدگاں، چاک دلاں، نوحہ گراں
سرِ دربار صفِ کج کلہاں، مجمعِ زر بہ دہناں
سرِ بازار جنوں ہے ہدفِ خندۂ طفلانِ جہاں
کس کا افسانہ لکھیں، مدح کریں؟
مسندِ عدل پہ ہیں تیرہ دلاں حق کی طرف شعلہ فشاں
جن کی نظروں میں خطا حق طلبیِ لبِ صاحب نظراں
پا بہ زنجیرِ تقاضائے شکم روشنیِ ذہن ہے یاں
"طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر" مقصدِ پیرانِ مغاں
کس کا افسانہ لکھیں، مدح کریں؟
اُن سے تقسیمِ مناصب کا گلہ ہو تو گنہ گار ہمیں
اُن کی تعریف پہ خود اپنی ہی نظروں میں سزاوار ہمیں
ہونٹ سی لیں تو ضرورت کا یہ اعلان کہ زیاں کار ہمیں

اُن سے پوچھیں کہ اصول آپ کا کیا ہے تو خطا کار ہمیں
ہم نوا کس کے بنیں، کس کی سنیں؟
کچھ اگر کہیے تو اندیشۂ بشکستگیِ رشتۂ جاں
چپ اگر رہیے تو جو دل میں ہے اُس حق کا زیاں
مانعِ بزم نشینی ہے نگاہِ غضبِ ہم قفساں
دعوتِ دشت نوردی ہے ہوائے طرفِ کوئے بتاں
ہم نوا کس کے بنیں، کس کی سنیں؟
ترکِ گلشن پہ یہ گُل چینوں کا فرمان کہ آگے ہے خزاں
ہم نشینی پہ ہیں گُل ہائے تر و غنچۂ نو طنز کناں
اُن کے مُنہ کون لگے، ہیں وہی محبوبِ دلِ تنگ دلاں
شکر کیجیے کہ گِلہ، وہ تو سمجھتے ہی نہیں اپنی زباں
داد گر کون ہے، ہم کس سے کہیں؟
فن کی ہو دولتِ بیدار کہ ہو دِل کی گراں مایہ دکاں
سنگ ریزوں کی تجارت میں بھلا ان کا خریدار کہاں
شعر ہے خونِ جگر، مشغلۂ خودکشیِ دیدہ وراں
دوش پر لادے ہوئے ہم ہیں عبث علم کا اک بارِ گراں
داد گر کون ہے، ہم کس سے کہیں؟

(1960)

# زکنارِ ما بہ زکنارِ ما

زباں بریدہ، نظر بند، دست و پا بستہ
ہجومِ عام سرِ رہ گزار ہے حیراں
گرسنگیِ شکم، تشنگیِ دیدہ و دل
ندیدہ چشمۂ حیواں کی فکر میں غلطاں
شمارِ سبحۂ انفاس، دھڑکنوں کا حساب
کچھ ایسا پھیر کہ حاصل ہے بس زیاں ہی زیاں
ہر ایک ہاتھ میں اعمال نامۂ یک عمر
مگر نہ داورِ محشر، نہ عدل کی میزاں
ہر ایک آئینہ در دست، خود نما، خود بیں
مگر کسی کو کسی کا پتہ، نہ اپنا نشاں
ہے ایک عرصۂ عبرت یہ عالمِ برزخ
نہ زندگی ہے رفیق اور نہ موت ہے پُرساں

میں اس ہجوم میں کس سے کروں سوالِ نظر
کسی کا دے گی پتہ کیا یہ بزمِ گم شدگاں
ہے کون کان دھرے جو صراط کے پُل پر
مجھے یہ ڈر ہے، اکارت نہ جائے میری فغاں
میں اپنے زخم دکھا دوں، مگر ہے یہ بھی یقیں
یہ لوگ بھی تو ہیں میری ہی نوع کے انساں

اگر مجھے ہے یہ فرصت کہ ان کا حال سنوں
مری نظر میں ہے وسعت کہ ان کے زخم گنوں
مرے قدم میں ہے طاقت کہ ان کے ساتھ چلوں
تو پھر مجھے بھی یہ حق ہے کہ ان سے بات کروں

(1960)

# ماورا

راہ چلتے ہوئے اک موڑ پہ دورازِ اُمید
آنکھ جھپکی تو مرے سامنے وہ شوخ پری پیکر تھا
میرے پہلو سے وہ گزرا مگر اس طرح کہ چہرے پہ تھا ہاتھ
ایک میٹھی سی خلش چھوڑ گئی دل میں یہ جاں سوز ادا
ماورائی سایہ جلوہ جو گریزاں ہے مری نظروں سے
میری باہوں کی حرارت میں کبھی شمع کے مانند پگھل جاتا تھا
قُرب کی آنچ سے یہ پیکرِ نور
عشق کی آتشِ سیال میں ڈھل جاتا تھا
ایک شعلہ سا رگ و پے میں مچل جاتا تھا
یہ کوئی دشتِ تصوّر کا حسیں موڑ نہ تھا
جہاں رم دیدہ غزالانِ تخیل نے اُسے دیکھا ہو
یہ کوئی خوابِ دل آویز نہ تھا
موڑ او جھل ہوا نظروں سے تو پھر راہ وہی، لوگ وہی
صرف وہ چہرہ، وہ آنکھیں وہ خط و خال نہ تھے
جن سے بڑھ کر کوئی نظروں کا شناسا بھی نہیں

ہائے وہ لمحۂ پرّاں، وہ دل آویز ادا
یوں ملے جیسے کبھی میں نے انھیں دیکھنا چاہا بھی نہیں
ہے روایت کہ خداوندِ خدایانِ جہاں
اپنی رویت سے مشرّف یونہی فرماتا ہے اُن بندوں کو
جو اُس کی لگن میں شب و روز
حمد و تسبیح و ثنا اور مناجات و دُعا کرتے ہیں
صرف اک دید کی حسرت میں جیا کرتے ہیں
آنکھوں میں کاٹ دیا کرتے ہیں رات
تب کسی لمحے میں وہ ذاتِ منزّہ کہ جو ہے خاتمۂ جملہ صفات
شعلۂ حُسنِ ازل، روحِ جہاں، جانِ حیات
صبح کے نُور کے مانند نگاہوں کو منوّر کرتا
عرش سے فرش پہ کرتا ہے نُزول
اور اُسی لمحہ وہ بد بخت، وہ مرتاضِ تسبیح و رکوع و سجدہ
نشۂ تشنگیِ دید سے چُور
خانقاہوں کے کسی گوشے میں سو جاتے ہیں
جس طرح حسرتِ دیدار میں اک عمر گزاری ہی نہیں
آرتی جیسے کبھی اُس کی نگاہوں نے اُتاری ہی نہیں

اور وہ ربِّ جہاں راحتِ جاں
ماورائے نگہِ کون و مکاں
مُنہ چھپائے ہوئے ہاتھوں سے گزر جاتا ہے
حسرتِ دید در و بام سے سر پھوڑتی رہ جاتی ہے

(1960)

# فریب

دو جواں جسموں کی وحدت میں ہے سرشاریِ تقدیسِ وصال
ہیں ہم آہنگ دھڑکتے ہوئے دل، پھر بھی یہ آتا ہے خیال
طنزِ بےرحمیِ حالات کا حاصل کہیں دوری ہی نہ ہو
قیدِ تنہائیِ یک عمر نہ ہو جبرِ مشیت کا مآل

ساعتِ وصلِ گریزاں کا ہے انعام ہی کیا
چند لمحوں کی مسرت کا ہے انجام ہی کیا

آ، دو ہنگامۂ آشوبِ زمانہ میں کہیں کھو جائیں
ساتھ اس قافلۂ بے جرس و جادہ کے یوں ہو جائیں
جیسے وہ جنتِ گم گشتہ کبھی ہم نے بھی دیکھی ہی نہ ہو

(یکم جنوری/1961)

# شاعری

خلوتِ ذات کے محبس میں وہ بے نام اُمنگ
جس پہ کونین ہیں تنگ
چھان کر بیٹھی ہے جو وسعتِ صحرائے زماں
جس کو راس آ نہ سکی رسم و رہِ اہلِ جہاں
نغمۂ غم کی ترنگ
خود سے بھی برسرِ جنگ
پستیِ حوصلہ و شوق میں ہے قیدِ وہ ذُوحِ امکاں

شورِ بزمِ طرب و شیونِ بزمِ دل میں
دہر کی ہر محفل میں
جس نے دیکھی ہے سدا عرصۂ محشر کی جھلک
بوئے بازار میں گم کردہ رہی جس کی مہک
عالمِ آب و گل میں

جہد کی ہر منزل میں
اپنے ہی ساختہ فانوس میں ہے قید وہ شعلے کی لپک
اِسی زندان کی دیواروں پہ آتے ہیں نظر شام وسحر
عکس بن کر شجرِ دہر کے سب برگ وثمر
یہیں احساس کی شاخوں پہ کلی بنتی ہے دوشیزۂ گل
یہیں جذبات کے آئینے میں آتا ہے نظر جزو میں کل
یہیں ادراک کو ملتے ہیں تعقل کے حسیں پیمانے
یہیں تخئیل میں نادیدہ جہانوں کے ہیں دولت خانے
اپنا ہر نقشِ قدم چھوڑ کے جاتا ہے یہاں قافلۂ وقتِ رواں

حادثہ کون ومکاں میں ہو کہیں نقش اُبھرتا ہے یہاں
یہی دیوارِ مصوّر ہے شناسائے ہر آئندہ جہاں
یہیں آزاد زماں اور مکاں سے ہے وہ رؤحِ دوراں
جس پہ کونین ہیں تنگ
نغمۂ غم کی ترنگ
خود سے بھی بر سرِ جنگ
یہیں تخلیق ہوا کرتی ہے وہ بادۂ افشردۂ فن
جس کی ہر بوند میں ہے زمزمۂ کن فیکوں عکس افگن

دہر کی ہر محفل میں
عالمِ آب و گِل میں
جہد کی ہر منزل میں
اک یہی جرأتِ نادیدہ ہے صورت گرِ بزمِ امکاں

چھان کر بیٹھی ہے جو وسعتِ صحرائے زماں
جس کو راس آ نہ سکی رسم و رہِ اہلِ جہاں

یہیں خود ساختہ فانوس میں ہے قید وہ شعلے کی لپک
ہم نفس جس کی ہے صد گونہ جہنم کے عذابوں کی کسک
پھر بھی دکھلاتی ہے ہر آنکھ کو جو جنتِ فردا کی جھلک

(28 جنوری 1961)

# اجنبی

تمام عمر ملے
تمام عمر رہے ساتھ
روز دیکھا ہے
مگر وہ چہرہ، وہ آنکھوں کا اجنبی انداز
مگر وہ ہونٹ، وہ اک زہر میں بجھی آواز
مگر وہ چِیں بہ جبیں، نفرتوں کی وہ غمّاز
وہ کوئی اور تھا
وہ تم نہ تھے
جو صبح و مسا
اجالے اور اندھیرے میں روز ملتے ہو

تمام عمر رہے دُور
اجنبی کی طرح
مگر وہ چہرہ، وہ شرمندگی سے نم آنکھیں

مگر وہ رمز شناسِ غم و الم آنکھیں
مگر وہ عقدہ کشا، مائلِ کرم آنکھیں
وہ دل کی ٹھیس سے بشکستہ جام جم آنکھیں
خیالِ خاطرِ احباب کا بھرم آنکھیں
وہ کوئی اور تھا
وہ تم نہ تھے
جو صبح و مسا
اُجالے اور اندھیرے میں روز ملتے ہو

تمام عمر رفاقت بس ایک لمحہ ہے
تمام عمر کے دوست اور دشمنوں کی نظر
وہ اجنبی ہے جو دل سے گزر چکی ہے مگر
نہ کھل سکا کہ کیسے روز دیکھتے ہیں ہم
نہ پا سکے کہ کیسے آج تک نہیں دیکھا

(1961)

# جلاوطن

ہوا کی کاٹتی تلوار جسموں میں اُترتی ہے
فضا میں خون کی بوندیں لویں بن کر چمکتی ہیں

مرا سنسان بے ترتیب کمرہ، قبرِ تنہائی
جہاں ایک ایک پل بھاری ہے یادوں کے رسولوں پر
جہاں شبنم ٹھہرتی ہی نہیں ہے آ کے پھول
پر
وہ کرسی جس کے دستے پر اٹی ہے گرد مدت سے
حنائی انگلیوں کا نقشِ نازک ڈھونڈتی ہوگی
وہ بستر کی شکن جو بن گئی تقدیر کا لکھا
کسی کے جسم کی نرمی سے مٹنا چاہتی ہوگی
وہ تکیے جو ہیں بازاری غلافوں کا کفن پہنے
کسی کے ہاتھ کی بخیہ گری کو یاد کرتے ہیں
میں ان یادوں کی دیواروں میں ہوں اک عمر کا قیدی

مری دیرینہ ہمدم، میرے بچپن اور جوانی کے
حسیں خوابوں کی محرم کچھ کتابیں، مجھ سے کہتی ہیں
''ادھر آؤ، اُٹھا کر ہم کو سینے سے لگا لو تم
ہمارے آشنا لفظوں کو حال اپنا سُنا لو تم''
کتابیں، جن کے اوراقِ جہاں دیدہ کے سینے پر
معانی اور لفظوں کا امڈتا سیل بہتا تھا
یہ چشمِ منتظر رہ رہ کے تجھ کو یاد کرتی ہیں
صدف لفظوں کے معنی کے گہر سے ہیں تہی ایسے
کہ جیسے تیری نظریں چُن کے موتی لے گئیں سارے
یہ بے پایاں سمندر ابرِ نیساں کو ترستے ہیں

ہوا کی کاٹتی تلوار تیرے شہر کی حد میں
بڑی نرمی سے موجِ صبح گاہی بن کے چلتی ہے
ترے پھولوں کے دامن پر نہ ہوں گی خون کی بوندیں
کہ آنسو بھی مرے اب دھوپ میں گم ہو چکے ہوں گے
وہ آئینہ کسی انجان رستے میں پڑا ہوگا
جو شامِ وصل و صبحِ قرب کا شاہد رہا برسوں
وہ آئینہ گزرتے عورتوں، مردوں کے چہروں میں
ہمارے خال و خط کا عکس اب کیا ڈھونڈتا ہوگا
ہزاروں روز و شب کی گرد سے دھندلا چکا ہوگا
وہ چشمِ منتظر بھی جاگ کر پتھرا گئی ہوگی
اداسی اُس کو نسیاں کا کفن پہنا گئی ہوگی
مری آنکھیں کھُلی ہیں، شہر تیرا سو رہا ہوگا

ہزاروں کوس کی دوری بھی وہ سفاک قاتل ہے
جو یادوں کے چراغوں سے چمک تک چھین لیتی ہے

چھٹا جب شہرِ جاناں غم نے زادِ راہ بخشا تھا
اسی غم کے اجالے میں ابھی تک جاگتا ہے دل
یہ دولت بھی کہیں گم ہو نہ جائے دشتِ غربت میں
کہ ہر اک موڑ پر ہیں گھات میں رہزن بھی قاتل بھی
غمِ فکرِ حیات اب بھی لگا ہے ساتھ پہلو کے
یہ رہبر رہزنوں کے ساتھ مل کر لوٹ لیتا ہے

میں اُن راتوں سے ڈرتا ہوں کبھی جو یوں بھی آئیں گی
کہ آنکھیں جاگتی ہوں گی مگر دل سو رہا ہوگا

(1961)

# کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

برسی نہیں نغموں کی گھٹائیں کئی دن سے
سنکی نہیں مدھ ماتی ہوائیں کئی دن سے
ناکردہ ہیں معصوم خطائیں کئی دن سے
لب بستہ ہیں جینے کی دعائیں کئی دن سے
وہ حبس ہے آواز کا دم ٹوٹ رہا ہے
ہر گیت کا، ہر ساز کا دم ٹوٹ رہا ہے

اے خالقِ الفاظ، مسیحائے معانی
اے صانعِ لوح و قلم و سحر بیانی
اے صاحبِ کُن، سازِ سکوتِ ہمہ دانی
اے نغمۂ گُل، صوتِ لبِ غنچہ دہانی
زاغ و زغن و بوم نواسنج ہیں کب سے
لب بستہ ہیں مرغانِ خوش الحان ادب سے

تو نے ہی زباں بخشی ہے پتھر کے دہن میں
پھولوں کو کیا محتسبِ غنچہ چمن میں
بوجہل کیے پیدا رسولوں کے وطن میں
پھر حکم دیا صبر کا ہر رنج و محن میں
جس سینے کو عرفان کے بخشے ہیں سمندر
اُس سینے پہ رکھوا دیے خاموشی کے پتھر

مدّت سے معانی نے نہ کی چہرہ نمائی
الفاظ لیے پھرتے ہیں کشکولِ گدائی
تخئیل نے پرواز کی مہلت نہیں پائی
بے رنگ ہیں نظریں کہ دھنک ہاتھ نہ آئی
کیا شعر و ادب، گردِ لطافت نہیں ملتی
یوں زندہ ہیں، جینے کی اجازت نہیں ملتی

یہ عہدِ پر آشوب کہ جو ہم کو ملا ہے
اِس بانیِ بیداد کا انداز نیا ہے
دِن نکلے تو معلوم ہو دل ڈوب رہا ہے
شام آئے تو بجھتا ہوا مرقد کا دیا ہے
ہر ایک نفَس عمرِ عذابِ دو جہاں ہے
دھڑکن بھی مزاجِ دلِ نازک پہ گراں ہے

ہے قافلۂ وقتِ رواں سیلِ فنا کا
اڑتے ہوئے لمحات کا رکتا نہیں ریلا

اُمید کا ہر لمحہ ہے اک خوابِ رمیدہ
ڈھونڈو تو نشانِ کفِ پا بھی نہیں ملتا
اس راہ میں ہر موڑ کہیں گاہِ اجل ہے
جو ہاتھ ہے مجروح ہے، جو پاؤں ہے شل ہے

اک سمت یہ پروازِ ترقی ہے بشر کی
ہے قبضۂ قدرت میں عناں شمس و قمر کی
افلاک میں ہے دھوم زمیں زادِ نظر کی
منّت نہیں درکار دعاؤں کو اثر کی
ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کُھلنے لگا ہے
خورشید بھی ہم وزنِ خزف تُلنے لگا ہے

اور دوسری جانب ہیں غمِ زیست کے سائے
اندیشۂ جاں سے نہ یہاں نیند بھی آئے
اس آگ کے طوفاں میں کوئی چین نہ پائے
آنکھوں کے لیے خواب بھی اپنے ہیں پرائے
ذرّے کا بھی دل ٹوٹے تو ہل جاتی ہے دنیا
پُرساں نہیں کوئی دلِ انساں کی تڑپ کا

انسان ہے انسان کی صحبت سے گریزاں
نے پاسِ مرّوت ہے، نہ ہے عشق پہ ایماں
اخلاص کے پھولوں سے بھی خوشبو ہے پرافشاں
ہر نقشِ تعلق کا ہے خود آپ سے نالاں

اسرار زماں اور مکاں کے تو ہیں روشن
کھلتا نہیں کون اپنا ہے، اور کون ہے دشمن

دل محض ہے اک آلۂ خوں فیضِ مشیں سے
دنیا سے تعلق، نہ علاقہ کوئی دیں سے
ہے علم کا سینہ بھی تہی سوزِ یقیں سے
احساس کا رشتہ ہے زماں سے نہ زمیں سے
ہیں جسم کہ مرغولے بھٹکتے ہیں ہوا میں
ہیں ذہن کہ بے فیض بھڑکتے ہیں خلا میں
ہے شعبدۂ مکر فنِ اہلِ سیاست
بک جاتی ہے، لٹ جاتی ہے افکار کی عصمت
ممنوع ہے، معتوب ہے ذہنوں کی دیانت
ممدوح ہے، مرغوب ہے ایماں کی تجارت
یہ طرفہ ستم وقت نے ایجاد کیا ہے
ویران ہیں گھر روضوں کو آباد کیا ہے

گر کوئی کرے عظمتِ انساں کا سبق یاد
آوارہ وطن ہوتا ہے وہ خانماں برباد
ہے فکرِ معاش اُس کے لیے روز کی بیداد
آئینِ فقیہانِ ہوس کرتا ہے ارشاد
یہ شمع تہہِ دامنِ فکر آنے نہ پائے
تقدیسِ محبت کا بھی ذکر آنے نہ پائے

بیدار نگاہوں پہ ہے نظاروں کی قدغن
حسّاس دلوں کے لیے ہر بات ہے الجھن
تابندہ دماغوں میں ہیں افکار کے مدفن
فرخندہ جبینوں کا ہر اک سنگ ہے دشمن
اے بے ہنری! پاؤں اماں جاں کی تو بولوں
میزانِ مژہ پر غمِ کونین کو تولوں

بازارِ زر و سیم میں کھولی ہے وہ دوکاں
جس جنس کی قیمت نہیں جُز نالۂ حیراں
در در پہ گیا لے کے میں شمعِ دلِ سوزاں
ہے کون خریدارِ دُرِ اشکِ غریباں
جو آنکھ بھی چھلکے، وہ مرا دیدۂ تر ہے
جو قلب ہو صد چاک مرا لختِ جگر ہے

اس طور سے مضمونِ سخن جمع کیا ہے
ہر دامنِ گل بن کے صبا میں نے سیا ہے
شبنم میں تھا جو زہر کرن بن کے پیا ہے
ہر ایک صدف کو دُرِ نایاب دیا ہے
تب فن نے بھی یوں میری مسیحائی ہے مانی
گر لفظ کو چھو لوں تو پکار اٹھیں معانی

اِک عمر میں عقدہ یہ کھلا طبعِ رواں پر
سودائے سخن کی ہے بنا صرفِ زیاں پر

نغمہ جو کوئی چھیڑیں تو بندش ہے زباں پر
دانش کے گہر رولیں تو بن جاتی ہے جاں پر
پتھر سے جو سر پھوڑیں تو نغمات کا خوں ہو
سورج سے اگر رشتہ ہے ذرّات کا خوں ہو

ہے طبعِ رواں موردِ بیداریِ جاں کاہ
جھپکی بھی ہو گر آنکھ تو شاہد ہے خود اللہ
اِس دشتِ سیہ بخت میں سایہ نہ کہیں چاہ
بچھڑے ہوئے خوابوں کو جوڑ ڈھونڈوں تو نہیں راہ
بے مونسِ دل شامِ بلا کاٹ رہا ہوں
تنہائی کی سفاک سزا کاٹ رہا ہوں

شمعِ سرِ رہ بن کے میں صدیوں سے ہوں بیدار
انداز سے ہر موجِ ہوا کے ہوں خبردار
اِن آنکھوں نے دیکھی ہے زمانے کی بھی رفتار
محفوظ تصوّر میں ہیں ہر عہد کے آثار
آدم ہوں سفر میرا ازل تابہ ابد ہے
عیسیٰ ہوں، مرا گھر ہے پتہ ہے نہ لحد ہے

تاریخ کے ہر صفحے پہ ٹوٹا ہے نیا قہر
بن باس ملے رام کو، گوتم کو غمِ دہر
عیسیٰ تو چڑھے دار پہ، سقراط پیے زہر
پیاسا پسرِ ساقیِ کوثر ہو لبِ نہر

مہتابِ شب چاردہم چاندنی مانگے
چوکھٹ پہ اندھیروں کے سحر روشنی مانگے

خسرو کا محل دولتِ شیریں سے غنی ہو
فرہاد کے تیشے کو غمِ خود شکنی ہو
جو شخص سرافراز ہے گردن زدنی ہو
بوئے گُلِ تر وقفِ غریبُ الوطنی ہو
کیوں اس کو ستم گاریِ دنیا نہ کہیں ہم
جلادوں کے آگے ہیں مسیحوں کے بھی سر خم

ہر عہد میں بوجہل رہے صاحبِ دولت
پائی ہے تہی ذہنوں نے وسعت پہ حکومت
اندھوں ہی کو مانا گیا اربابِ بصیرت
کم ظرفوں سے منسوب ہے حاتم کی سخاوت
جو ہے ستمِ دہر سے فریاد بلب ہے
کلیوں سے سبب چُپ کا جو پوچھیں تو غضب ہے

آزادیِ اظہار سے قند نہیں ہے
جو لب ہے حق آگاہ وہ خورسند نہیں ہے
سُن لے کوئی، اُمّید یہ ہر چند نہیں ہے
پھر بھی تو زبانِ شہدا بند نہیں ہے
کٹ جائے زباں، ہر بُنِ مُو بول رہا ہے
سر تن سے جدا ہیں تو لہو بول رہا ہے

افسردہ ہیں جو شورشِ دنیائے دنی سے
دل تنگ ہیں جو نیزۂ غیرت کی انی سے
پامال ہیں جو گردِ غریب الوطنی سے
نالاں ہیں جو آلام کی ناوک فگنی سے
کچھ سوچ لیں، کچھ بول لیں اتنا ہی بہت ہے
یہ بھی نہ میسر ہو تو جینا ہی بہت ہے

(1961)

# دوام

ہماری زندگی ہے
یا کسی اڑتے ہوئے طائر کا سایہ
بے کراں جوئے رواں پر
گریزاں عمر کے بے فیض روز و شب کا حاصل
یہی اک نقشِ پرّاں
کہیں جو بوند خوں کی
کہیں ترسی ہوئی آنکھوں کا آنسو
کہیں کھلتے ہوئے غنچے کا نغمہ

اگر پائی کسی نے دشتِ غم میں آبلہ پایانِ راہِ دل کی سالاری
لٹائی گر کسی نے سنگ دل بے حس بُتوں کی انجمن میں
دلوں کی آگ میں تپ کر چمکتے راگ کی تزئین کاری
دکھایا گر کسی نے قحط میں دیدہ وروں کے

بہ فیضِ طاقت و زر، طمطراقِ کج کلاہی
ملی بھی گر کسی کو بے ضمیروں کے دلوں کی مملکت میں بادشاہی
عدالت گاہِ حق نا آشنا سے
جو پایا بھی کسی نے اختیارِ دین و دنیا
تو کیا حاصل؟
ہماری زندگی اڑتے ہوئے طائر کا سایہ
ہمارے خواب بے تعبیر، تشنہ لب سرابوں کے دہکتے گرم صحرا

مگر وہ نقشِ پا ہائے گریزاں
جو کہیں آنسو، کہیں نغمہ، کہیں اک بوند خوں کی
ازل سے تا ابد پھیلا ہوا ہے
اُسی اک نقشِ پا ہائے گریزاں سے تسلسل وقت کا قائم رہا ہے
اُسی اک نقشِ پا ہائے گریزاں پر لگا دیں مُہر اپنی

(1961)

# عدم سے عدم تک

بہت دنوں سے خیال کا خواب سے کوئی سلسلہ نہیں ہے
خموش راتوں کی ہولناکی میں نغمگی کا پتہ نہیں ہے
درِ تخیل پہ کوئی دستک، نہ کوئی پرتو، نہ کوئی آہٹ
جو وقت گذرے ہزاروں سانپوں کی صاف سن لیجے سرسراہٹ
پھسل پھسل کر ہر ایک لمحے کی لاش دریا میں گر رہی ہے
زماں کی گدلی سیاہ گہرائیوں میں یوں رات ڈوبتی ہے
کوئی صدا ہے تو تیز سیٹی کی تلملاتی ہوئی فغاں ہے
پولیس کی موٹروں کی آواز ہی خموشی پہ حکمراں ہے
حسین یادوں کا کوئی جھرمٹ اگر حدودِ نظر تک آئے
تو سرسراہٹ بھی آنچلوں کی فضا کے عفریت کو جگائے

ہمارے دل کی اداس بستی میں اس سے پہلے بھی کب سکوں تھا
جو یاد بھی تھی تو سر بہ زانو، خیال بھی تھا تو سرنگوں تھا

ہماری راتوں کو یوں بھی کب تھی حسین خوابوں کی سیج حاصل
نہ نیند آتی نہ چین ملتا، جنوں ہی رہتا شریکِ محفل
خرد کا پہرا کہیں ہو لیکن ہماری بستی میں کب اثر تھا
جنوں ہی شیرازہ بندِ غم ہے، جنوں ہی برہم زنِ خبر تھا
یہ ہم نے مانا کہ زندگانی خود اپنی آتش میں تپ رہی تھی
مگر شکستہ نگار اُمیدوں کے خوں کی مالا تو جپ رہی تھی
وہ خوں کی مالا کچھ ایسی ٹوٹی کہ دانہ دانہ بکھر گیا ہے
انھیں اٹھا کر خموش لمحوں کا قافلہ بھی گزر گیا ہے

چلو کہ اب کس کو ڈھونڈتے ہو — کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں ہے
افق کے اُس پار دیکھنا کیا — زمیں کہیں، آسماں کہیں ہے
جو تم نے دیکھا، جو تم نے سوچا — خیال تھا وہ سراب کا سا
جو تم نے چاہا، جو تم نے مانگا — سوال تھا وہ حباب کا سا
عدم کی ظلمت سے جو چلے تھے — کہیں وہ اب تک تھکے نہیں ہیں
زمیں کے اِس گھومتے کُرے پر — قدم کسی کے جمے نہیں ہیں
جسے سمجھتے ہو رات اپنی — وہ نصف دنیا کا روزِ روشن
جسے سمجھتے ہو دن کی رونق — وہ نصف دنیا کی شب کا مدفن
جہاں تمدن کی لَو ہے اونچی — مرض دماغوں میں پل رہے ہیں
اجالا کیسا، وہاں اندھیرے — ابھی چراغوں میں پل رہے ہیں
اخوت و حریت کے لب پر — سوال حیرت سے تھم گیا ہے
جبیں پہ انسان دوستی کے — لہو لومبا کا جم گیا ہے

بہت دنوں سے خیال کا خواب سے کوئی سلسلہ نہیں ہے
خموش راتوں کی ہولناکی میں نغمگی کا پتہ نہیں ہے

کتابیں کہتی ہیں زندگانی حسین خوابوں کا مدعا ہے
پیمبروں نے دیا ہے مژدہ زمین کا بھی کوئی خدا ہے
ہے قولِ شعر و ادب محبت سے آسمان و زمیں ہیں قائم
ہے رقص و نغمہ کا حکم سر شاریِ تمنا جہانِ دائم
اٹھو ہم اپنے غموں کی لاشوں کو گہری قبروں میں دفن کردیں
جہاں اندھیروں کے ناگ بیٹھے ہیں اُن دراڑوں کو ضو سے بھر دیں
چلو کہ اک قافلہ مہ و مہر کے سفر پر روانہ ہوگا
مکان کی نارسا حدوں تک ہر اک قدم فاتحانہ ہوگا

مگر یہ کیا ہے جہاں بھی جاؤ — زمین ہی مرکزِ نظر ہے
زمین زائیدہ آرزو ہے — کہیں ستارہ، کہیں قمر ہے
یہی وہ معشوقِ بے وفا ہے — جسے کہیں بھی نہ بھول پائیں
یہ دوُر ہوکر بھی کھینچتی ہے — کشش کی ہیں جاں نواز ادائیں
یہی سفر کی ہے ابتدا بھی — یہی سفر کی ہے انتہا بھی
یہی ہے جادہ، یہی ہے منزل — یہی اثر بھی، یہی دعا بھی

چلو کہ پھر اپنے اس حقیر و عظیم مرکز کی سمت لوٹیں
خیال کا رشتۂ شکستہ تصورِ گمشدہ سے جوڑیں
کتابِ ماضی کو حافظے کے نہاں کدے سے اٹھا کے دیکھیں
غلافِ شام و سحر ہٹائیں، غبارِ نیرنگِ وقت جھاڑیں
مٹے مٹے سے حروف بخشے گئے ہیں یادوں کے اس نگر کو
نہ جانے کتنے ہی موسموں کے قدم نے روندا ہے رہگذر کو
انہی میں کچھ سرخیاں ہیں ایسی جو خونِ دل سے چمک رہی ہیں
کچھ ایسے عنوان بھی ہیں جن میں ابھی تک آنکھیں چھلک رہی ہیں

یہ ایک چہرہ جو یاد آتا نہیں ہے دیکھا تھا کب، کہاں، کیوں
یہ اک تبسم کی جگمگاہٹ لکھی ہوئی ہے بھلا یہاں کیوں
یہ ایک نشتر نہ جانے کس کے تغافلِ ظلم کا نشاں ہے
یہ ایک غنچہ نہ جانے کس بے زبان لمحے کی داستاں ہے
یہ ایک گرمی کی دوپہر اس جگہ ابھی تک کھڑی ہوئی ہے
یہ ایک بارش کی شام کس کے فراق میں اب بھی رو رہی ہے
یہ ایک جاڑے کی صبح کس کے لبوں کے شعلے کی منتظر ہے
یہ ایک تنہا اداس شب کیوں کسی سے ملنے کو یوں مصر ہے
یہ ایک چہرہ، یہ اک تبسم ہزاروں چہروں کی انجمن ہے
یہ ایک نشتر، یہ ایک غنچہ سکوت کے ساز کا سخن ہے
یہ صبح، یہ شام، یہ دھند لکے عبارت ان سے کتابِ ماضی
یہ انتظار اور نا اُمیدی، یہ زندگی ہے خرابِ ماضی
جنھیں نہ پایا، جو مل گئے تھے، ہیں سب ہی گم گشتہ و رمیدہ
جو آرزو ہے خزاں چشیدہ، جو یاد ہے سو اجل رسیدہ
ہر ایک پل آفرینشِ یک جہانِ نو اور ازل کا پیماں
مگر وہی پل قیامتِ یک جہانِ کہنہ کا بھی ہے عنواں
جسے سمجھتے ہو زندگی تم ہے اڑتے طائر کا اڑتا سایہ
جسے ازل اور ابد کہیں وہ عدم ہے یا ہے عدم کا سایہ
حیات خود موت کے سمندر میں ایک ننھا سا ہے سفینہ
اُسی اندھیرے میں ڈوبتا ہے یہ چیر دیتا ہے جس کا سینہ

سنو کہ انفاس کا جرس منزلِ قضا کا پیامبر ہے
یہ زندگی زندگی ہے کوئی کہ مرگ ہی مقصدِ سفر ہے

کتاب بھی حافظے کی ہے مُردہ گھر جہاں میتیں بھری ہیں
ذرا سی بھی روشنی ملے تو نکل کے قبروں سے ناچتی ہیں
بہ حکمِ اربابِ دین و دنیا جو یادیں زندہ چنی گئی ہیں
جو حسرتیں نا اُمیدیوں کی چتا میں جل کر ستی ہوئی ہیں
بغیر ہم سے کہے سُنے کچھ جو پیارے چہرے بچھڑ گئے ہیں
مسرتِ قتلِ عام میں جو بھرے پُرے شہر اجڑ گئے ہیں
وہ دل کی خلوت میں حافظے سے ابھر ابھر کر پکارتے ہیں
غم و خوشی، مرگ و زندگی کے نئے نئے روپ دھارتے ہیں
یہ چاہِ کنعانِ خودکشی میں جو ایک چہرہ چمک رہا ہے
جو زندگانی کے زہرِ قاتل کا جام پی کر دمک رہا ہے
یہ آج سے چند سال پہلے ہماری دنیا کا ہم نفس تھا
یہ گوشت اور پوست تھا ہمارا، مسرت و غم میں ہم قفس تھا
نگاہیں ڈھونڈیں تو اُس کو پاتی نہیں ہیں زندانِ آرزو' میں
کہیں نہیں ہے سراغ اُس کا رگوں کے بہتے ہوئے لہو میں
ابھی تو گذرے ہیں چند موسم کہ نام اُس کا بھی زندگی تھا
گواہ ہیں یہ رُتیں خزاں کی کہ وہ بھی اِک دن شگفتگی تھا
مگر اب اس کا خیال اپنے وجود پر ہے عدم کا سایا
چہیتی یادیں بھی خواب آنکھوں سے چھین لیتی ہیں کیوں خدایا
ہم اپنی بے خواب جلتی آنکھوں میں زندگی کی چتا جلائے
جہاں بھی زندہ وجود ڈھونڈیں ملیں وہاں موت ہی کے سائے
کروڑوں لمحوں کی لاش اٹھائے ہر ایک دن تھک کے ڈوبتا ہے
اِسی جلوسِ قضا کو لوگوں نے زندگی کا لقب دیا ہے

(1962)

# جبر

بہت دنوں رہی دنیا سے جنگ، اب من جاؤ
تم ایسے بھی تو نہیں ہو کہ زندگی تج دو
جو اپنی جان نہیں ہے تمھیں عزیز تو کیا
کچھ ایسے لوگ تو ہیں جو ہیں جان سے پیارے
اُنھی کو دیکھ کے جینے کے سیکھ لو آداب
کچھ ایسے چہرے تو ہوں گے جو دشتِ ظلمت میں
چمکتے ہوں گے محبت کی روشنی بن کر
کچھ ایسی یادیں تو ہوں گی جو تلخیِ دوراں
تمھارے دل سے گذرتی ہے زندگی بن کر
اُنھی کے نام پہ لازم ہے زندگی کرنا

یہ سچ کہ ایسا زمانہ تمھیں نصیب ہوا
کہ لمحے لمحے میں ہوتی ہے عمرِ خضر بسر

نفس نفس کو ہے دینا حساب صدیوں کا
کہاں وہ عہد کہ بزمِ حیاتِ انساں سے
گزرتی رہتی تھیں صدیاں سبک قدم چپ چاپ
کہاں یہ عہدِ قیامت شعار، اک اک پل
پیامِ صورِ سرافیل بن کے آتا ہے
ابھی نہ آیا تھا لب تک کہ لفظ قتل ہوا
ابھی تھا سینے میں نغمہ کہ دم ہی گھٹنے لگا
وہ فلسفے جنھیں ایماں کا نور جانا تھا
ہمارے دل میں چھپے ہم پہ طنز کرتے ہیں
نجاتِ دہر سمجھتے تھے جن اصولوں کو
ہمارے سامنے کھا کھا کے زخم مرتے ہیں

یہ کیا کہ جنگ کی چوکھٹ پہ امن خاک بسر
یہ کیا کہ خوف کے زنداں میں ہے اُمید کا گھر
یہ بات کیا ہے کہ سورج گدائے ظلمتِ شب
یہ کس لیے ہے سرابوں سے ابر آب طلب

وہ حرفِ حق کہ ہے واجب ہر ایک انساں پر
کچھ ایسی دولتِ نایاب ہے کہ جو اپنائے
ہر ایک حیرت و حسرت سے اُس کو تکتا ہے
یہ کیسا شخص ہے جس نے تجا ہے عیشِ جہاں
بس ایک حرف کی خاطر جو ہے گماں ہی گماں

یہ کیا کہ حرفِ صداقت کا اب نہیں کوئی مول
یہ کیوں ہجومِ معانی میں لفظ ہے کشکول

تم ایسے کون صداقت شعار، حق آثار
کہ زندگی میں کہیں بھی مصالحت نہ کرو
تمھارے ایسے بہت لوگ ہم نے دیکھے ہیں
جو آج ہار کے بیٹھے ہیں دست و پا بستہ
کوئی ہے دست شکستہ، کوئی جبا بستہ
اسیرِ سلسلہ ہائے دراز و دوُر ہیں سب
خمارِ عشرتِ امروز ہی سے چور ہیں سب

(1962)

# تشبیب

کل تک یہی مکان تھا اِک دشتِ بے اماں
دیوار و در پہ ہوتے صحرا کا تھا گماں
کھلتی تھی آنکھ صبح کو پتھر کے درمیاں
دن بھر گزرتیں روح پہ صحرا کی سختیاں
آتی جو شام زیبِ بدن کرکے پرنیاں
لاتی جلو میں اپنے سیہ پوش اداسیاں
آتیں سمٹ کے دل میں زمانے کی سختیاں
پھر تازہ ہوتیں بادۂ و مینا کی سُرخیاں
ہر جرعہ خونِ عمرِ گریزاں کا اک نشاں
ہر لمحہ قتل گاہِ تمنا کا نوحہ خواں
ذکرِ نشاط پہ وہ بھی جیب قہقہے
سرمستیوں پہ اپنی ہی تضحیک کا گماں
ظاہر میں زیرِ بحث تو حالاتِ حاضرہ
باطن میں چاکِ زخمِ تمنا کا امتحاں

انسانیت کی ہجو، مروّت کے مرثیے
در پردہ اپنی ذات ہی کی نوحہ خوانیاں
درد و الم کی کیفیتِ بے سبب کا بار
ہنستے چہکتے جھومتے فقروں سے بھی عیاں
ڈوبی ہوئی عزا کی فضاؤں میں بزمِ جشن
بے فیض رت جگوں میں غمِ عمرِ سرگراں
محرومیِ حیات کو دے کر وفا کا نام
اشکوں میں غرق جھوٹی محبت کی داستاں
انسان پر یقین نہ خود زندگی سے پیار
نامنصفیِ دہر کے شکووں کے درمیاں
علم و ادب بھی وقت گزاری کے مشغلے
ہر کام زندگی کا فقط شوقِ رایگاں
راتوں کے پچھلے پچھلے پہر تک یہ سلسلے
بے خواب جلتی آنکھوں میں نیندوں کا کارواں
اک قیدِ بے سلاسل و زنجیر زندگی
دیواروں کے فِشار کو کہتے رہے مکاں

ہیں آج بھی وہی شب و روز اور وہی مکاں
سورج، ستارے، چاند وہی ہیں کہ تھے جہاں
پھر بھی ہر ایک دن ہے نیا، رات ہے نئی
دھج صبح کی نرالی، نیا شام کا سماں
ہیں سنگ و خشت مونس و ہم درد و غم گسار
آغوشِ در کشادہ ہے دیواریں مہرباں

ہر ذرّے کی نگاہ محبت کی اک شعاع
پتھر کی آنکھ سے بھی ٹپکتی ہیں نرمیاں
اب بھی طلوع ہوتا ہے مہتاب جام سے
تمہیدِ سرخوشی کی سُناتا کہانیاں
بے خواب چشم خوابوں کا مقتل نہیں ہے اب
رنگین خواب جاگتی آنکھوں سے ہیں عیاں
ہے اب بھی قیدِ بے رسن و طوق زندگی
اس قید پر نثار ہے آزادیِ جہاں
زلفوں کی چھاؤں میں لب و عارض کی روشنی
خاموشیاں ہیں لطف و کرم کی فسانہ خواں
ساکت فضا میں ڈولتا پچھلے پہر کا چاند
یا چشمِ ملتفت پہ ہے بارِ حیا گراں
موجِ ہوا دریچوں کے پردوں سے خندہ ریز
یا پیرہن شمیمِ بدن سے ہے نغمہ خواں
دیوانگی کی باتوں پہ ہے بے سبب ہنسی
بے ربطیاں ہیں ربطِ محبت کی داستاں
نظموں کے ضبط و نقشہ و تعمیر کی جگہ
ایمائے حرفِ شوق غزل کا ہے رازداں
بے نظم زندگی کو غزل کس نے کردیا
شہد و شکر میں ڈوب گئی تلخیِ بیاں

وہ نظم ابتدا میں تھی جو نوحۂ حیات
اُس پر ہے اب قصیدے کی تشبیب کا گماں

ہر مصرع ہے دعا تو ہر اک لفظ عرضِ شوق
کس کے لبوں نے بخشی ہیں لہجے کو نرمیاں
معشوق مل گیا تو غزل کہہ رہا ہے عشق
ممدوح مل گیا تو زباں ہے قصیدہ خواں
وہ کیا ملے، حیات ملی، شاعری ملی
وہ ہیں رفیقِ شوق تو دنیا ہے مہرباں
معشوقِ زندگی کو دعا دیجیے وحید
اب سربسر حیات ہے عاشق کی داستاں

(مارچ 1963)

# عکس در عکس

چاند نکلا ہے بہت راتوں کی تاریکی کے بعد
دشت میں ظلمات کے چمکا ہے کس کا نقشِ پا
پھر سراغِ چشمۂ حیواں ملا
تیرگی کی شاخ پر
روشنی کا غنچۂ تازہ کھلا

کوہ و صحرا، دشت و دریا جاگ اُٹھے
شہر و قریہ جاگ اُٹھے
پھینک کر سر سے اداسی کی ردائیں بام و در ہنسنے لگے
بند کمروں کے دریچے کھل گئے
کتنی ہی ہنستی ہوئی آنکھوں میں عکسِ مہ بسا
کتنے ہی گاتے ہوئے ہونٹوں پہ نغمہ بن گیا

کشتیِ مہتاب گاتے جھومتے دریا کی موجوں پر چلی
کھیلتی لہروں سے، ہنستی زندگی کے ساتھ ساتھ
نرم و نازک انگلیوں سے لہر کی ایک ایک رگ کو چھیڑتی
قطرے قطرے کی نظر میں ڈوبتی
سطح سے گہرائی تک ہر تہہ میں اپنی شکل چمکاتی ہوئی
آئینہ خود دیکھتی، اوروں کو دکھلاتی ہوئی

ایک تنہا پیڑ کی سوکھی ہوئی شاخوں میں اٹکا ماہتاب
آپ اپنی روشنی کا صید ہے
آپ اپنے دیدۂ بیدار ہی میں قید ہے
سو رہا ہے دُور تک پھیلے ہوئے ویران سناٹے میں قبروں کا جہاں
چاندنی آسیب کے مانند چلتی ہے دبے پاؤں یہاں

بے کسی، آوارہ گردی، بے سروسامانیوں کی راہ میں
چاند شمعِ رہ گزار
خانۂ افلاس کے ظلمت گزیدہ، سم چشیدہ قلب میں
چاند ہے شمعِ سرِ لوحِ مزار
دامنِ ظلمت پہ دھبا نور کا

برق زائیدہ چراغوں کی دہکتی روشنی کے شہر میں
قمقموں کی آفتاب آسا شعاعوں کی سنہری لہر میں
چاند آ کر کھو گیا
دیکھنے والا نہ تھا کوئی تو اپنی روشنی کو رو گیا

نیم شب اس دو پہر کی چلچلاتی دھوپ میں
تیرگی کے اس چمکتے روپ میں
چاند آ کر بجھ گیا

قہقہوں کے شورِ وحشت خیز میں
نغمہ در نغمہ فضا کے سازِ حشر انگیز میں
نغمۂ مہتاب کیا
چاندنی کے زخمۂ و مضراب کیا

چاند اک گہرے کنویں میں گر پڑا
تنگ تر ہوتی ہوئی لہروں کے حلقوں میں سمٹتا کانپتا
حلقۂ گرداب میں، موجوں کے پیچ و تاب میں
جگمگاتی دوٗر تک پھیلی فضاؤں کے لیے روتا ہوا
سنگدل یخ بستہ باہوں میں تڑپتا ہے پڑا

اس زمیں کا ایک چاند
عکس ہیں آنکھوں کے آئینہ کدے میں بے شمار
ایک چہرہ، روپ ہیں اُس کے ہزار
اور ہر پرتو بقدرِ ظرفِ چشم

(1963)

# خاموشی کی آواز

خبر نہیں کہ اور کتنی بار ٹوٹنا پڑے
شکستِ جسم و جان و دل تو ہر نفس کے ساتھ ہے
ہر ایک منزل و مقام سے بڑھے لئے ہوئے
کہ شورِ گریۂ وداع بھی جرس کے ساتھ ہے
ہوائے گل کے ساتھ تو چلیں گے ہم چمن چمن
مگر وہ وعدۂ وفا جو خار و خس کے ساتھ ہے
ہماری کامیابیاں بھی جبر ہیں حیات کا
کہ شرطِ مرگ زندہ رہنے کی ہوس کے ساتھ ہے

ہر ایک نقشِ پا عزیز ہے، کہاں کہاں مٹیں
کہ ایک دل ہے اور ہر ایک موڑ پر ہیں دلبتاں
سبھی کو جانتے رہے ہم آبروئے آرزو
حسین و دل نواز ہیں ہزار ہا پری رُخاں

ہم اُن کی زندگی کو مانتے ہیں اپنی زندگی
ستم رسیدہ انجمن در انجمن نظروراں
ہوئے نہیں جو تلخ پی کے زہرِ روزگار بھی
ہماری داستاں میں ہے شریک اُن کی داستاں

تمام ظرف جس پہ تنگ ہیں بجز دلِ تباہ
پیا کیے ہم ایک عمر وہ شرابِ غم بہت
تصورات کو کہیں بھی سجدہ گہہ ملی نہیں
کوئی خدا نہیں ملا، ملا کیے صنم بہت
کوئی بھی دے سکا نہ ایک خواب کا بھی خوں بہا
بصد جلال و جاہ اہلِ زر ہوئے بہم بہت
نہ تھا دماغ عرضِ حال کا ہمیں کو، کیا کریں
نگاہِ یار تو رہی ہے مائلِ کرم بہت

ہر ایک بزم سے اُٹھے شکستہ دل، شکستہ جاں
اُمیدیں روکتی رہیں، سفر پکارتا رہا
ہزاروں یادیں سدِّ راہ اور ایک اکیلا دل
جو قرض ایک ایک یاد کا اُتارتا رہا
نہ جانے کتنی حسرتوں کی قتل گاہ بن گیا
جو ذہن گیسوئے حیات کو سنوارتا رہا
جو سر کہیں جھکا نہیں وہ بارِ دوش ہوگیا
زمانہ زہر میں بجھاکے تیر مارتا رہا

ہمیں ہی راس آسکی نہ راہ و رسمِ زندگی
نہ جانے عمر کاٹ دی ہے کون سے خیال میں
جواب کچھ بھلا ضرور، کیا بھلا پتہ نہیں
سوال کرکے کھوگئے تھے لذتِ سوال میں
ہے یہ نشاطِ تشنگی تو وہ عروجِ تشنگی
بجز فریب کیا دھرا ہے ہجر اور وصال میں
اسی لیے بنالیا شعار اپنا خامشی
کریدا جب تو کچھ نہ پایا گرمیِ مقال میں

کسے سنائیے ہزار قصہ ہائے دردِ دل
تمام سنگ و خشت ہیں، کسے ہے گوشِ آرزو
جو نکلا حرفِ مدعا تو یار غیر ہوگئے
یہی بہت ہے گر بچی رہے زباں کی آبرو
مکاں حدِ نگاہ ہے، زماں بھی سدِ راہ ہے
وسیع تر ہے شش جہت سے اپنی ہی رگِ گلو
ہزار آسمان کی خبر بھی لائے ہم تو کیا
پلٹ پلٹ کے آگیا زمیں پہ ذوقِ جستجو

اسیرِ شہر کا ہر اک وطن ہے وہ جہاں رہے
غریبِ شہرِ خواب و آرزو جہاں میں اجنبی
سموم کے لیے خیامِ گل کے در بھی باز ہیں
نسیم غنچہ آشنا ہے گلستاں میں اجنبی
حصار میں ہوس کے عصمتِ وفا بھی کھوگئی
نگاہِ دلبری دیارِ دلبراں میں اجنبی

دروغ لطفِ خاطر و قبولِ عام کی سند
حقیقتوں کے چہرے ساری داستاں میں اجنبی

ذراسی بات تو فسانہ در فسانہ چل پڑی
کسے ہے فرصتِ نفس جو زخم کی زباں سُنے
کوئی جگہ نہیں جہاں کسی سے چھپ کے رو سکے
کہاں وہ آنکھ جو نظر نظر کی داستاں سنے
ہزار گیت گو نجتے ہیں، چیختے ہیں بزم میں
کسے پڑی ہے کون ذوقِ نغمہ کی فغاں سنے
وہ شور ہے کہ اپنی بات بھی نہ پہونچے کان تک
خود اپنے دل کی بات کوئی بیٹھ کر کہاں سُنے

(1963)

# ایک اور عالم آشوب

قرن ہا قرن سے ہر گام پہ ہوتا رہا ہم کو یہ گماں
ناخنِ عقل سے کھلنے ہی کو ہے عقدۂ دشوارِ جہاں
میر صاحب نے جو فرمایا تھا یہ "کار گہہِ شیشہ گراں
کار نازک ہے" تو ہم سانس بھی روکے رہے حیراں ترساں
مثلِ غنچۂ خوابیدہ میں اس طرح رہے مُہر بہ لب
جیسے آتی ہے دبے پاؤں صبا پرسشِ احوال کو یاں
خلوتِ ذہن کے دروازے پہ آیا جو خیالوں کا ہجوم
کی یہ تاکید کہ ملحوظ رہے خاطرِ خوابیدہ جہاں
حکم آیا تھا ہمارے لیے در پردۂ نغماتِ سکوت
سوتے سنسار میں تنہا رہے بیدار بہ ہر سو نگراں
ہر نفس قطع رہِ عمرِ عذابِ دو جہاں کے ہم وزن
دھڑکنیں بھی تھیں مزاجِ دلِ نازک کے لیے بارِ گراں
انتظار ایسا کیا ہر بُنِ مو بن گیا چشمِ امید
قیدِ تنہائی میں بے مونسِ غم کٹ گئی شامِ ہجراں

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ مضامینِ سخن جمع ہیں سب
ہم رفو کرتے رہے زخمِ نظارہ کا ہر اک چاکِ نہاں
روٹھ جائیں جو معانی تو پھر الفاظ ہیں خالی کشکول
اسی اندیشے سے کھولی نہیں الفاظ کی رنگین دُکاں
قرض اکیلے ہی ادا کرتے رہے زیست کے ہر لمحے کا
غیرتِ دل نے اٹھایا نہ محبت میں وفا کا احساں
ہم نے اک عمر اٹھایا ہے وہ خاموشیِ جاں کاہ کا بار
سینۂ ضبط میں الفاظ و معانی کا سمندر ہے رواں
ایسی تیزی سے چلے نور کی رفتار کا دم ٹوٹ گیا
یوں اڑے، گردِ کفِ پا سے بھی پیچھے ہی رہی کاہکشاں
ایسے لمحات بھی آئے ہیں کہ اِک لمحے کی یہ وسعت تھی
قیدیوں کی طرح گزری ہیں جھکائے ہوئے آنکھیں صدیاں
پھر بھی اُس معجزۂ فکر کے دیدار سے محروم رہے
جو یہ فرماتا کہ اب ایک قصیدہ ہو برائے انساں

اِک جہاں گم شدۂ گردِ رہِ آتش و بارود ہے آج
وقت کے شاہ سواروں کی تگاپو سے اُٹھا وہ طوفاں
وحشت آثاریِ تخریب سے ایامِ جہالت کا سماں
بربریت کے وہ اسباب کہ چنگیز و ہلاکو لرزاں
آدمیت کی تباہی کے وہ اسباب بہم آج ہوئے
مرگِ تہذیب پہ تیمور سے تا ہٹلر و رومل گریاں
زندگی جس کو بتاتے رہے پیغمبر و اوتار ثواب
اُس کی ہر سانس ہے سینے میں جہنم کے عذابوں سے گراں

بوجھ ایسا کہ اُٹھائے نہ بنے اور اُتارے نہ بنے
ہے سزا ایسی کہ میعاد و مشقت کا نہیں کچھ عنواں

زیست ناکردہ گنہ ہے کہ مفر جس سے نہ جس کی توبہ
طوقِ انفاس سے ہر لمحہ اُلجھتی رہے اک برقِ تپاں
کائنات آج سے پہلے تھی مفکر کے لیے درسِ نظر
شش جہت لاکھوں برس سے رہے جولاں گہہِ تخئیلِ جواں
مقصد و معنی و ترتیب و ترقی کے جو آئینے تھے
ہوگئے آئینۂ لغویت و بے سروپائی وہی کون اور مکاں
وہی قاتل ہے خدا کا جو زمیں پر تھا خدا کا نائب
کل جو خود عالمِ اکبر تھا، وہی ہوگیا بے سمت دھواں
آج انسان کی عظمت کا تصور ہے کفن کا محتاج
فلسفہ فکر کے رستے ہوئے زخموں کا کرے کیا درماں
آج معلوم ہوا، حق سے بڑا جھوٹ نہیں دنیا میں
ظلم ہے ظلم، ہر انصاف عدالت گہہِ ابنائے زماں
محترم وہ ہے، جو سجدہ کرے لات و ہبلِ دولت کو
ٹوٹ جاتا ہے، اگر خم نہ ہو قد پیشِ خدایانِ جہاں
پا بہ زنجیرِ تقاضائے شکم علم ہے مجرم کی طرح
ہیں ابوجہل لیے ہاتھ میں انصاف و خرد کی میزاں
غاصب و خائن و راشی کو ہوس صاحبِ منبر ہوجائے
چور اچکّوں کی تمنا کہ بنیں قاضیِ حاجاتِ جہاں
قتل کے جرم میں ماخوذ ہیں سقراط و حسین و منصور
خوں لگا کر ہیں شہیدوں میں کھڑے حرملہ و شمر و سناں

اندھوں بہروں کو یہ دعویٰ کہ وہ رکھتے ہیں حواسِ خمسہ
ہوئے مختل جو حواس ان کے تو دنیا کی طرف ہیں نگراں
مُہر آنکھوں پہ تعصب نے لگادی تو بنے اہلِ نظر
بولیاں بولتے ہیں خوب حماقت نے عطا کی جو زباں
جن کے ذہنوں میں ہے تاریک خیالات کے خفاش کا گھر
مطلعِ ذہنِ جہاں تاب کو ٹھیراتے ہیں ظلمت کا مکاں
اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں جنازہ اپنا
اور یہ زعم کہ ہیں مہدیِ موعود و مسیحِ دوراں
کفشِ اربابِ حکومت کو صحیفے کی طرح سر پہ دھرے
دہر کو دیتے ہیں تعلیمِ سرافرازی و درسِ ایماں

جن کا شیوہ ہے سگِ اہلِ اَمارت کی پرستش کرنا
کعبۂ حق کے نگہبانوں میں لکھواتے ہیں اپنا بھی نشاں

نکتہ چینوں کے لیے ہے ادبِ حاضرہ خوانِ کرگس
ادبِ عالیہ ہے مردہ فروشوں کی تجارت کی دُکاں
ہم کل اک بزم میں پہنچے تو عجب نقشۂ عبرت دیکھا
ادب وشعر کی تنقید میں مصروف تھے سب خورد و کلاں
خوش ہوا جی کہ صداقت کے طلب گاروں کے اس مجمع میں
گیسوئے شعر کے الجھاؤ کو سلجھائیں گے صاحب نظراں
نقد و افسانہ و تحقیق کے معیاروں کا ہوگا چرچا
فن و تہذیب کی اقدار کے بحران کا ہوگا درماں
ساغرِ معرفتِ دردِ جہاں ہوگا عطا نام بنام

ظرف بے خواراں سے انصاف کرے گا کرم پیرِ مغاں
کذب پر ہوگا ترا طلبِ حق سے تولا ہوگا
پائیں گے دادِ غمِ عشق و غمِ دہر و غمِ شعلۂ جاں
مژدۂ دید سے ہوجائیں گے روشن دل و چشمِ یعقوب
اشکِ ہجراں کو سمیٹے گی شعاعِ غمِ ماہِ کنعاں
غم گساروں سے چھلک جائے گا تنہائی کا ساکت صحرا
فکرِ گم گشتہ کو مل جائے گا بھٹکی ہوئی منزل کا نشاں
رہنما ہوگا کوئی رمز شناسِ رہِ ایمان و یقیں
اہلِ تشکیک کو بتلائے گا ہے مرکزِ ایمان یہاں
سرِّ تخلیق، معانی و علائم سے اٹھیں گے پردے
اور ناکامیِ ابلاغ کے اسباب بھی ہوویں گے بیاں

لیکن اے وائے مقدر کہ وہاں بھی تھی بصیرت معدوم
واں بھی اربابِ سیاست کے قدم تھامے تھے ابنائے زماں
یہ نئی وضعِ تکلف کہ ادیبوں سے نہ پوچھو احوال
حکم تھا یہ کہ رہیں قفل بہ لب صاحبِ دل، دیدہ وراں
احتیاط ایسی کہ ہر ذکر ہو، تخلیق کا مذکور نہ ہو
التزام ایسا کہ انصاف کی کرسی پہ ہوں خود مدعیاں
عقل نے حکم دیا شعر و ادب لعنتِ شہرت طلبی
دل نے فرمایا کہ تنقید بھی ہے بردہ فروشوں کی دکاں

عقل و دل دونوں سے ہم نے بہ لجاجت بہ ادب یہ پوچھا
گر یہاں بھی نہیں انصاف تو معتوبِ جہاں جائیں کہاں

علم نے فیصلہ فرمایا کہ دانش کدۂ. اہلِ خرد
بے نیازانِ رہ و رسمِ زماں کے لیے ہے بیتِ اماں
یہ بجا ہے کہ وہاں دولت و ثروت ہے نہ جاہ و حشمت
لیکن اچھا ہے، ان امراض سے محفوظ رہے دل کا مکاں
دور سے دیکھا تو واں چہروں پہ تقدیس کے ہالے دیکھے
علم کے نشّے سے سرشار نظر آیا ہر اک پیر وجواں
ہم کہ وارفتۂ تحقیق وتجسّس تھے، چلے آئے کھنچ
کہ ہمیں تشنگیِ شوق کا انعام عطا ہوگا یہاں
پہرے داروں نے درِ داخلہ پر آنکھیں دکھائیں، پھر بھی
ہم بصد نازِ خرد بڑھ گئے سوئے حرمِ پیرِ مغاں
تھے وہاں منتخب اربابِ خرد جمع برائے انصاف
زعم ہر شخص کو تھا، اپنی جگہ ہے وہ فلاطونِ زماں
اپنے کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے پشتارۂ علم و اسناد
ہم بھی اک صف میں کھڑے ہوگئے الطاف وکرم کے خواہاں

ایک نے پوچھا کہ "مذہب" تو کہا "علم وصداقت کی تلاش"
ایک نے نسل ونسب پوچھا تو بولا کہ "ہوں فردِ انساں"
ایک نے پوچھا کہ "کچھ رشتہ ہے اربابِ حکومت سے ترا"
با ادب سر کے اشارے سے کہا "میں ہوں غریبِ دوراں"
ایک نے پوچھا کہ "تو جھوٹ کو سچ کرکے دکھا سکتا ہے؟"
کہا "سقراط وحسین ابن علی سے ہے مجھے ربطِ نہاں"
ایک نے پوچھا کہ "کیا کی ہے کبھی مشقِ قدم بوسی بھی"
تو کہا "زخمِ سر اپنا ہے سرافرازی کا تابندہ نشاں"

سخت بد حظ ہوئے وہ منتخب اربابِ زمانہ مجھ سے
اُٹھا غیظ و غضب شرع ہوس شعلہ بہ لب، کف بہ دہاں
اور فرمایا کہ "تو علم کی خدمت کے نہیں ہے لائق
تیری تقدیر ہے آوارگی کوئے ملامت ناداں
علم ہے مذہبِ اربابِ سیاست کا غلامِ ادنیٰ
فضل ہے خادمِ ذات و نسبِ صدر نشیں کے شایاں
سب سے اعلیٰ سند اربابِ حکومت کی قرابت داری
کفش برداریِ حکام سفارش کا ہے روشن عنواں
مسندِ علم کے شایاں ہے، جسے ذوق ہے پابوسی کا
سرفرازی کا جسے خبط ہے، کھاتا رہے سنگِ طفلاں
سچ کے مقتول ہیں سقراط و حسین و منصور
سچ کا حاکم ہے وہی، کذب و صداقت کو جو کہتا ہے گماں"
علم ہے نسل و نسب، دین و وطن، قوم و قبیلہ کا اسیر
علم خانوں میں، لکیروں میں، حصاروں میں ہے تقسیم یہاں
علم اسناد کا پابند ہے، اسناد ہیں بوجہل کے ہاتھ
علم ہے مسند و منصب کی بلندی کا فقط ایک نشاں
علم ہے نقل نویسوں کے سیہ خانے کا اک زندانی
علم ہے عقل سے معذوروں کے اذہان کا پیچیدہ دھواں
علم کی عقدہ کشائی پہ ہیں مامور وہ بوڑھے طوطے
شیر خواروں کی طرح جن کی زبانوں پہ ہے اب بھی غوں غاں
علم کے مسلخ و زندان ہیں سب مدرسے، دانش گاہیں
علم کے مشہد و مقتل ہیں دفاتر کے سنہرے ایواں
علم کی مسندِ عالی کے سزاوار ہیں جہّال کے بیٹے پوتے

کوثرِ علم پہ فائز ہیں غلامانِ غلامانِ جہاں
علم کے قتل پہ مامور ہیں کم بین و کم آگاہ بزرگ
علم کی لاش کے کرگس ہیں بزرگوں کے جواں فرزنداں

اے دریغا کہ نہیں ایک بھی ممدوح سزاوارِ مدیح
اے دریغا کہ نہیں ایک بھی معشوق غزل کے شایاں
اے دریغا کہ ہمیں ایک قصیدہ بھی نہ لکھنا آیا
اے دریغا کہ ہوئی ہجو سے آلودہ پھر اک بار زباں
عصرِ حاضر کا ہے یہ جبر کہ پڑھتے رہو اپنا نوحہ
اور جب لکھنے کو بیٹھو تو لکھو مرثیۂ اہلِ جہاں
نظم لکھنے کی ہو خواہش تو لکھو خون میں تر عہد آشوب
غزل آمادہ طبیعت ہو تو کرتے رہو نفرت کا بیاں
اگر اس دور کا بھی کوئی خدا ہو تو یہ اس سے پوچھیں
ہم نے کیا ایسی خطا کی تھی کہ مِلتا نہیں تیرا بھی نشاں
جُرم کیا تھا کہ ملا منصبِ خونابہ فشانی ہم کو
تو نے کیوں ہم کو دیا روشنیٔ ذہن و نظر کا ساماں
کیا گنہ تھا کہ ہیں پاداش میں جس کی دل و دیدہ ماخوذ
تو نے کیوں روزِ ازل سے ہمیں دی قسمتِ خونیں جگراں
ہم کو بھی اہلِ سیاست کی طرح تیرہ دلی دے دیتا
کامیابانِ زمانہ کی طرح دل میں نہ اُٹھتا طوفاں
ہم کو بھی مسندِ اعلیٰ کے لیے سر کا خلا مِل جاتا
ہم کو بھی جہل کی دولت سے بنا دیتا فلاطونِ زماں
ہم کو بھی صدق کو جھٹلانے کی تھوڑی ہی سی جرأت ملتی

ہم کو بھی جہل کی پابوسی کا کچھ حوصلہ ہوتا ارزاں
ہم بھی اربابِ زمانہ کی طرح خود سے دغا کرسکتے
ہم بھی عمر اہلِ ریا بن کے بسر کرتے بہ حالِ شاداں
تو نے یہ سب نہ دیا، ذہن و نظر، صدق و صفا ہی جو دیے
تو کرم ہوتا جو دیتا نہ برے منہ میں سخنور کی زباں

میں ہوں گستاخ خدایانِ جہاں سے تو معیّت ہے تری
میں ہوں گردن زدنی، سوختنی، تب بھی ہے تیرا احساں

(1963-68)

# عمرِ رائگاں

اک ترا ساتھ چھوٹ جانے سے
رک گئی کیسے گردشِ ایام
کیسے برہم ہوا جہاں کا نظام
وقت ٹھیرا ہوا ہے ایک جگہ
پا بہ زنجیرِ غم ہیں صبح و شام

تو یقیں مان، میرے آنگن میں
کئی دن ہو گئے ہیں صبح ہوئے
دھوپ اُتری، نہ روشنی آئے
تیرا پیکر طلوع کب ہوگا؟

میں بھی عمرِ گریز پا سے کہوں
زندگی سے گھٹا دے یہ شب و روز
تو بھی اپنے خدا سے پوچھ کبھی
کیا شب و روزِ ہجر بھی یا رب
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

(1964)

# بیا تا گل بیا فشانیم

ہوائے زمستاں کی تیزی رگوں میں لہو منجمد کر رہی ہے
برودت فضا کی بہت روز ہوتے ہیں ضد کر رہی ہے
گلا لو انھیں جن کی قربت کی گرمی سے پگھلے یہ موسم
شمیمِ نفس سے فضا ہو معطر تو بدلے یہ موسم

خزاں چپکے چپکے چلی آ رہی ہے
کہ پھولوں کا زر اور شاخوں کا زیور
چرا کر چھپا دے کہیں دامنِ خاک میں
وہ خوں چوس لے جو ابھی دوڑتا ہے رگِ تاک میں
گرا دے، بہا دے، لنڈھا دے اُسے
جو ساغر چھلکتا ہے مے خانۂ چشمِ نمناک میں

ہوائے زمستاں نے کر لی ہے سازش خزاں سے

درختوں کا پیراہنِ سبز اُترنے لگا ہے
کہ مال و متاعِ بہاراں زمیں پر بکھرنے لگا ہے
رگِ تاک کا خون ہم ہی چُرا لیں
کہ گردش لہو کی ہماری رگوں میں کہیں تھم نہ جائے
جو دل زندگی کے بدلتے ہوئے موسموں کے مقابل رہا ہے
کہیں دامنِ زیست پر قطرۂ موم کی طرح سے جم نہ جائے

یہ پت جھڑ کی رُت آرزوؤں کی شاخوں سے اُمّید کے برگ و بر چھین لے گی
یہ احساسِ تنہائی کا نشتر زہر آلودہ بنکر رگِ جاں میں اُترے
تو اشکوں کی دولت کے ساتھ آبروئے نظر چھین لے گی
متاعِ شکیب، اعتبارِ اثر چھین لے گی

خزاں جیسے آئی ہے اک روز یوں ہی چلی جائے گی
گل و گلستاں، شہر و صحرا پہ پھر سے بہار آئے گی
مگر ایسے بھی ہوں گے کچھ نونہالانِ بخت گزیدہ
کہ پھر ملگجا زرد پیراہن اپنا بدلنا بھی چاہیں
تو تازہ بہاروں سے خلعت نہیں پا سکیں گے

اگر تم کو سبز و شاداب رکھنا ہے تنہائیوں کو
بلا لو اُنھیں جن کے آنے سے بدلے گا موسم
شمیم نفس روح کو جب معطر کرے گی تو سنبھلے گا موسم

رگِ تاک کا خون پینے سے حاصل

## خزاں کو نہ دیکھو

اُدھر دیکھو— آنکھوں میں مہتاب اُترے ہوئے ہیں
نگاہوں سے صحن و در و بام چمکے ہوئے ہیں
وہ چہرہ گلابی، وہ عارض شہابی، وہ لب ہیں شرابی
وہ قامت کہ سرتا قدم پھول چٹکے ہوئے ہیں
وہ رفتار، جھونکا نسیم سحر کا خراماں
وہ گفتار، دل کے اندھیرے میں جشنِ چراغاں

اُدھر دیکھو اپنی رگوں میں لہو کو ہی نغمہ سرا پندہ رکھو
دل زندہ رکھو
بدلتے ہوئے موسموں میں بہاروں کے اوراق تابندہ رکھو

(1964)

# مفاہمت

کل تک تمام رستے کتنے الگ الگ تھے
رستوں کے پیچ و خم میں منزل الجھ گئی تھی
ہر ہر قدم پہ گردِ رہ تھامتی تھی دامن
آنکھوں میں گرد، بالوں پر دھول جم چکی تھی
ہر موڑ پر دوراہا پیروں کو روکتا تھا
ہر راہ زخمِ پا سے کچھ خون مانگتی تھی
کوئے خرد کی تنگی اُکتا چکی تھی دل کو
دشتِ جنوں کی وسعت بھی تنگ ہو رہی تھی
طوفِ درِ بتاں سے گھبرا گئی تھی وحشت
مے خانوں کی فضا بھی بوجھل سی لگ رہی تھی
مرنے کے راستے سب سنسان ہو چکے تھے
جینے کی راہ ساری ویراں پڑی ہوئی تھی
سچ یہ ہے عاقبت سے ایمان اُٹھ چکا تھا
قدموں سے لپٹی دنیا سے جنگ ٹھن چکی تھی

اس جنگ میں نہ جانے کیا گزری چشم و دل پر
اک عمر ہم نے اپنا کوئی پتا نہ پایا
زخموں سے چور ہوکر جب آنکھ موندلی تو
اک چشمِ ملتفت کو پرسانِ حال دیکھا
دل نے تمام رازِ سربستہ اُس کے آگے
یوں رکھ دیے کہ جیسے تھا اک یہی مداوا
اُس نے کہا کہ اٹھو رستے کی گرد جھاڑو
اُس کی نظر سے ہم نے دنیا کو پھر سے دیکھا

کل تک تمام رستے کتنے الگ الگ تھے
اب سارے راستوں کا تھا ایک ہی سا نقشہ
کوئے خرد کی تنگی دشتِ جنوں کی وسعت
طوفِ درِ بُتاں ہو یا میکدے کا پھیرا
مرنے کے راستے ہوں یا زندگی کی راہیں
عقبیٰ کی بے یقینی، قدموں سے لپٹی دنیا
سب ایک ہی نشانِ منزل دکھا رہے تھے
اب سارے راستوں کا رُخ ایک ہی طرف تھا

مدّت کے بعد دنیا نے آج مسکرا کر
دیکھا تو عقل و وحشت نے ایک ساتھ جانا
دنیا سے لڑتے لڑتے دنیا کے ہوگئے ہم
کچھ ہار ہم نے مانی، کچھ ہم سے ہاری دنیا

(1964)

# مرگِ انبوہ

ہم ہیں یاں منتظرِ مژدۂ عیدِ دیدار
واں ابھی اُلجھی ہوئی زلف نہ سلجھی ہوگی
ہوگا آنکھوں میں ابھی رات کے خوابوں کا خُمار
نیند پلکوں کی گھنی چھاؤں میں سمٹی ہوگی

دن کے صحرا میں پھر اک بار بھٹکنے کے لیے
حجلۂ شرق سے خورشیدِ جہاں تاب اُٹھا
کب سے بے کار بھٹکتا ہے یہ سودائی بھی
روز و شب پاؤں کی زنجیر بنے پھرتے ہیں
اک کڑی اور بہر گام بڑھی جاتی ہے

دھوپ چڑھتے ہوئے سورج کا سہارا لے کر
در و دیوار سے آنگن میں اُتر آئی ہے

رات بھر سوئی ہوئی خاک نے کروٹ بدلی
ذرّے آئینے شعاعوں کے لیے بیٹھے ہیں
ایک خاموش سا غل ہے کہ سحر آئی ہے
نیند کو آنکھوں سے دھو ڈالیں، اٹھیں بستر سے
لوگ اب جشن منانے نکل آئے گھر سے
ہم بھی دیکھیں گے کن آنکھوں میں سحر ہوتی ہے
کون سے چہرے ہیں جو جشن میں کھل جاتے ہیں
کس طرح چاک گریبانوں کے سِل جاتے ہیں
ہم بھی دیکھیں کہ یہ بے وجہ خوشی کیسی ہے
عمر بھر فکرِ معیشت کے کڑے بوجھ تلے
جو دبے رہتے ہیں، ہنستے ہیں تو کیوں ہنستے ہیں
کس طرح گردشِ شب و روز جھٹک دیتے ہیں
نئے ملبوس کہاں جاکے پہن لیتے ہیں

ہم نے اس جشن میں ہر چہرے کو جاکر دیکھا
آنکھ کے آئینے سے روح کے اندر جھانکا
جس کی آمد کا ہے یہ جشن چھپی ہے وہ کہاں
ہم تو ڈھونڈ آئے کہیں اُس کا نشاں بھی نہ ملا
نور کیا، بجھتے چراغوں کا دھواں بھی نہ ملا

(1964)

# صحرائے سکوت

(طویل نظم)

(1)

ابھی تو رات کے پچھلے پہر کا سناٹا
صدائے پہرہ سے چونکا تھا لے کے انگڑائی
دھڑک رہی ہے ابھی جاگتے رہو کی صدا
ابھی تو کروٹیں لیتی ہے شب کی پہنائی
یہ پہرے دار کے قدموں کی ڈوبتی آواز
زیادہ دیر نہ رہ پائے گی سکوت نواز

کسی بہانے تو ٹوٹی ہے مُہرِ نیم شبی
کسی نے کی تو حضورِ سکوت بے ادبی

اٹھے جو موجِ صدا خامُشی کے دریا میں
تو مدّ و جزر بہت دیر تک نہیں تھمتا

حدیں گذشتہ زمانوں کی ملنے لگتی ہیں
صدائیں ڈوب گئی تھیں جو قعرِ ماضی میں
ابھرتی آتی ہیں قطرہ بہ قطرہ، موج بہ موج
سُنے اگر کوئی بیتے ہوئے دنوں کی صدا
تو خامشی کی زباں داستان دُہرائے
کئی برس ہوئے، گذرے ہزاروں روز و شب
یہ بات ایسے دنوں کی ہے، جن کا ذکر بھی اب
خیال و خواب کی دنیا کا ذکر لگتا ہے
وہ دن کچھ ایسے تھے جیسے ہو عالم سکرات
نہ موت پاس پھٹکتی، نہ راس آتی حیات
سکوتِ غم پہ عجب بے حِسی کا عالم تھا
لگی تھی چوٹ یہ چوٹ ایسی شیشۂ دل پر
کہ دل تو دل ہے، زمانہ بھی ہوگیا پتھر
وہ محفلیں کہ جہاں اُٹھنا بیٹھنا تھا سدا
دکھائی دیتی تھیں بزمِ بُتانِ ایلورا
سکوتِ نیم شبی ہو کہ نیم روز کا شور
گذرتے محفلِ دل سے نظر جھکائے ہوئے
لبوں پہ مُہر لگائے، قدم دبائے ہوئے
غنودہ آنکھوں میں کٹ جاتا روزِ بیکاری
حواس پر وہ سراسیمگی کا عالم تھا
کہ دن تو شب کی طرح سوتے جاگتے کٹتا
طلوع ہوتا سرِ شام دردِ گُم کردہ
لگا کے جس کو کلیجے سے نیند سوجاتی

وہ درد خواب کی وادی سے پھر پلٹ آتا
تمام شہر جو سوتا، وہ جاگتا تنہا
وہ شام ہوتی جو تمہید نیند آنے کی
کبھی تو کیفوں کی بحثوں میں قتل ہو جاتی
کبھی تو پیچ و خمِ رہ گذر میں کھو جاتی
کبھی تو دن کے اجالے سے صبح ہونے تک
طوافِ جام کیا کرتی مثل پروانہ

اجڑنے لگتی جو میخانے کی چہکتی بزم
بھرے بھرے خُم و مینا و جام ہوکے تہی
اٹھائے جاتے کبھی، گاہ خود ہی اُٹھ جاتے
وہ میکدے بھی جو آغوشِ مہرباں کی طرح
زمانے بھر کے نکالے ہوؤں پہ کھلتے ہیں
بنداسی آنکھوں کے مانند بند ہو جاتے
رفیق ایک کے بعد ایک گھر چلے جاتے
مگر وہ درد کہ جس کا نہ کوئی گھر، نہ مقام
تمام رات اکیلا پکارتا پھرتا
کہیں جو آنکھ کوئی جاگتی ہوئی ملتی
کہیں جو ذہن کوئی سوچتا نظر آتا
کہیں جو درد کوئی جاگتا ہوا ملتا
وہیں پہ رُک کے بہت دیر تک کھڑا رہتا
غم اپنے بانٹتا، اوروں کے درد و غم سہتا

☆

کسی دوراہے کا نکڑ، کسی مکاں کی منڈیر
کسی دُکان کا تختہ، کسی سڑک کا موڑ
کسی جگہ پہ ٹریفک کے آئی لینڈ کے بیچ
کسی بلند عمارت کی خالی بالکنی
کسی غریب سے ہوٹل کی غم زدہ کرسی
کسی بھی پارک کا شبنم سے بھیگتا ہوا لان
کسی اجاڑ سے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے ٹیوب
جہاں بھی ٹھیر گئے، آ گئی وہیں منزل
جہاں بھی بیٹھ گئے، جم گئی وہیں محفل
ہزاروں مسئلے ایسے کہ جن پہ بحث چھڑے
تو رات دیکھتے ہی دیکھتے گذر جائے

☆

مصنّفین کی تحریک اور مسائل سے
مہ و ستارہ و خورشید کا تو رشتہ ہے
مگر یہیں کہیں گردش میں ہے زمیں کا نصیب
مسائلِ غمِ دوراں، غمِ بُتاں، غمِ ذات
حدُود سب کی اسی ایک حد سی مِلتی ہیں

(2)

ابھی تو ریڈیو پاگل کی طرح چیخا تھا
بھڑک اٹھے ہیں کہیں پھر سے شعلہ ہائے جنگ
کسی غریب ستم دیدہ ملک کے اوپر
جھپٹ رہے ہیں عقابوں کی شکل میں راکٹ

ہمارا شہر تو لپٹا ہوا ہے سپنوں میں
ہوا بھی چلتی ہے تو نیند کا خمار لیے
اِسی زمیں کا کوئی شہرِ دُور افتادہ
تڑپ کے کاٹ رہا ہوگا رات کی گھڑیاں
کِسی ہماری ہی بستی کی ایسی بستی میں
ہر ایک آنکھ کا در کھٹکھٹاتی ہوگی نیند
کہ کوئی تو اُسے آغوش میں سمیٹے گا
مگر سکون کہاں، نیند کے جو ناز اٹھائے
ہر آنکھ خوف کا مسکن، مکانِ وحشت ہے
لگے جو آنکھ تو پھر کیا خبر کُھلے نہ کُھلے
یہ سہمے سہمے ہوئے پھول کی طرح بچّے
انھیں یہ علم نہیں، ان کے سن رسیدہ بزرگ
اندھیری رات میں کیوں کھیلتے ہیں آگ کا کھیل
جہاں گلاب کا تختہ ابھی مہکتا تھا
وہاں چمکتا ہے کِس کا یہ تازہ تازہ لہو
جو ہاتھ جھولے کی ڈوری ہلا رہے تھے ابھی
وہ خشک و سرد کٹی شاخ کی طرح کیوں ہیں
وہ لب جو لوریاں دیتے تھے گنگناتے ہوئے
اب اُن کے بول ہیں کیوں سرد لفظوں کے لاشے
وہ آنکھیں جن میں محبت کی نرمیاں تھیں تمام
کہاں سے خوف کے آسیب اُن میں در آئے

☆

یہ ریڈیو بھی عجب چیز ہے کہ دنیا میں

کہیں بھی درد اُٹھے، جاگتا ہے ساری رات
مریضِ غم پہ گذرتی ہے اور بھاری رات

یہ آدمی کی ہے آواز یا مشین کی صدا
کہ آدمی کی صدا میں تو دل دھڑکتا ہے
کہ آدمی کی صدا میں تو آنکھ روتی ہے
کہ آدمی کی صدا کا تو چہرہ ہوتا ہے
مگر یہ کیسی ہے آواز، جس کا دل ہے نہ آنکھ
مگر یہ کیسی ہے آواز، جس کا چہرہ نہیں
یہ اور کچھ نہیں، چلا رہا ہے ذہن کا خوف
وہ ذہن جس کے نہاں خانے میں بھری ہے آگ
جہاں پہ رینگتے، پھنکارتے ہیں موت کے ناگ
جو رنگ دیتا رہا قلب کی سیاہی کو
جو جنم دیتا رہا موت اور تباہی کو
یہ آدمی کی نہیں، خوف کی صدائیں ہیں
جو اپنی ذات سے مقتول بھی ہے قاتل بھی
یہ خوف روز پکارے گا، روز چیخے گا
سکوتِ شب ہی نہیں، دن کی رزم گاہ میں بھی
یہ خوف ہی ہے جو کھلتے ہی آنکھ جاگتا ہے
نقب لگاتا ہے دیوارِ خواب میں شب بھر
تمام روز بھٹکتا ہے شاہراہوں پر
یہ خوف ہی ہے جو سینہ بہ سینہ چشم بہ چشم
کہیں ہے دردِ نہاں، اور کہیں ہے اشکِ عیاں

یہ خوف ہی ہے جو قریہ بہ قریہ، شہر بہ شہر
کہیں ہے بھوک کی کھیتی، کہیں ستم کی دُکاں
یہ خوف ہی ہے جو دریا بہ دریا، دشت بہ دشت
کہیں ہے سیلِ تباہی، کہیں ہے ریگِ تپاں
یہ خوف ہی ہے جو خانہ بہ خانہ، راہ بہ راہ
کہیں معاش کا غم ہے، کہیں غمِ دوراں
یہ خوف ہی ہے جو مجرم کی طرح چھپ چھپ کر
ہزاروں بھیس بدلتا ہوا نکلتا ہے
اِسی نے جمع کیے ہیں ذخیرۂ اجناس
اُس ایک نفع کی خاطر جو زندگی کا زیاں

☆

یہ خوف ہی ہے جسے ہم نے پچھلے برسوں میں
پلا کے اپنا لہو، اپنی آنکھ کے آنسو
کیا ہے اتنا بزرگ و عظیم، ایسا قوی
کہ آج رات کو اُس سے اماں نہ دِن کو سکوں
جو ذہن ہے تو پراگندہ، قلب ہے تو زبوں

☆

یہ اور کوئی نہیں، ہم، ہماری وحشت ہے
ہم اپنے آپ سے کیسے بچیں، کہاں جائیں

(3)

گھنے کچھ اور ہوئے جا رہے ہیں گیسوئے شب
لبِ سکوت سے کچھ بولتا ہے جادوئے شب
چراغِ راہ کی لَو نیچی ہوتی جاتی ہے

تمام رات کے جاگوں کو نیند آتی ہے
طلوعِ صبح میں باقی ہے اور ایک پہر
اٹھو کہ دیکھیں کوئی میکدہ کھلا ہوگا
ابھی کہیں نہ کہیں میکشانِ شب بیدار
بجھانا چاہتے ہوں گے دلوں کے آتش زار
مگر وہ آگ بھڑکتی ہی جارہی ہوگی

☆

یہ ایک چہرۂ پژمُردہ، خون سے محروم
پلا رہا ہے جو شعلوں کو اپنے دل کا لہو
کہاں کی آگ میں جلتا ہے یہ، کسے معلوم
یہ اپنے عہد کی لٹتی ہوئی امانت ہے
یہ اپنی نسل کی بٹتی ہوئی ذہانت ہے
یہ جامعات کی تعلیم کا گزیدہ ہے
یہ انتظامِ معیشت کا سم چشیدہ ہے
یہ ایک بھٹکی ہوئی روحِ بے قراری ہے
یہ ایک بجھتی ہوئی روشنی ہماری ہے
اسے کتابوں کے اوراق نے فریب دیا
یہ رہزنوں کا نہیں، راہبر کا مارا ہے

☆

ہوئے تھے جمع حکیمانِ شرق و غرب تمام
گذشتہ دیدہ وراں، عاقلانِ موجودہ
سبھوں نے جوڑ کے سر اس کے ساتھ سازش کی
کہ اور کچھ ہو، اِسے زندگی نہ راس آئے

سکھایا سب نے اسے حق ہے کیا، صداقت کیا
پڑھایا سب نے کہ ہے فرضِ آدمیت کیا
مگر کسی نے نہ اتنی سی بات بتلائی
کہ زندگی میں ان اقدار کو نہ اپنانا
وگرنہ ٹھوکریں کھاتے رہوگے عمر تمام
بنیں گے پاؤں کی زنجیر خالی جیب و شکم
تو پھر کسی کا بھی باقی نہیں رہے گا بھرم

☆

ہے اقتدار کے ہاتھوں میں عدل کی میزاں
ہے دولتوں کے قدم میں فضیلتوں کی دکاں
کوئی خدا کا نمازی، کوئی کرشن کا بھگت
کسی جبیں پہ تِلک، کوئی نورِ سجدہ لیے
مگر قریب سے دیکھو تو سب بتانِ سنگ
نہ ہونٹ سچے، نہ ماتھوں پہ ہے یقیں کا رنگ

☆

یہ جامعات و مدارس، یہ علم کے معبد
یہاں بھی جہل لیے ہے سند فضیلت کی

وہی اصولِ مناصب، قواعدِ جاگیر
بتانِ مذہب و ذات و زبان کی پوجا
نجاتِ آدمِ خاکی کا ہر جگہ چرچا
پہ آدمی کا پتہ دور تک نہیں ملتا

☆

تمام بیتیں توڑو بدستِ پیرِمغاں
کہاں کی یادِ بُتاں، کیا چراغِ شعلۂ جاں
حیات شوقِ فضول اور عبث غمِ دوراں
تمام فلسفے، علم و ادب کے سب آدرش
وہ بُت ہیں جن کو تراشا ہے خود فریبی نے
جوان کو لے کے چلو رزم گاہِ زیست میں ساتھ
قدم قدم پہ ہو احساس بارِ دوش ہیں یہ
ذرا بھی تیز ہوا ہو تو مُنہ کے بل گر جائیں
یہ اپنے پیروں پہ اُٹھ کر کھڑے نہیں ہوتے
ہمیشہ چلتے ہیں اُن زخمیوں کے کندھوں پر
چہار سمت سے کرتی ہے جن پہ وار حیات
جنھیں کبھی نہیں آتی ہے سازگار حیات

☆

یہ سب بُتانِ خود آرا ہیں پیرِ تسمہ پا
دکھاتے ہیں جو بہت دُور کے سنہرے خواب
بس اس لیے کہ جو ہے سامنے، نہ ہاتھ آئے
اٹھائے دوش پہ پیرانِ تسمہ پا کا بوجھ
جو گر پڑے کوئی زخمی، شکستہ دل تو یہی
لگا کے قہقہے اُس کو چبھوتے ہیں نشتر
وہ جتنا کرب سے دم توڑے، اتنا ہنستے ہیں
وہ کامیاب جو اِن کو اتار پھینکتے ہیں
وہی ہیں اچھے جو ہیں ان کے بوجھ سے بیزار

کچھ ایسے ان کے پجاری بھی ہم نے دیکھے ہیں
یہ بت ہیں جن کے لیے خود نمائی کے معبد
یہ سنگِ راہ ہیں اُن کے لیے نہ بارِ دوش
ہے زیست اُن کی بہ عیش، اور عاقبت ہے بخیر
اگر ضمیرِ ملامت شعار چپ ہوجائے
تو ہم بھی کھول لیں آدرش کی کوئی دؤکاں
ہر ایک وضع کے بُت ڈھال لیں بڑے چھوٹے
کوئی بہ طرزِ قدیم اور کوئی برنگِ جدید
کُچھ ایسے چیختے بُت اپنی بولی آپ لگائیں
کُچھ ایسے چُپ کہ خریدار اُن پہ قرباں جائیں
ہمارے شہر میں ہر آرٹ کی دُکانیں ہیں
جہاں خریدے نہیں جاتے صرف فن پارے
ضمیر و ذہن پہ بولی لگائی جاتی ہے
نظر، زبان، قلم، تیشے بیچے جاتے ہیں
ملے جو صاحبِ توفیق کوئی قدرشناس
تو فن ہی کیا ہے، وہ فنکار کے بھی دام لگائے
لگیں نہ دام جو فنکار و پارۂ فن کے
تو خود ہی فن کے سب آدرش ٹوٹ جاتے ہیں

☆

کہیں یہ کہتا تھا اک شوخ چشم اور بے باک
کہ نقلِ کفر نہیں کفر، میرے منہ میں خاک
خریدی جاتی ہے جنّت بھی آستانوں پر
خدا بھی بکتا ہے مدّت سے کچھ دکانوں پر

(4)

اِدھر تو موج بہ موج اُٹھ رہا ہے اک طوفاں
اُدھر خموشی کا فرماں "سکوت، اتھاہ سکوت"
جو لہر فکر کی دریائے خامشی میں اُٹھے
کنارے اُس کو جھپٹ کر دبوچ لیتے ہیں
جو موج پھیلتی جاتی تھی حلقہ در حلقہ
وہ ٹوٹتی ہے تو ہر حلقہ پابہ گِل ہوکر
اُسی اتھاہ خموشی میں ڈوب جاتا ہے

☆

خموشی اوڑھے ہوئے رات کی سیاہ ردا
فضا میں پھونکتی پھرتی ہے سحر مرگ آثار
زمیں کی گود میں بکھرے ہوئے مناظر کو
پلا کے زہر سُلاتی ہے اور گہری نیند
وسیع کھیتیاں پھیلائے پاؤں سوتی ہیں
کھڑے ہیں سنتری بن کر ہزاروں کوہ و جبال
اداس اداس سے بہتے ہیں ست رو دریا
کہ تیز پائی ہے آدابِ خامشی کے خلاف
چمکتے گونجتے شہروں کی شاہراہوں پہ
ہر ایک چیز بہت دیر سے ہے پابستہ
دُکانیں بند ہیں، فٹ پاتھ سرد و ویراں ہیں
خود اپنے نور کو روتے ہیں روشنی کے ستوں

وہ راستے جو مضافات تک پہونچتے ہیں
قدم قدم پہ انھیں بند گیٹ ملتے ہیں
بٹی ہوئی ہے بڑے چھوٹے خانوں میں فطرت
یہ تیرگی ہے جو وحدت کو توڑ دیتی ہے
یہ خاموشی ہے جو ہر مظہرِ حقیقت کو
اکیلا جہل کی ظلمت میں چھوڑ دیتی ہے
ہر ایک چہرے کو دے کر نقاب ظلمت کی
تمام دہر کو ظلمت میں ڈھانپ لیتی ہے
کہ کوئی آنکھ کسی اور کو نہ دیکھ سکے
کہ کوئی چہرہ کسی اور کو نہ پہچانے
اٹھو جو پھینک کے چہرے کی روح پوش نقاب
اِس آرزو میں کہ فطرت کی بھی نقاب اُٹھے
تو ہر طرف سے جھپٹتی ہے رات، تیرہ رات
خموشی حلقۂ گرداب تنگ کرتی ہے
کہ مِل سکے نہ زبانوں کو نغمگی کی نجات
کہ ہونے پائے نہ صبح اور نہ آفتاب اٹھے

کوئی یہ کہتا ہے سرگوشیوں میں "چپ سو جاؤ"
زبان داں ہے کوئی اور نہ کوئی محرمِ راز
نہ کوئی آنکھ ہے بینا، نہ کوئی قلب گداز
تمھارے چاروں طرف خاموشی کے پہرے ہیں
"کہو نہ کچھ کہ ہیں دیواریں گوش بر آواز
کہو نہ کچھ کہ ہیں دروازے آنکھ کھولے ہوئے

"دریچے، ذرۂ معانی ناشنیدہ • ہیں"
ہیں یوں تو آدمی بھی سنگ و خشت کے پیکر
جو لفظ سلطنتِ خاموشی میں ہو ممنوع
اُس ایک لفظ کو سننے کے واسطے ہر دم
ہیں سنگ و خشت تمام آنکھ کان کھولے ہوئے
کہ ایک لفظ بھی نکلے تو چھین لیں منہ سے

☆

نظر نظر سے یہ کہتی ہے "آنکھ بند کرو"
زباں زباں سے یہ کہتی ہے "کوئی کچھ نہ کہو"
ہر ایک لفظ کی منّت "ہم اَن کہے اچھے"
معانی کی یہ لجاجت "ہمیں زباں نہ ملے"

☆

سکوت پیشہ زبانوں کی گفتگو بھی سکوت
جو لوگ پہنے عبا و قبا سرِ منبر
بہت بلندی سے پیغمبرانہ بولتے ہیں
جب اُن کے لفظوں کی کھولو گرہ تو خاموشی
زباں پہ ذکر ہے اقدارِ روح و مذہب کا
مگر جو سینوں میں جھانکو تو ہوکتے صحرا
کہیں جو دل کو ٹٹولو تو ایک زر کے سوا
کوئی ضمیر نہ ایمان، کوئی حق نہ خدا
سکوت کے ہیں پیمبر یہ غازیِ گفتار
کہیں جو پوچھو کہ تنقید کی اجازت ہے
تو ہے زنخ طلبِ علم و سیلیِ استاد

خیال جوڑنا چاہے صدا سے گر رشتہ
تو بات ہی نہیں کٹتی، زبان کٹتی ہے
وہی خموشی جو کرتی ہے ضبط کی تلقین
ذرا سے زخم پہ مجروح ناگ کے مانند
صدا کو ڈسنے کی خاطر وہیں پلٹتی ہے
جہاں جہاں بھی جلیں لفظ کے سنہرے چراغ
اُدھر اُدھر کو وہ کف در دہاں جھپٹتی ہے

☆

اندھیری سلطنتِ خامشی کے آئیں ساز
زباں کو کرتے ہیں آدابِ گفتگو تعلیم
وہ جن کے مُنہ میں زباں ہے، نہ ذہن میں آواز
سکھاتے پھرتے ہیں لہجہ ہے کیا، زبان ہے کیا
وہ لہجہ جس پہ ہو تاریکیوں کی گہری تہہ
وہ لہجہ جس میں نہ اظہارِ مدّعا کی ہو راہ
وہ لہجہ جو کہ تملّق کے رنگ سے ہو سیاہ
وہ لہجہ جس میں بہم یک دگر ریا و گناہ

☆

ریا ہی مملکتِ خاموشی کا آئیں ہے
یہی زباں ہے، یہی ہے صدا یہی دیں ہے
اسی زبان میں کرتی ہے بات خاموشی
کچھ اس طرح کہ سنائی نہ دے صدا دل کی
جہاں بھی جاؤ، وہی خامشی کی گونج کا شور
یہ گونج ہے وہ اندھیرا ڈراؤنا جنگل

جہاں زبان ہے گم، لفظ گم، معانی گم
دل و دماغ و نظر کی ہر اک کہانی گم

☆

بہت زمانے سے ہم دشتِ خامشی میں گم
زبان و لفظ کے رشتوں کی جستجو میں ہیں
اندھیری راتیں چراغوں کی آرزو میں ہیں
مگر یہ کھوکھلی آوازوں کا مہیب سکوت
ریا کا زہر پیے لفظ کا لیے تابوت
بُلا رہا ہے کہ آؤ مشایعت کے لیے
یہ چاہتا ہے کہ لفظوں کو گہری قبروں میں
کچھ اس طرح سے کرے دفن، پھر وہ اُٹھ نہ سکیں
یہ چاہتا ہے معانی کو بیوگی دے کر
جلائے ایسی چتا میں کہ پھر وہ جی نہ سکیں
یہ چاہتا ہے کہ اس سازشِ گناہ میں ہم
شریک ہو کے گلا اپنا آپ ہی کاٹیں

☆

بہت زمانے سے اس دشتِ خامشی میں ہم
یہ دیکھتے ہیں کہ ہر روز ایک زندہ لفظ
کسی گناہ کے تاریک قید خانے میں
سسک سسک کے خموشی کا زہر پیتا ہے
پھر اُس کے بعد بہت سارے بے زباں عفریت
قرونِ وسطیٰ کے گونگے غلاموں کے مانند

جھکائے آنکھ کفن اُس کا قطع کرتے ہیں
کہ حاکموں کے گناہوں کا پردہ رہ جائے

☆

بہت زمانے سے اس دشتِ خامشی میں ہم
یہ دیکھتے ہیں معانی کی اک دُلھن ہر روز
زماں کی سیج سے تشنہ اٹھائی جاتی ہے
حضورِ خامُشی لب بستہ لائی جاتی ہے
دبوچ کر اُسے باہوں میں اپنی خاموشی
اشارہ گونگے غلاموں کی سمت کرتی ہے
جو اُس پہ ایسے جھپٹتے ہیں جیسے لاش پہ گِدھ
لباس اُس کا سرِ بزم اتارا جاتا ہے
غلام اُس کے اچھوتے بدن پہ ہنستے ہیں
خموشی ناخن و دنداں سے اُس کو نوچتی ہے
اور اُس پہ کھوکھلی آوازوں کا مہیب سکوت
ہزاروں قہقہوں کے تازیانے مارتا ہے

☆

بہت زمانے سے اس دشتِ خاموشی میں ہم
یہ دیکھتے ہیں زباں کی کنواری ماں ہر روز
کسی صلیب پہ لٹکی صدا کی لاش تلے
ازل کا کرب لیے آنکھ میں سسکتی ہے
فغاں قریب کھڑی بے بسی سے تکتی ہے

(5)

سکوتِ آخرِ شب ٹوٹنے ہی والا ہے

طیور چھیڑنے والے ہیں صبح کا نغمہ
فضا سمیٹنے والی ہے رات کی چادر
ہوا چلی ہے گلستان و دشت سے اُٹھ کر
کہ بوئے تازہ سے مہکے مشامِ قریہ و دیہہ
سیاہی اور خموشی کی سازشِ پیہم
کسی بھی غنچۂ نو کی ہنسی نہ روک سکی
فضا ہزاروں شگوفوں کے منہ سے ہنستی ہے
ہوا ہزاروں شگوفوں کے لب سے گاتی ہے

ہمارے شہر تک آئی نہیں ابھی یہ ہوا
ابھی تو نیند ہی میں کسمسا رہی ہے فضا
سوادِ شہر کے نزدیک گرد کا طوفاں
کچھ اس طرح سے اٹھا، ہوگئی فضا دھندلی
یہ گیس تیل کا طوفان گرد اڑاتا ہوا
ہر ایک راہ کے سینے پہ چڑھتا آتا ہے
ہر اک مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے
یہ گرد پھولوں کے دامن پہ چھائی جاتی ہے
لبوں سے نوچ کے ہر تازگی، شگفتہ لبی
دُھلے دُھلے سے مناظر پہ پھینکتی چھینٹے
مہکتی جھومتی موجِ صبا کو جھٹلا کر
تمام شہر کو دامن میں ڈھانپ لے گی ابھی
ابھی تو کھل کے سحر مسکرا نہ پائی تھی
مشامِ جاں نے ابھی تازہ سانس لی بھی نہ تھی

کہ دن کو پیچھے ہٹاتی، ڈھکیلتی، چڑھتی
بدل کے روپ چلی آئی پھر اندھیری رات
سکوت پھر سے نئے پیرہن میں آیا ہے
لپکتی بھاگتی پاگل مشینوں کے منہ سے
وہ شور اٹھا ہے کہ کوئی صدا سنائی نہ دے
وہ گرد اُڑی ہے کہ چہرہ کوئی دکھائی نہ دے
وہ غل پڑا ہے کہ نیندوں نے کھول دیں آنکھیں
گھروں سے لوگ نکل آئے بوکھلائے ہوئے
غبار نیند کا آنکھوں سے ملتے نکلے ہیں
جو خواب رات کو دیکھے تھے، جھوٹے نکلے ہیں

☆

قطار بس کے لیے لمبی ہوتی جاتی ہے
پلیٹ فارم پہ حشراتِ ارض کے مانند
ہر ایک سمت سے انساں امڈتے آتے ہیں
ذراسی دیر میں آئے گی ریل اڑاتی دھواں
اور ان کو دوسری منزل پہ یوں، اگل دے گی
کہ جیسے صورِ سرافیل سُن کے حشر کے روز
ہر ایک قبر سے مُردے نکل رہے ہوں ہزار

یہ سانس لیتے ہوئے جسم روز صبح کے وقت
گھروں سے اپنے پریشاں نکالے جاتے ہیں
یہ روز شہر بدر ہوتے ہیں بہ حال تباہ
یہ روز شام کے دامن میں مُنہ چھپائے ہوئے

نڈھال قدموں سے آتے ہیں شہر میں واپس
ڈرے ڈرے سے خود اپنے ہی گھر میں گھستے ہیں
انھیں یہ خوف کہیں پیٹ کی سلگتی آگ
دوبارہ رات کو بھی پھر جلا وطن نہ کرے
جلا نہ دے کہیں نیندوں کی جھومتی کھیتی
وہ خواب جن کی تمنا میں آنکھ کھولے ہوئے
تمام روز گذرتا ہے، لٹ نہ جائیں کہیں
کچھ اور تو نہیں حاصل انھیں زمانے میں
حسین خواب کبھی بھولے بھٹکے ملتے ہیں
جو وہ بھی چھین لے کوئی تو پھر جییں کیونکر
ترستے رہتے ہیں ہونٹ ان کے مسکرانے کو
جو خواب میں بھی نہ ہنس پائیں تو ہنسیں کیونکر
مشیں کی طرح سے دن کاٹتے ہیں چپ رہ کر
جو خواب میں بھی نہ بولیں تو لب کھلیں کیونکر

☆

یہ گھر کو جانیں نہ ہمسایے کو نہ دنیا کو
ضروریات کے اتنے تقاضے ہوتے ہیں
کہ ان کو جینے کی مہلت بھی مل نہیں سکتی
یہ ایسی روحیں ہیں دن میں بھٹکتی رہتی ہیں
جو رات آئے پلٹتی ہیں اپنی قبروں میں
یہ حادثہ بھی گذرتا ہے روز ہی ان پر
کہ ان کے ساتھ کی کچھ روحیں راہ گم کر کے
نشانِ قبر بھی پاتی نہیں پلٹ کے کبھی

نہ جانے کون سی راہیں. انھیں نگلتی ہیں
کہ ان کا کوئی پتہ پھر کبھی نہیں ملتا

☆

ٹرینیں روز اسٹیشن پہ یونہی چیخیں گی
بسیں ٹرامیں بھی دیوانہ وار دوڑیں گی
ملوں کی چمنیاں یونہی دھواں اڑائیں گی
گرج کے روز یونہی سائرن پکاریں گے
دفاتر اپنے دہن روز یونہی کھولیں گے
مگر کوئی نہ بتائے گا گم شدہ کا پتہ
کہ ان کو دی ہی نہیں ہے سکوت نے وہ زباں
جو دل سے بات کرے، اشک آنکھ سے پونچھے

☆

اٹھو کہ تم بھی اس انبوہ سے الگ تو نہیں
اٹھو کہ راہ تمھاری یہی صراط کا پل
یہ راستہ ہے وہ تلوار کی چمکتی دھار
وجود جس پہ ہر اک گام آگے بڑھتے ہوئے
اندھیری کھائی میں کٹ کٹ کے گرتا رہتا ہے
ذرا سے پیر ڈگیں اور جسم کٹ جائے
جو ایک پل بھی رُکو، وقت کا امڈتا سیل
نشاں مٹاتا ہوا پائمال کر کے بڑھے
جو عضو کٹ گیا، کٹنے دو، مت سمیٹو اُسے
وجود تیغ کی اس تیز دھار سے یونہی
ہمیشہ ہوتا رہا پارہ پارہ، ہونے دو

وجود تم کو اگر ہو چکا ہے جاں کا وبال
تو اس کو پھینک کے نیچے کی گہری کھائی میں
جہاں نہ حال، نہ ماضی، نہ کوئی مستقبل
جہاں نہ راست و چپ، پیش و پس نہ کوئی سمت
اگر نہیں ہے یہ جرأت تو آگے بڑھتے رہو
وجود خود ہی کسی لمحۂ غنیمت میں
تمھارے ہاتھ سے دامن چھڑا کے بھاگے گا

☆

وجود شہرِ خموشاں کی حد میں کچھ بھی نہیں
وجود شہرِ خموشاں کی حد میں کچھ بھی نہیں

(6)

یہ پُل صراط کا، یہ وقت کی چمکتی دھار
اِس انتظار میں ہے روزِ آفرینش سے
وہ ظلمتیں جو ہیں پوشیدہ گہری کھائی میں
وجود وار سے جن کے ہے پارہ پارہ تمام
بدل کے راہ جو شب خون روز مارتی ہیں
کبھی تو تیغ کی اس دھار پر قدم رکھیں
کبھی تو وقت کی رفتار سے بھی ٹکرائیں
گلا سکوت کا جس روز کٹ گیا، اُس دن
یہ پل صراط کا جنت کی راہ کھولے گا
جو لفظ قتل ہوئے ہیں، وہ جاگ اُٹھیں گے
برہنہ روحیں معانی کی، اپنے جسموں میں
پلٹ کے آئیں گی تازہ لباس پہنے ہوئے

دعائیں جامِ سم آلود توڑ ڈالیں گی
صدائیں اپنی صلیبوں سے نیچے اتریں گی
بڑھا کے سوگ زباں کی کنواری ماں، اٹھ کر
گلے لگائے گی لوٹی ہوئی صداؤں کو
لبوں سے چومے گی بچھڑی ہوئی دعاؤں کو

☆

وجود پھینک کر آئے گا پارہ پارہ بدن
نئے لباس میں اس شان سے کہ وقت کی تیغ
قدم قدم پہ بچھائے گی اُس کے تازہ پھول

☆

مگر وہ وقت، وہ موعودہ خوابِ نادیدہ
نہ جانے گم ہے کہاں آنے والے وقتوں میں
وہ نور کھویا ہے کن ظلمتوں کے دامن میں
ابھی تو رات ہے، لحہ بہ لحہ ، تہہ در تہہ
سکوت کا ہے تسلط ابھی تو رہ در رہ

☆

ابھی تو حال کے لمحات ہی میں جینا ہے
جو وقت گر چکا ماضی کے بحرِ اعظم میں
پلٹ پلٹ کے وہ طوفاں اُٹھاتا رہتا ہے
کنارے حال کے کٹ کٹ کے گرتے رہتے ہیں
اُس اندھے بحر کی آغوش میں جو ماضی ہے

☆

ہمارے پیچھے ہیں ماضی کی بے کراں لہریں

وجود حال کی لہروں میں غرق سر تا پا
نظر اٹھائیں تو یہ لہریں پھیل جاتی ہیں
نشانِ تازہ افق کا کہیں نہیں ملتا

☆

اِدھر تو موجوں کا طوفان کف اڑاتا ہوا
اُدھر نگاہ کے آگے ہے دھند، برف، دھواں
امڈتے آتے ہیں اندیشوں کے سیہ بادل
وہ خوف جس کی کمیں گاہ میں ہے موت چھپی
کڑکتا رہتا ہے بجلی کی طرح رہ رہ کر
اگر یہ خوف الٹ دے وجود کی کشتی
تو آنے والے زمانے کبھی نہ آئیں گے

☆

گرج گرج کے امڈتا رہے گا وقت کا سیل
یہ سیل حال کی لہروں کو بھی نگل لے گا
نہ کوئی حال، نہ ماضی، نہ کوئی مستقبل
کراں سے تابہ کراں چیختا پھرے گا سیل

☆

کسی وجود کا ننھا سا بھی سفینہ کہیں
نہ سر اٹھائے گا موجوں پہ اور نہ دوڑے گا
یہ ظلمتیں اُسے اِس طرح سے نگل لیں گی
وجود اپنے دیے پھر جلائے گا نہ کبھی
یہی ہمارا مقدر، ہمارا منصب ہے
کہ روشنی سے منوّر رکھیں زمانے کو

نو یں وجود کی محفوظ کرلیں لفظ بہ لفظ
جہاں جہاں بھی جلیں لفظ کے سنہرے چراغ
وہاں وہاں سے چھٹے تیرگیِ دشتِ سکوت
ہماری زیست کی لَو جب تلک بھڑکتی ہے
ہمارا ذہن ہے جب تک معانی کا مسکن
ہماری روح میں جب تک ہے لفظ شعلہ فگن
اُتارتے رہیں رگ رگ میں زہرِ خاموشی
نفس نفس سے اندھیروں کا خوں کشید کریں
یہ زہر اور یہ خوں پی لیا تو پھر کل کو
کوئی نہ بھٹکے گا صحرائے دشتِ ظلمت میں
معانی پھر نہ سر و پا برہنہ بھٹکیں گے
سرِ سراب نہ بے روح لفظ تڑپیں گے
جو آنے والے ہیں اُن کا نہ قرض رہ جائے
ہمیں اتارلیں سینے میں زہرِ دشتِ سکوت

(1964-1965)

# شجرِ ممنوع

بہت روز پہلے یہ فرما گئے شیخ سعدی
کہ جب شہر میں قحط آیا تو یارانِ عشق آشنا عشق کو بھول بیٹھے
کہ ہے قحط ہی عاشقوں کا رقیب اوّل آخر

ہمارے زمانے میں کچھ ایسا وقت آپڑا ہے
(کہ قحطِ رجال آگیا ہے)
جو گنتی کے مردانِ عشق آشنا رہ گئے ہیں
انھیں عشق کرنے کی فرصت کبھی بھی میسر نہ آئی
کہ اُگتی ہیں ہر سال زرخیز فصلیں
مہکتے ہیں ہر فصل میں گندم و جَو کے خوشے
زرِ زندگی سے چھلکتے ہیں ہر رُت میں کھیتوں کے دامن
مگر شہر میں قحط سالی پڑی ہے
وہ زرخیز فصلیں نہ جانے کہاں کاٹی جاتی ہیں،
کن کے نہاں خانوں میں دفن ہو جاتی ہیں

کہ گندم کے پودے تہی جیب ہو کر بگولوں کے آنچل میں مُنہ ڈھانپتے ہیں
زرِ زندگی سے بھرے کھیت دامن میں مٹی اٹھائے نئے بادلوں کی دعا مانگتے ہیں
زمینوں کے شاداب قطعے پڑے ہانپتے ہیں
کِسان حاصلِ فصلِ آئندہ کے خوف سے کانپتے ہیں
وہ مردانِ عشق آشنا جن کی بے باک جرأت کے رستے میں
نجم و قمر اور خورشید گردِ پسِ قافلہ ہیں
پڑے خاک پر اپنے قدموں سے لپٹی ہوئی گرد رہ چاٹتے ہیں
خلا پیٹ کا پاٹتے ہیں
کہ ہر لحہ نان و نمک مانگتا ہے

خوشا وہ زمانہ کہ فطرت تھی جب مہرباں عاشقوں پر
کبھی قحط سالی میں جب بھول جاتے جوانانِ عشق آشنا اپنا منصب
تو فطرت انھیں آنے والی بہاروں، نئے موسموں میں نئی زندگانی کا مژدہ سُناتی
مگر آج فطرت ہماری مشیت کے ہے زیرِ فرماں
ہماری مشیت کا دل اس قدر نرم و نازک نہیں ہے
جو عشقِ طرب پیشہ پر رحم کھائے
جو اک فصل لوٹے تو آئندہ فصلوں کو سب میں لٹائے
ہماری مشیت کا فرمان ہے یہ
''ذخیرہ ہوس کا سمٹنے نہ پائے
نہاں خانۂ جرم و عصیاں ہر اک فصل کے ساتھ ہی بڑھتا جائے
جہاں عشق نے زندگانی کا گھونگھٹ ہٹا کر کوئی گیت چھیڑا
وہیں اُس کو اندیشۂ قحط کے تازیانے لگاؤ
وہ ساری زمینیں، ہی بنجر بنادو جہاں زندگی کی نئی کونپلیں پھوٹنے جا رہی ہیں

وہ بنجر زمیں جہاں چھپ کے نجوگ ہوتا ہے مرگ و ہوس کا
اُنھیں سارے سرسبز و شاداب کھیتوں کو اپنے ہوسناک دامن مں
بھر کر زمیں پر حکومت کا فرمان دے دو"

تو کیا یہ ہمیں ہیں
جنھوں نے کہا عشق سے
"شاخِ گندم نہ چھونا"
تو کیا یہ ہمیں ہیں، جنھوں نے بتایا ہے آئین
کہ پھل زندگی کا جو چکھے گنہگار ہے وہ

(1965)

# جُھوٹی سچائی

چند آوارہ چرواہوں کو رات کے آسماں پر دکھائی دیا
نور کا ایک مولودِ نو، اک ستارا نیا
ایک آواز نے بادلوں کی گرج، بجلیوں کی چمک میں کہا
اور صدیوں کی بیمار روحوں میں خوابیدہ امید نے یہ سنا
روح کے گھاؤ بھرنے کا وقت آ گیا
حرص کا پیرہن پھینک کر جسم قعرِ مذلت سے اُٹھنے لگے
قبرِ افلاس و نکبت میں مردے بھی کروٹ بدلنے لگے
رات کے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے جسم کو جاں ملی
منتشر ریوڑوں کے لیے گلہ باں آ گیا

آج کی رات صدیوں کی ظلمت میں لپٹی ہوئی وہ صدا پھر اٹھی
رات کے آسماں پر ستارا ذرا دیر کو پھر ہنسا
اور پھر رات کے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے خانہ بدوش چرواہوں نے یہ سُنا

منتشر ریوڑوں سے کہو امن کی سانس لیں
خوف کو اپنی آنکھوں سے رخصت کریں
آج کی رات موعودہ اُمید کی رات ہے
گلّہ بانوں کسانوں کے گھر عید کی رات ہے
مائیں بچّوں کو گودی میں اپنی سنبھالے ہوئے
اس مقدس کنواری کے آگے جھکیں
کوکھ جس کی ہے تخلیق کے کرب کی رازداں
اور کنواری کی تصویرِ ممتا کے انوار میں ڈوب کر مسکرانے لگی
روحِ معصومیت کی جبیں نورِ فردا کی تقدیس سے جگمگانے لگی

رات کے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے گلّہ بانوں کی آنکھوں نے دھوکا دیا
راکٹوں اور بمبار طیاروں کی گھڑگھڑاہٹ نے ایمان کو ڈس لیا
گن کے منہ سے ابلتی ہوئی آگ نے جسم کیا، روح کو بھی بھسم کر دیا
تازہ فصلوں نے فوجوں کے جوتوں تلے دب کے فریاد کی
اجڑی کٹیاؤں نے شعلۂ مرگ کے رقص سے بزم آباد کی
ساری آبادیاں جل گئیں
ساری آزادیاں لٹ گئیں
بیس صدیوں سے زندہ صداقت کے الفاظ کی آبرو لٹ گئی

گلّہ بانوں، کسانوں سے کوئی کہے
وہ صدا جس کی سچّائی پر تم کو ایمان تھا
جھوٹ کے گندے ہونٹوں پہ مصلوب ہے

(1965)

# دیوار

تم نے ہم نے مل کر اس دیوار کی بنیادیں ڈالی تھیں
اپنے خوں، اپنے بوڑھوں اپنے بچوں کے خوں سے اس پر گل کاری کی
اپنے گھر، اپنے اسباب، اپنے اقدار میں آگ لگا کر
اس دیوار کی اینٹوں کو فولاد کیا
یہ دیوار جسے ہم نے تم نے بے جان سمجھ رکھا تھا
روز بروز اونچی ہوتی جاتی ہے
اور نئی دیواریں
اس کی کوکھ سے پھوٹ رہی ہیں
یہ دیواریں پھن پھیلائے سرا کڑائے راہ کو روکے بیٹھی ہیں
ہم تم ان کے داتا تھے لیکن اب ہیں ان کے گزیدہ
ہم تم اپنی بین لیے نفرت کے نغمے چھیڑ رہے ہیں
دیواریں پھن پھیلائے، آنکھوں میں نفرت کی جوالا،
سانسوں میں موت کا زہر لیے

آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہم کو دیکھ رہی ہیں
ایک طرف تم کھڑے ہو تنہا
دوسری جانب، ہم تنہا ہیں
ہم تم دیواروں کی آنکھوں کے ہیں صیدِ سحر زدہ
بھاگیں تو دیواریں پیچھے پیچھے ڈسنے آتی ہیں

ہم تم اپنی دیواروں کے قیدی ہیں
ہم میں تم میں کچھ ایسے دیوانے ہیں
جو نوکِ زباں سے
دیواروں کو چاٹ رہے ہیں
اور سمجھتے ہیں دیواریں گر جائیں گی
دیواریں اُن پر ہنستی ہیں
اُن کی زباں سے دیواروں پر جمے ہوئے خوں کا ہر قطرہ
مانگ رہا ہے اور لہو ۔۔۔ اور لہو
یا وہ دب کر پس جاتے ہیں
دیواریں قبروں کے فشار کا منظر دکھلا دیتی ہیں
یا پھر اُن کی زبانیں خوں کے تلخ کسیلے ذائقے کی عادی ہو کر
سو جاتی ہیں

اور زمیں یہ پوچھ رہی ہے
کیا یہ وہی انسان ہیں جن کو میں نے ایک ہی مٹی،
ایک ہی سورج کی کرنوں کا دودھ پلایا
جن کو میں نے ایک سے موسم، ایک سی فطرت،

ایک ہی سے انداز دیے
جن سے میں نے کہا تھا سورج، چاند، ستارے
تیری راہ کے ذرّے ہیں

کیا یہ وہی انسان ہیں
جن کے قد سے جن کے بزرگوں، جن کی تہذیبوں کے
قد سے دیواریں اونچی ہیں

آج انسان بہت چھوٹا ہے
اس کے قد سے دیواروں کا قد اونچا ہے

(18 نومبر 1965)

# رات کا مکان

ایک آسیب صدیوں سے منڈلا رہا ہے یہاں
یہ مکاں
مردہ روحوں سے آباد ہے
سر بہ سجدہ عقیدت یہاں سر اُٹھاتی نہیں
مردہ روحوں سے آنکھیں ملاتی نہیں
اور پرچھائیاں
رات بھر چیختی، روتی، چلاتی، لڑتی جھگڑتی پھرا کرتی ہیں ہر طرف

ایک پرچھائیں کے ہاتھ میں بان ہے اور ترشول ہے
اُس کی گردن میں لپٹے ہوئے پیچ در پیچ ناگ اپنی آنکھوں کے
ہیروں کا تاج اُس کے سر پر اُٹھائے ہوئے خندہ زن
اُس کی خونی زباں منہ سے لٹکی ہوئی
اُس کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ان گنت سر بدن سے جدا

اُس کے قدموں میں لاشوں کے انبار ہیں
اور بے جان بے گوشت ڈھانچے عقیدت سے ہیں سرنگوں
ایک پرچھائیں پہنے ہوئے تیاگ کا گیروا پیرہن
اپنے ہاتھوں میں کاسہ لیے
مُردہ ڈھانچوں کا پس خوردہ چنتی ہوئی گھومتی ہے یہاں
اور پھر ہر طرف سے جھپٹتی ہیں پرچھائیاں
مردہ ڈھانچوں کا خوں چوسنے کے لیے

روز ہوتا ہے شب خوں یہاں
یہ مکاں
مردہ رُوحوں سے آباد ہے

ایک پرچھائیں مصلوب ہے
اُس کے ہاتھوں میں، پیروں میں کیلیں ٹھکی
روز اُترتی ہے کمزور امید کی سیڑھیاں
یہ مکاں آسماں کی طرف اُس کی پرواز میں آج حائل نہ ہو
روز کتنی ہی پرچھائیاں اُس کے کاندھوں پہ اپنی
صلیبوں سے کرتی ہیں وار
ہر صلیب اُس کو اپنی نجات، اپنا سرمایۂ عاقبت جان کر
چاہتی ہے اُسی کا وہ زیور بنے

ایک پرچھائیں محراب کی تیغ ابرو نما میں جھکاتی ہے سر
اُس کے سر پر چمکتا ہے رقاں زدہ ریگ زاروں کے طوفان میں
خون روتا ہلال

اور چاروں طرف سے جھپٹتے ہیں مینار و گنبد اُسے پینے کے لیے
روز ہی جنگ ہوتی ہے پرچھائیوں میں یہاں
روز ہی قتل ہوتی ہیں پرچھائیاں
یہ مکاں مُردہ رُوحوں سے آباد ہے
اور یہاں رات ہے
جھاڑ، فانوس، شمعیں، دیے
سب اُگلتے ہیں اپنی لووں سے اندھیرا یہاں
اک امر رات ہے، اک اٹل رات ہے
صبح آتی ہے، لیکن یہاں اس مکاں میں نہیں
دھوپ، تازہ ہوا، روشنی اس مکاں کا مقدر نہیں
یہ مکاں رات کی اِک کمیں گاہ ہے

آسماں پر ہے تنہا خُدا
اور زمینوں پہ ہے آدمی آدمی سے جُدا
راج کرتی ہیں چاروں طرف مُردہ پرچھائیاں

(18 نومبر 1965)

# دیمک

کرم خوردہ کاغذوں کے ڈھیر میں مدفون ہے
چاٹتا ہے حرف حرف
دائرے، قوسین، سن، تاریخ، اعداد و شمار
نقطہ، زیر و زبر، تشدید و مد
حاصلِ بینائی و ذوقِ نظر
باندھتا ہے وہم و تخمین و گماں کے کچھ حصار
پونچھتا ہے وقت کا گرد و غبار
چومتا ہے کتبۂ لوحِ مزار
چند نقطے اڑ گئے ہیں، لفظ کچھ کاواک ہیں
اس کی نظروں میں خزینہ علم کا خار و خس و خاشاک ہیں

کیا علائم، کیا رموز، اشکال، الفاظ و حروف
آتشِ تخمیر کے ہاتھوں پگھل جاتے ہیں سب

وقت کی بھٹی میں تپ کر اک نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں سب
لمحہ لمحہ منکشف ہوتا ہوا اسرارِ حیات
منجمد الفاظ کے سینے میں اپنا نور پھیلاتا نہیں
کرم خوردہ کاغذوں کی لاش میں
خوں اپنا دوڑاتا نہیں
کرمِ کاغذ ہے حریفِ روز و شب
چاٹتا ہے فضلۂ علم و ادب
اور سر اکڑائے خلا قانِ معنی کی طرف خندہ بہ لب

(24 دسمبر 1965)

# معراج

نیند آنکھوں سے لگی بیٹھی ہے
نیم خوابیدہ نگاہوں نے سجا رکھے ہیں احساس کے آئینوں میں ان گنت اوراق
ساری تصویریں ہیں دھندلائی ہوئی
مَطلعِ ذہن پہ چھایا ہے دھندلکے کا سماں
خوابِ نادیدہ و دیدہ ہیں بہم رقص کناں

نیند کے در پہ ہوئی دستک سی
کس نے زنجیرِ خیالات کو جنبش دی ہے
جگمگانے لگے احساس کے آئینوں میں رنگیں اوراق
بول اُٹھیں جاگتی سوتی ہوئی تصویریں بھی
مطلعِ ذہن سے پھوٹی شفقِ نور آثار
خوابِ نادیدہ نے آنکھوں سے ہٹادی چلمن
ماضی و حال نے آئندہ زمانوں کی حدوں میں جھانکا

پاؤں کی چاپ سے گونج اٹھا سراپردۂ خواب
کھنچ گئیں پچھلی فضاؤں کی، خلاؤں کی طنابیں اک بار
چشمِ سیارہ و ثوابت سے لڑی ارض کی چشمِ بیدار
رقصِ افلاک بھی اب دسترسِ شوق میں ہے
خواب ہی خواب ہیں ہر سو رقصاں

جل گئے شہپرِ جبریل کہیں سدرہ پر
اب ہے خود شوقِ سفر جادہ طراز و رہبر

کب کا تکمیل کو پہونچا سفرِ ہفت افلاک
پھر بھی زنجیرِ تخیل میں ہے جنبش اب تک
اس سے آگے بھی ہیں شاید کئی نادیدہ جہاں منتظرِ چشمِ بشر

(1966)

# یہی تو ہوگا

غضب ہے روشنیِ طبع کی سیہ بختی!
ملا ہے دل کی شرافت کا دردِ تنہائی
ستم ہے فقر کی غیرت کا کربِ محرومی
جو ہاتھ بخششِ لطف و کرم کی عادت سے
تہی ہوئے ہیں، کوئی کاٹ لے تو ہو احساں
جو دل زمانے کی خاطر دھڑکتے رہنے سے
شکستگی کی صدا ہے، ہوا ہے بارِ گراں
جو سر بلند رہا چوکھٹوں کی پستی سے
ہجومِ سنگ میں، اچھا ہے، ٹوٹ ہی جائے
جو روشنی کا ہے مصدر، وہ سینۂ صد چاک
جو ایک بار ہی ہوجائے شق تو صبر آئے

جو ایک نجمِ جہاں تاب ٹوٹ جائے تو کیا
جو ایک گوہرِ نایاب پھوٹ جائے تو کیا

یہی تو ہوگا اندھیرے منائیں گے اِک جشن
وہ چہرے جن پہ حروفِ جلی میں لکھے ہیں
حماقتوں کے فرامین، ہوں گے صدر نشیں
وہ آنکھیں جن میں سیاہی گھلی ہے دوزخ کی
سجا کے عدل کی میزان، اندھیرے اُگلیں گی
وہ ہونٹ جن پہ جہالت چہکتی رہتی ہے
ترانے چھیڑیں گے اس جشنِ بد مذاقی میں
وہ کان جن پہ گراں ہے صدائے اہلِ درد
طرب کے بے حس و بے روح گیت نگلیں گے
وہ سینے جن میں ہے دل کی جگہ پہ سنگِ سیاہ
ہوس کے تمغوں کی دکاں سجا کے نکلیں گے
وہ سر جو جھکتے ہیں ہر آستانِ دولت پر
بصد غرور سنیں گے قصیدۂ ذلّت
تعصبات کے شعلے دھواں اڑائیں گے
توہمات کی لو ظلمتوں میں ناچے گی
جہالتوں کے دیے نفرتوں کو پوجیں گے
ہوس کے سینے میں بیٹھا ہوا ستم کا ناگ
تمام نور کی نہروں کا دودھ پی لے گا
قدامتوں کی سیاہی سے بیج پھوٹیں گے
خباثتوں کے قلم داستان لکھیں گے
کسی کا ہاتھ نہ تھامے گی بڑھ کے سچائی
زباں کسی کی نہ پکڑے گا حرفِ حق بڑھ کر
خباثتوں پہ کوئی روشنی نہ ڈالے گا

جو ایک روشنیِ طبع بجھ گئی تو کیا
جو ایک دل کی شرافت کو موت آئی تو کیا
جو ایک فقر کی غیرت ہوئی شہید تو کیا
یہی تو ہوگا کہ جو آج تک ہوا ہے، وہی
ہوا کرے گا، مگر کوئی لب نہ کھولے گا
نہ آنکھ روئے گی کوئی، نہ درد بولے گا

(13 فروری 1966ء)

# ایک شام

## دو نظمیں

(1)

شام کا راستہ
کتنا پُر ہول، چُپ چاپ، ویران ہے
ایک بے نام اُداسی کی خاموش فریاد کا شور ہے
غیر محسوس سرکش ہواؤں کے طوفان کا زور ہے
ایسا انجان موسم کہ سرما کی یخ بستگی ہے نہ گرما کی لو دھوپ ہے
پھر بھی رستے کی آغوش میں برف ہی برف ہے
اور لو خاک اڑاتی ہوئی ہر طرف نوحہ خواں

اک دھندلکا ہے
جو تیرگی بھی نہیں، روشنی بھی نہیں
ایک سناٹا ہے جو صدا بھی نہیں خامشی بھی نہیں

دن کا ہنگامہ زا کارزارِ حیات
رات کی گود کا خوابِ آسودگی
شام کی خالی جھولی میں کچھ بھی نہیں

چھپ چکا دن کا سورج کہیں گوشۂ غرب میں
آسماں دور تک نورِ مہتاب کی آمد آمد سے مایوس ہے
کالی خم دار سڑکوں پہ دن کا جنازہ اٹھائے ہوئے اِک ہجوم
اپنے قدموں کی آواز کے نیچے کچلا ہوا
اپنی ہی سست پائی کی زنجیر میں قید ہے
دھول اُڑاتی ہوئی موٹریں ایک آسیب کے خوف سے بھاگتی
کالج، اسکول دفتر کے دامن تہی
چمنیاں کارخانوں کی، کالا دُھواں
شام اعمال نامہ لیے
فائدے اور نقصان کو جوڑتا اور گھٹاتا ہوا ایک دیوالیہ
کل جو تھا، آج وہ بھی نہیں
کل جو ملنا ہے، وہ بھی ہے کھاتوں کے انبار میں گم شدہ

(2)

شام کا راستہ
پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتا ہوا
بند دروازوں اور کھڑکیوں سے گزرتا ہوا
گھر میں در آیا ہے
میرے سینے پہ ہے خیمہ زن

میرے معصوم بچّوں کی غم ناشناسا ہنسی
زندگی بخش کلکاریاں
گل صفت ننھے ننھے سے قدموں کی نرم آہٹیں
ٹوٹے پھوٹے ادھورے سے تتلاتے الفاظ کی کیف آور زباں
تین پہیوں کی اک سائیکل
پنسلیں، خالی ڈبے، برش، کانچ کی گولیاں
کچھ کھلونے جو ہیں ٹوٹ کر بھی مگن
اس گراں مایہ سرمایے کی رازداں باسکٹ
دودھ کی شیشی بسکٹ کے ڈبوں کے ڈھیر
ایک جھولا مہینوں سے ٹھیرا ہوا

شام کے راستے کی طوالت میں گم
شام کی انگلیاں اپنے بے کیف پوروں سے چھوتی ہیں ہر چیز کو
چیخ اٹھتی ہیں تنہائیاں
آج تم بھی بہت دور ہو جانِ جاں
فاصلے شام کا راستہ بن گئے
ہجر کی دوریاں اس دھندلکے میں لپٹی ہوئی
تم کو آواز دیتی ہیں، تم ہو کہاں

شام چُپ چاپ ہے
اُس کے آنگن میں آواز کی نغمگی گھول دو

شام بے نور ہے
اس کی آنکھوں میں اپنے خط و خال کی شمعیں روشن کرو
شام کا راستہ

میرے ویران گھر سے جدائی کے سنسان صحرا میں ہوتا ہوا
دستکیں دے رہا ہے تمھاری محبت کے در پر کھڑا
شام کو
اپنی صبحوں کی بیداری جاں فزا
اپنے مصروف دن کی تھکن
اپنی راتوں کی آسودہ نیندوں تک آنے نہ دو
شام بے درد، بے حس، ستم گار ہے
کورو کر، گُنگ ہے
شام کے دل میں اپنی محبت کا نشتر اُتار دو
کہ اب یا تو مہتاب شمعِ جدائی کا آنسو بنے
یا سحر آئے بچوں کی روشن نگاہوں، چہکتی صداؤں میں ہنستی ہوئی

(30 جنوری 1967)

# نقطوں کا سفر

جبر نے ہم کو نکالا ہے، تراشا ہے عدم کے دل سے
زندگی جبرِ مسلسل ہے
عدم نقطۂ آغاز بھی ہے
نقطۂ انجام بھی ہے
اور ہم کھنچتے چلے جاتے ہیں اک نقطے سے
دوسرے نقطے کی جانب
کہ جہاں جبر عدم سے مل کر
ایک بھولا ہوا افسانہ بنے

ہم وہ نقطہ ہیں جو آوارہ رہا روشنیِ زیست کی کرنوں کی گزرگاہوں پر
روشنی کچھ بھی دکھاتی نہیں مانگے کے اُجالے کے سوا
راہ میں ملتے ہیں بکھرے ہوئے ٹھٹھرے ہوئے جامد نقطے
اپنی رفتار کی زنجیر میں قید

کاٹھ کے آدمی، دل پتھر کے
کرسیاں بیٹھی ہیں میزوں کا بچھائے ہوئے جال
کاونٹر راہ میں اِستادہ ہیں
بند دروازوں کی تھامے ہوئے ڈھال
سرخ فیتوں میں بندھی فائلیں سینے میں دبائے ہوئے
فریادو شکایات کا سیل
حرف والفاظ ہیں نقطوں کا اُلجھتا ہوا جال
نور چہروں پہ نہ تحریروں میں
نقطہ در نقطہ سرکتی ہوئی ظلمات سے دنیا ہے نڈھال

سڑکیں نقطوں کو بھگاتی ہوئی لے جاتی ہیں
در بہ در، شہر بہ شہر
خاک کے ذرّوں پہ تہمت ہے سفر
برف کے تو دوں میں دب جاتے ہیں
دھوپ کی آگ میں جل اُٹھتے ہیں
باد و باراں میں پھرا کرتے ہیں آوارۂ و خوار
ان کی منزل نہ مقام
ان کی تقدیر ہے بے سمت ہواؤں کا خرام
تند طوفانوں کے ہاتھوں میں ہے سمتوں کی لگام

ریل کی پٹریاں، پگڈنڈیاں، دشت و دریا
ہو نکتے، گونجتے شہروں کی بڑی شہ راہیں
بے عناں بھاگتے ذرّوں کی گزرگاہ بھی ہیں، مقتل بھی

راہیں انسانوں کو پامال کیا کرتی ہیں
راہیں ذرّوں کو نگل جاتی ہیں
کُرسیاں فائلیں، میزیں، فیتے
شور و فریاد و شکایات کا سیل
حاکمِ شہر ہو یا فریادی
سب کی تقدیر ہے پامالیِ راہ
جبر زائیدہ ہے یہ بھی، وہ بھی
یہ بھی پابندِ عدم، وہ بھی عدم کا ہے غلام

کیا خبر کون سی منزل پہ یہ کھنچتے ہوئے نقطے پھٹ جائیں
اور رفتار کی زنجیر کٹے
جبر کی راہ بھسم ہو جائے
کیا خبر تیرگیِ جبر و عدم کی دل سے
روشنی اتنی نکل آئے کہ ظلمت مر جائے
اور پھر کچھ نہ رہے

(فروری 1967)

# شب کا رزمیہ

ایک غول بیاباں ہے جو شہر میں
ہر طرف سے چلا آ رہا ہے اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا
اپنے ہاتھوں میں نیزے لیے
اپنے دامن میں پتھر بھرے
اپنے سینے کے تاریک غاروں کی پُر ہول گہرائی میں
جرم کی گود میں پلنے والے قوانین کے اسلحوں کا ذخیرہ چھپائے ہوئے
اپنے گندے عفونت زدہ تنگ و تیرہ ضمیروں کی جھوٹی صداؤں کے چابک لیے
اپنے چہروں پہ بے حس فرشتوں کی نیکی کا غازہ لگائے ہوئے
سود، رشوت، ڈکیتی، زنا
قرق ہوتی ہوئی کھیتیوں اور مکانوں کی دولت چرائے ہوئے
اونچے محلوں کی نیچی کمیں گاہ میں بیٹھ کر
شہر کے راستوں کے ہر اک موڑ پر
دیکھتا ہے کہ شاید خیالوں کی دنیا کا بھٹکا ہوا کوئی
آوارۂ شہرِ خواب اجنبی

ان کے ہاتھوں، ضمیروں، خزانوں کی زد میں جو آ جائے تو
ان کے نیزوں کی نوکوں کو خوں مل سکے
پتھروں کو مہکتے ہوئے زخم کے گُل ملیں
اور گندے ضمیروں کی نیکی کو رسوائی اہلِ دل سے تسلّی ملے
دوسرے روز یرقاں زدہ زرد چتھڑوں کے چہرے سیاہی مَلے
کو بہ کو، راہ در راہ ہنستے پھریں
اور غولِ بیاباں کمیں گاہ میں بیٹھ کر قہقہوں کی لووں سے
دھواں اور اندھیرا اُگلتا رہے

ایک وارفتگی، تشنگی
بے خودی کی حدوں سے اُدھر
اپنا گھر بھول کر
آئی اس موڑ پر
جس جگہ زخم ہی زخم تھے
نیکیاں بے حسی اور گناہوں کی چادر میں لپٹی ہوئی
اس تماشے کی اندھی تماشائی تھیں
گونگے بہرے ضمیروں کا اک جمگھٹا
خون کے چھینٹے دامن میں اپنے چھپاتا رہا
ایک آواز گھر گھر کے دروازے پر دستکیں دے کے چپ ہو گئی
اور نیندوں کی سیجوں پہ سوئی ہوئی بے حسی اور بھی گہری
نیندوں میں گم ہو گئی
دوسرے روز غولِ بیاباں نے چہروں پہ نیکی کا غازہ مَلا
جھوٹی عصمت کا باندھا حصار

اور اوڑھا نقاب ریا
پھر صحائف کے لفظوں سے معنی الگ کر کے
لفظوں کو اپنے سیاہ کار اندھے ضمیروں کی آواز سے باندھ کر
لب بہ لب اور زباں در زباں
جھوٹ کی خوب تشہیر کی
اور صحائف کے الفاظ اپنے معانی سے کٹ کر زبانوں کی سولی پہ
لاشوں کی صورت لٹکتے رہے

سرفرازوں کے نام
نیزۂ شمر و خولی پہ رسوا ہوئے

رات کا جھوٹ دن کو بھی تاریک رکھتا ہے کیوں؟
خون تو چپ ہے
زخموں نے لب سی لیے
لیکن اس رات کی داستاں کل کو لکھے گا کون؟
گونگے بہرے ضمیروں کی اندھی نگاہوں میں
اس روشنی کو اٹھا لے گا کون؟

(4 فروری 1967)

# راکھ کا گھر

تنہائی کے صحرا میں کل آگ لگی ایسی
نیندوں کے دیاروں تک شعلوں کی زباں پہنچی

جب آنکھ کھلی دیکھا گھر آگ میں بھڑکتا ہے
شعلوں کی زبانوں سے دیواریں چٹختی ہیں
دروازے پگھلتے ہیں
تصویروں کے پیراہن لو دیتے ہیں سرتاپا
خط دردِ رفاقت کی شدت سے تڑپتے ہیں
خبروں کی حرارت سے اخبار و رسائل کے اوراق دہکتے ہیں
بک شیلف کتابوں کی خاموش تمازت سے جل جل کے تڑختے ہیں
ہر تار ہے بستر کا شمشیرِ سم آلودہ
تکیہ ہے کہ اک رقصاں آتش کا بگولا ہے

تنہائی کہ اک کوہِ آتش بہ دہن بن کر
چپ چاپ تھی برسوں سے
پھوٹی ہے تو لاوے کی حدت نے جلا ڈالا
ہر چیز بھسم کر دی
جلتے ہوئے خوابوں نے مجروح حقیقت سے یوں آنکھ ملائی ہے
سوئے تھے جو آنکھوں میں، وہ شعلے بھڑک اٹھے

کون آگ بجھا سکتا
تنہائی کے صحرا سے ہر شخص گریزاں تھا
سب اپنے ہی دامن کو شعلوں سے بچاتے تھے
سب اپنے ہی خوابوں کو آنکھوں میں چھپاتے تھے
ہم خود ہی جلے تنہا
اوروں کا تو کیا شکوہ
اُس کو بھی نہ ہو پائی تنہائی کے جلنے کی، لٹنے کی خبر اب تک
ہم کعبۂ تنہائی کا جس کو خدا سمجھے

اب راکھ میں بیٹھے ہیں مجروح، شکستہ دل
دل سوختہ، غم خوردہ
کیا جانے کریدیں گے اس راکھ کو ہم کب تک
تنہائی کے ملبے میں، ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں لاش اپنی کئی دن سے
اس راکھ سے ہاتھ آیا ہے ایک سوال اب تک
وہ لاش جو مل جائے
آنکھ اُس سے ملانے کو دل لائیں کہاں سے ہم؟!

(13 فروری 1967)

# لفظوں کی پوجا

آسماں کا گوشہ گوشہ چھان ڈالو
یہ خلا بے سمت، بے آواز ہے
چاند سورج، زہرہ و مریخ کی آنکھوں کے معنی پڑھنے والو
اپنے سینوں کے خلا میں
اُن معانی کو ٹٹولو
جن کو آوازوں کے بے معنی سمندر کھا گئے ہیں

تم نے جب سے آنکھ کھولی
ہوش نے جب سے سماعت تم کو بخشی
تم نے آوازوں کو دامانِ سماعت میں سمیٹا
اور لفظوں کو نہ تولا
اُن کی پرتوں کو نہ کھولا
ساری آوازوں کے سینے میں خلا ہے

## اس خلا کو کب ٹٹولا

خوابِ فردا دیکھنے والوں کی آنکھوں میں سنہری کھوکھلی تعبیر کا گرد و غبار
مملکت کے مقتدر ارکان کے جھوٹے دعاوی کا حصار
کرسیوں پر لفظ کے دھاگے سے لپٹے کاٹھ کے پتلوں کے
احکام و اوامر کا طلسم
مندروں کے کیرتن سے مسجدوں کے وعظ تک
مکتبوں کے بوریوں سے جامعاتی کانووکیشن کے رنگیں ہال تک
اک خلا ہے
اس خلا میں گونجتی ہیں اَن گنت آواز کی لہریں
یہ لہریں
معنی و مطلب کے ناموجود ساحل کی طلب میں سر پٹکتی
گنبدِ بے در سے ٹکرا کر خود اپنے تک پلٹتی
دوسری لہروں سے بے مقصد الجھتی اور لڑتی
ہر طرف آواز کی لہریں
یہ لہریں ہی ہماری زندگی ہیں
اب یہ لہریں چاند سورج، زہرہ و مریخ کی جانب بڑھی ہیں
اپنی آوازوں کے سناٹے سے بھر دیں گی خلائے آسماں

آسمانوں کا خلا پہلے بھی غیر آباد تھا
اب بھی تہی
نغمۂ افلاک بھی فکرِ زمیں کی بازگشت
ہے ضمیرِ ارض چُپ تو نغمۂ افلاک سے رشتہ نہیں

اِک خلا ہے حکمراں
از کراں تا بے کراں
اب نہ جبریل و پیمبر ہیں نہ الفاظ و کتاب

کالے بازاروں میں سارے ہی صحائف، سب کتابیں
بِک گئیں ردّی کے بھاؤ
فلسفے از کار رفتہ
مذہبوں کی روح ہے آسیب خوردہ
اور سائنسی نظر اس وقت تک کم بین و کم آگاہ ہے
ڈھیر ہیں الفاظ کے، تابوت ہیں آواز کے
بولتی ہیں کرسیاں اور آدمی چپ چاپ ہیں
منبروں پر لفظ ہے زر کی قبا پہنے ہوئے
پستیوں میں چیتھڑے پہنے معانی سر بہ زانو، بے وقار

میرے تخئیل و تصور سے تمھارے ذہن تک
اک خلا حائل ہے لفظوں کی قبا پہنے ہوئے
میرے لب سے جو نکلتا ہے
خلا میں دوڑتے لفظوں سے ٹکرا کر اُلجھ جاتا ہے
رستے ہی میں گر جاتا ہے
تم اُس تک پہنچ سکتے نہیں
میں ہٹاؤں لاکھ اپنے راستے سے بے ضرورت چیختے
لفظوں کے ڈھیر
پھر بھی معنی سے چمٹ جاتے ہیں زائد لفظ جونکوں کی طرح

تم کہ لفظوں ہی کے عادی
بے ضرورت لفظ چُن لیتے ہو معنی پھینک کر
اور پھر اُن کو سجا دیتے ہو طاق و منبر و محراب میں
لفظ کی پوجا میں معنی بھینٹ چڑھتے ہیں سدا

میں نہیں کہتا کہ بے معنی ہے دنیا، زندگی ہے بے حقیقت
اور تسخیرِ خلا بے فیض ہے
تم نے دنیا، زندگانی، آسماں سے چھین رکھے ہیں جو معنی
ڈھونڈ لو
آسماں کا گوشہ گوشہ مانگ بھر دے گا زمیں کی نور سے
اور زمیں کی گود بامقصد معانی خیز لفظوں سے ہری ہو جائے گی

(14 فروری 1967)

# زبان کی موت

ہزاروں اصوات نوحہ خواں ہیں کہ اک زباں پر ہے نزع طاری
حروف و الفاظ سر بہ زانو
خموش ہے اک جہانِ معنی
کہ اس کے باسی
تلاشِ گندم میں اپنے شہروں کی فاقہ کش عافیت کو تج کر
نئے جہانوں کے اجنبی راستوں پہ آنکھوں میں پیاس لے کر
بھٹک رہے ہیں
نیان کی روشنی میں لکھی نئی زبانیں چمک رہی ہیں
جلا وطن لفظ اور معانی کو شور کرتی وسیع سڑکیں نگل رہی ہیں

خموش ہے اک جہانِ معنی
کہ اُس کے باسی
نئی زبانوں کے شور و غل سے وطن میں بھی اجنبی ہوئے ہیں
وہ اپنے شہرِ زباں میں بھی بے زباں ہوئے ہیں

جو بات کرتے تھے، اب وہ شہر و دیار و دیوار و در ہیں ساکت
جو محرمِ مدعا تھے وہ دشت و کوہ و صحرا سدا کے گونگے بنے ہوئے ہیں
جو حرف کی آگ سے پگھلتے تھے وہ شجر اور حجر ہیں ساکت

پُرانی آبادیوں کے رستے شکستہ کھنڈروں میں کھو گئے ہیں
وہ محل و ایوان و طاق و گنبد جہاں سے اصوات کا سمندر اُبل رہا تھا
اُجڑ چکے ہیں
وہ شاہراہیں وہ تنگ گلیاں، وہ سیڑھیاں، چوکھٹیں، دریچے
حرم سرائیں، غلام گردش، وسیع دالان، ہنستے آنگن
گھروں کے کونے، لبوں کے گوشے
جو لفظ کو دے رہے تھے معنی
جو صوت کو دے رہے تھے نغمہ
خموش ویرانیوں کے مرقد میں اپنی دنیا کو دفن کر کے
سکوت کی چشمِ حسرت آگیں سے اپنی میّت پہ رو رہے ہیں

ہزاروں اصوات نوحہ خواں ہیں کہ اُن کا پُرساں نہیں ہے کوئی
ہزاروں الفاظ کھو کھلے ہیں کہ اُن کے معنی تلاشِ نانِ جویں میں
اپنا لباس بدلے بھٹک رہے ہیں
زباں سے ہے شکم کا رشتہ
ہیں لفظ کشکولِ نان و گندم
نئی زبانوں کے لفظ جہدِ معاش میں بے زبان لفظوں کو روندتے ہیں
نئی زبانوں کی سلطنت میں کسے پڑی ہے
جو اپنے لفظوں کو چھوڑ کر دوسروں کے لفظوں کو دے معانی

کیسے پڑی ہے جو فاقہ کش اور برہنہ معنی کو لفظ کے پیرہن سے ڈھانپے
ہمارے الفاظ مر رہے ہیں، ہم اپنی سانسوں کو گن رہے ہیں

ہمارے بعد آنے والی نسلیں
ہمارے الفاظ اور معانی کی قبر کو دیکھ کر
(اک نئی زباں کے انوکھے لفظوں میں)
یہ کہیں گی
کہ آج سے چند سال پہلے یہ لفظ و معنی بھی بولتے تھے
صلیبِ جمہوریت پہ لفظوں کو موت آئی
کہیں کتابوں کے مقبروں میں ابھی تلک بے صدا معانی
سسک رہے ہیں

(19 جون 1967)

# معانی کی تلاش

ہمارے پاس اور کیا ہے
زیست کو سنوارنے کا بے قرار حوصلہ
حیات و کائنات کو نئے معانی بخشنے کی جستجو
طلب کے جام میں فگار مقصدوں کا کچھ لہو
شکستِ خواب میں بھی خواب دیکھنے کی آرزو
نظر کی آگ لاکھ بجھنے پر بھی آفتاب خوٗ، زمین و آسمان جوٗ

ہمارے پاس اور کیا ہے
خود سے اور اپنے خواب دیکھنے کے حوصلے سے عمر بھر نباہنے کا ولولہ
ہمیں دیا ہی کیا ہے زندگی نے
زخم کھانے، مرنے، اور مر کے زندہ رہنے کے سوا
مگر یہ ہم بھی جانتے ہیں
زخم کا شمار اور بار بار موت کا حساب ہی نہیں ہے زندگی

جوایک بارگُل کی کُل لکھی ہوئی ملی ہے وہ کتاب ہی نہیں ہے زندگی
جولحہ لحہ ٹوٹتا ہے جسم وجاں پہ، وہ عذاب ہی نہیں ہے زندگی
فضائے بے کراں و بحرِ بے کنار بھی ہے، اک حباب ہی نہیں ہے زندگی
ہمیں ملا ہی کیا ہے آگہی سے
جہل کا فروغ، بے بصیرتی کا اوج دیکھ دیکھ کر سُلگتے رہنے کے سوا
مگر یہ ہم بھی جانتے ہیں
روشنیِ طبع ان جیسوں کا قہر اور بلا نہیں، کچھ اور ہے
فروغِ جہل اہلِ دہر کے لیے سزا نہیں، کچھ اور ہے
یہ بے بصیرتی کا اوج روشنی کا مدعا نہیں، کچھ اور ہے
سُلگتے رہنا، کچھ نہ کہنا، آگہی کا منتہا نہیں، کچھ اور ہے
ہم آگہی و زندگی کی رمز خوب جانتے ہیں ناقدانِ جستجو!
محققانِ مُردہ جو!
مدرِّسانِ کہنہ خو!

تمھارے پاس اور کیا ہے
اقتدار کی ہوس
بلند کرسیوں کی تشنہ آرزو
رٹے رٹائے کچھ سبق
کتاب، دوسرے جو تم کو لکھ کے دے گئے ہیں،
اس کے کچھ ورق
وہ زندگی، جو رائگاں، فضول عیش کی طلب
فروغِ جہل نے جو تم کو دی ہے بے بصیرتی کے
ہاتھ سے، وہ اِک سند

تمھارے پاس اور کیا ہے
مستعار فلسفے
جو میٹھی گولیوں کی طرح گھل سکیں
نہ مُنہ کا ذائقہ خراب ہو نہ تلخ ہو زباں
تمھیں دیا ہی کیا ہے زندگی نے
دُور کار زارِ وقت سے بھٹکتے رہنے، قبریں گننے
اور دوسروں کے زخم کی ہنسی اُڑاتے رہنے کے سوا
تمھیں کوئی خبر نہیں
کہ زخم کا شمار اور بار بار موت کا حساب بھی ہے زندگی
نئے سرے سے جس کو لکھنا ہے، وہ اک کتاب بھی ہے زندگی
نئے معانی کی تلاش میں جو لمحہ لمحہ ٹوٹتا ہے، وہ عذاب بھی ہے زندگی
جو ٹوٹ ٹوٹ کر بھی بار بار سر اٹھا سکے وہ اک حباب بھی ہے زندگی
تمھیں ملا ہی کیا ہے آگہی سے
کھوکھلی شکستہ سیپیوں، چمکتے شوخ سنگریزوں کے سوا
تمھیں کوئی خبر نہیں
کہ روشنیِ طبع اپنی آگ کے جہنموں کا قہر ہے
فروغِ جہلِ امتحانِ دہر ہے
ہوس کا اقتدار، اقتدار کی ہوس کا زہر ہے
خود اپنے دل کی بات کہنے کی امنگ خوں کی ایک لہر ہے
ہمارے پاس کچھ نہیں
تمھارے پاس سب سہی
مگر تمھارا سب کا سب نہ آج کو بدل سکا، نہ کل کے کام آئے گا
ہمارے پاس جو بھی ہے

## وہ آج کی ہے آگہی

ہم اپنی خود کتاب ہیں، ہم اپنے خود کتاب خواں
ہم آج لکھ سکیں اگر
تو آج ہی کی آگہی بنے گی کل کی زندگی

(1967)

# موت کی جستجو

چہرے روحوں کی بے مائگی
ذہن کی تیرگی کے سیہ آئینے
سرد آنکھوں کے تاریک روزن میں دبکا ہوا اک خلا
ایک سناٹا ہونٹوں کے بستہ مکاں میں ہے سویا ہوا
روح کو جہدِ تحصیلِ زر کھا گئی
ذہن کی روشنی ناامیدی کی ظلمت میں دھندلا گئی
آنکھیں ناکامیوں کے کھنڈر میں مکاں کے تصور سے عاری ہوئیں
ہونٹ کشکولِ دریوزہ گر بن کے لفظوں کی عصمت کی دوکاں بنے
اور اب کچھ نہیں
اور اب کچھ نہیں
ایک دیوانہ گر خواہشِ زیست ہے
خال و خط، دست و پا
سینہ و سر، شکم اور زیرِ شکم

ایک دیوانہ گر خواہشِ زیست اعضا میں دوڑی ہوئی
ایک بے معنی، بے کار اپاہج ہوس جسم کے تانے بانے کو تھامے ہوئے
صرف اس ایک لمحے کی آمد کا ہے انتظار
جبکہ ذہنوں کے، روحوں کے آئینے
آنکھوں میں دہکا خلا
اور ہونٹوں سے لپٹا سکوت
ایک بار خواہشِ زیست سے کہہ سکیں
زیست ہم پر ہمیشہ سے الزام ہے
ہم نہ زندہ رہے ہیں کبھی اور نہ زندہ ہیں اب
ایک دیوانہ گر خواہشِ مرگ ہی تھی ہمارے لیے زندگی

(شب خون، اکتوبر 1967)

# لوحِ غیر محفوظ

سنگِ در گھس گئے
اور پیشانیوں کے نشاں مٹ گئے
پتھروں پر اوامر کی تحریر کو سرد بے رحم موجِ ہوا کھا گئی
لاکھوں برسوں کے جاگے خداؤں کو نیند آ گئی

سالہا سال سے تنگ و تاریک غاروں میں سوئے ہوئے
اژدہے جاگ اٹھے
راکھشس اپنے خونخوار دانتوں کو چمکاتے پاتال سے سطح پر آ گئے
سحر کے صید جن بوتلیں توڑ کر شہر میں بس گئے
گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مکاں کوہ آثار دیوؤں کے قدموں کی
آواز سے دب گئے

روشنی کے دیاروں میں عفریت سایہ بہ سایہ بسے

تہہ سمندر کی پانی کے اوپر چمکنے لگی
برف آلودہ کہسار کی چوٹیوں کے دہانوں پہ جوالا دہکنے لگی
اونگھتے دیوتا مندروں کے کواڑوں کے پیچھے نظر بند ہوتے گئے
ساتویں آسماں پر خدا کو فرشتوں نے معزول کر کے مقید کیا
لوحِ محفوظ پر اور سب کچھ عیاں تھا
مگر یہ نہ معلوم تھا
لکھنے والا قلم کچھ چھپا جائے گا
ایک ایسا بھی دن آئے گا
جنت اپنے مکینوں کے ہاتھوں ہی لٹ جائے گی
دوزخ اپنے ہی شعلوں میں جل جائے گا
آسماں تک زمیں کی حدیں پھیل جائیں گی
اور آدمی
سدرۃ المنتہیٰ سے پرے عرش و کرسی تک آ جائے گا
لوحِ محفوظ کے رازِ سربستہ ہر شخص پا جائے گا
لوحِ محفوظ کو یہ نہ معلوم تھا

(20 فروری 1968)

# ایک اور عالم آشوب

قرن ہا قرن سے ہر گام پہ ہوتا رہا ہم کو یہ گماں
ناخنِ عقل سے کھلنے ہی کو ہے عقدۂ دشوارِ جہاں
میر صاحب نے جو فرمایا تھا یہ "کارگہہ شیشہ گراں
کار نازک ہے" تو ہم سانس بھی روکے رہے حیراں ترساں
گلِ غنچۂ خوابیدہ میں اس طرح رہے مُہر بہ لب
جیسے آتی ہے دبے پاؤں صبا پُرسشِ احوال کو یاں
خلوتِ ذہن کے دروازے پہ آیا جو خیالوں کا ہجوم
کی یہ تاکید کہ ملحوظ رہے خاطرِ خوابیدہ جہاں
حکم آیا تھا ہمارے لیے در پردۂ نغماتِ سکوت
سوئے سنسار میں تنہا رہے بیدار بہ ہر سو نگراں
ہر نفس قطع رہ عمر عذابِ دو جہاں کے ہم وزن
دھڑکنیں بھی تھیں مزاجِ دلِ نازک کے لیے بارِ گراں
انتظار ایسا کیا ہر بُنِ مو بن گیا چشمِ امید
قیدِ تنہائی میں بے مونسِ غم کٹ گئی شامِ ہجراں

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ مضامینِ سخن جمع ہیں سب
ہم رفو کرتے رہے زخمِ نظارہ کا ہر اک چاک نہاں
روٹھ جائیں جو معانی تو پھر الفاظ ہیں خالی کشکول
اسی اندیشے سے کھولی نہیں الفاظ کی رنگین دکاں
قرض اکیلے ہی ادا کرتے رہے زیست کے ہر لمحے کا
غیرتِ دل نے اٹھایا نہ محبت میں وفا کا احساں
ہم نے اک عمر اٹھایا ہے وہ خاموشیِ جاں کاہ کا بار
سینۂ ضبط میں الفاظ و معانی کا سمندر ہے رواں
ایسی تیزی سے چلے نور کی رفتار کا دم ٹوٹ گیا
یوں اڑے، گردِ کفِ پا سے بھی پیچھے ہی رہی کاہکشاں
ایسے لمحات بھی آئے ہیں کہ اِک لمحے کی یہ وسعت تھی
قیدیوں کی طرح گزری ہیں جھکائے ہوئے آنکھیں صدیاں
پھر بھی اُس معجزۂ فکر کے دیدار سے محروم رہے
جو یہ فرماتا کہ اب ایک قصیدہ ہو برائے انساں

اِک جہاں گم شدۂ گردِ رہِ آتش و بارود ہے آج
وقت کے شاہ سواروں کی تگاپو سے اُٹھا وہ طوفاں
وحشت آثاریِ تخریب سے ایامِ جہالت کا سماں
بربریت کے وہ اسباب کہ چنگیز و ہلاکو لرزاں
آدمیت کی تباہی کے وہ اسباب بہم آج ہوئے
مرگِ تہذیب پہ تیمور سے تا ہٹلر و روئل گریاں
زندگی جس کو بتاتے رہے پیغمبر و اَوْتار ثواب
اُس کی ہر سانس ہے سینے میں جہنم کے عذابوں سے گراں

بوجھ ایسا کہ اُٹھائے نہ بنے اور اُتارے نہ بنے
ہے سزا ایسی کہ میعاد و مشقت کا نہیں کچھ عنواں

زیست ناکردہ گنہ ہے کہ مفر جس سے نہ جس کی توبہ
طوقِ انفاس سے ہر لمحہ اُلجھتی رہے اک برقِ تپاں
کائنات آج سے پہلے تھی مفکر کے لیے درسِ نظر
شش جہت لاکھوں برس سے رہے جولاں گہہِ تخئیلِ جواں
مقصد و معنی و ترتیب و ترقی کے جو آئینے تھے
ہو گئے آئینۂ لغویت و بے سروپائی وہی کون اور مکاں
وہی قاتل ہے خدا کا جو زمیں پر تھا خدا کا نائب
کل جو خود عالمِ اکبر تھا، وہی ہو گیا بے سمت دھواں
آج انسان کی عظمت کا تصور ہے کفن کا محتاج
فلسفہ فکر کے رستے ہوئے زخموں کا کرے کیا درماں
آج معلوم ہوا، حق سے بڑا جھوٹ نہیں دنیا میں
ظلم ہے ظلم، ہر انصاف عدالت گہہ ابنائے زماں
محترم وہ ہے، جو سجدہ کرے لات و ہبلِ دولت کو
ٹوٹ جاتا ہے، اگر خم نہ ہو قد پیشِ خدایانِ جہاں
پا بہ زنجیرِ تقاضائے شکم علم ہے مجرم کی طرح
ہیں ابوجہل لیے ہاتھ میں انصاف و خرد کی میزاں
غاصب و خائن و راشی کو ہوس صاحبِ منبر ہو جائے
چور اچکّوں کی تمنا کہ بنیں قاضیِ حاجاتِ جہاں
قتل کے جرم میں ماخوذ ہیں سقراط و حسین و منصور
خوں لگا کر ہیں شہیدوں میں کھڑے حرملہ و شمر و سناں

اندھوں بہروں کو یہ دعویٰ کہ وہ رکھتے ہیں حواسِ خمسہ
ہوئے مختل جو حواس ان کے تو دنیا کی طرف ہیں نگراں
مُہر آنکھوں پہ تعصب نے لگا دی تو بنے اہلِ نظر
بولیاں بولتے ہیں خوب حماقت نے عطا کی جو زباں
جن کے ذہنوں میں ہے تاریک خیالات کے خفاش کا گھر
مطلعِ ذہنِ جہاں تاب کو ٹھیراتے ہیں ظلمت کا مکاں
اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں جنازہ اپنا
اور یہ زعم کہ ہیں مہدیِ موعود و مسیحِ دوراں

کفشِ اربابِ حکومت کو صحیفے کی طرح سر پہ دھرے
دہر کو دیتے ہیں تعلیمِ سرافرازی و درسِ ایماں
جن کا شیوہ ہے سگِ اہلِ امارت کی پرستش کرنا
کعبۂ حق کے نگہبانوں میں لکھواتے ہیں اپنا بھی نشاں

نکتہ چینوں کے لیے ہے ادبِ حاضرہ خوانِ کرگس
ادبِ عالیہ ہے مردہ فروشوں کی تجارت کی دُکاں
ہم کل اک بزم میں پہنچے تو عجب نقشۂ عبرت دیکھا
ادب و شعر کی تنقید میں مصروف تھے سب خورد وکلاں
خوش ہوا جی کہ صداقت کے طلب گاروں کے اس مجمع میں
گیسوئے شعر کے الجھاؤ کو سلجھائیں گے صاحب نظراں
نقد و افسانہ و تحقیق کے معیاروں کا ہوگا چرچا
فن و تہذیب کی اقدار کے بحران کا ہوگا درماں
ساغرِ معرفتِ دردِ جہاں ہوگا عطا نام بنام

ظرفِ مے خواراں سے انصاف کرے گا کرمِ پیرِ مغاں
کذب پر ہوگا تبرّا طلبِ حق سے تولا ہوگا
پائیں گے دادِ غمِ عشق و غمِ دہر دلِ شعلۂ جاں
مژدۂ دید سے ہو جائیں گے روشن دل و چشمِ یعقوب
اشکِ ہجراں کو سمیٹے گی شعاعِ غمِ ماہِ کنعاں
غم گساروں سے چھلک جائے گا تنہائی کا ساکت صحرا
فکرِ گم گشتہ کو مل جائے گا بھٹکی ہوئی منزل کا نشاں
رہنما ہوگا کوئی رمز شناسِ رہِ ایمان و یقیں
اہلِ تشکیک کو بتلائے گا ہے مرکزِ ایمان یہاں
سرِّ تخلیق، معانی و علائم سے اٹھیں گے پردے
اور ناکامیِ ابلاغ کے اسباب بھی ہوویں گے بیاں
لیکن اے وائے مقدر کہ وہاں بھی تھی بصیرت معدوم
واں بھی اربابِ سیاست کے قدم تھامے تھے ابنائے زماں
یہ نئی وضعِ تکلّف کہ ادیبوں سے نہ پوچھو احوال
حکم تھا یہ کہ رہیں قفل بہ لب صاحبِ دل، دیدہ وراں
احتیاط ایسی کہ ہر ذکر ہو، تخلیق کا مذکور نہ ہو
التزام ایسا کہ انصاف کی کرسی پہ ہوں خود مدعیاں
عقل نے حکم دیا شعر و ادب لعنتِ شہرت طلبی
دل نے فرمایا کہ تنقید بھی ہے بردہ فروشوں کی دکاں

عقل و دل دونوں سے ہم نے بہ لجاجت بہ ادب یہ پوچھا
گر یہاں بھی نہیں انصاف تو معتوبِ جہاں جائیں کہاں
علم نے فیصلہ فرمایا کہ دانش کدۂ اہلِ خرد

بے نیازانِ رہ و رسمِ زماں کے لیے ہے بیت اماں
یہ بجا ہے کہ وہاں دولت و ثروت ہے نہ جاہ و حشمت
لیکن اچھا ہے، ان امراض سے محفوظ رہے دل کا مکاں
دور سے دیکھا تو واں چہروں پہ تقدیس کے ہالے دیکھے
علم کے نشے سے سرشار نظر آیا ہر اک پیر و جواں
ہم کہ وارفتۂ تحقیق و تجسس تھے، چلے آئے کھنچے
کہ ہمیں تشنگیِ شوق کا انعام عطا ہوگا یہاں
پہرے داروں نے درِ داخلہ پر آنکھیں دکھائیں، پھر بھی
ہم بصد نازِ خرد بڑھ گئے سوئے حرمِ پیرِ مغاں
تھے وہاں منتخب اربابِ خرد جمع برائے انصاف
زعم ہر شخص کو تھا، اپنی جگہ ہے وہ فلاطونِ زماں
اپنے کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے پشتارۂ علم و اسناد
ہم بھی اک صف میں کھڑے ہوگئے الطاف و کرم کے خواہاں
ایک نے پوچھا کہ "مذہب" تو کہا "علم و صداقت کی تلاش"
ایک نے نسل و نسب پوچھا تو بولا کہ "ہوں فردِ انساں"
ایک نے پوچھا کہ "کچھ رشتہ ہے اربابِ حکومت سے ترا"
باادب سر کے اشارے سے کہا "میں ہوں غریبِ دوراں"
ایک نے پوچھا کہ "تو جھوٹ کو سچ کر کے دکھا سکتا ہے؟"
کہا "سقراط و حسین ابنِ علی سے ہے مجھے ربطِ نہاں"
ایک نے پوچھا کہ "کیا کی ہے کبھی مشقِ قدم بوسی بھی"
تو کہا "زخم سر اپنا ہے سرافرازی کا تابندہ نشاں"
سخت بد حظ ہوئے وہ منتخب اربابِ زمانہ مجھ سے
اٹھا غیظ و غضب شروع ہوئی شعلہ بہ لب، کف بہ دہاں

اور فرمایا کہ ''تو علم کی خدمت کے نہیں ہے لائق
تیری تقدیر ہے آوارگیِ کوئے ملامت ناداں
علم ہے مذہبِ اربابِ سیاست کا غلامِ ادنیٰ
فضل ہے خادمِ ذات و نسب صدر نشین کے شایاں
سب سے اعلیٰ سند اربابِ حکومت کی قرابت داری
کفش برداریِ حکام سفارش کا ہے روشن عنواں
مسندِ علم کے شایاں ہے، جسے ذوق ہے پابوسی کا
سرفرازی کا جسے خبط ہے، کھاتا رہے سنگِ طفلاں
سچ کے مقتول ہیں سقراط و حسین و منصور
سچ کا حاکم ہے وہی، کذب و صداقت کو جو کہتا ہے گماں''

علم ہے نسل و نسب، دین و وطن، قوم و قبیلہ کا اسیر
علم خانوں میں، لکیروں میں، حصاروں میں ہے تقسیم یہاں
علم اسناد کا پابند ہے، اسناد ہیں بوجہل کے ہاتھ
علم ہے مسند و منصب کی بلندی کا فقط ایک نشاں
علم ہے نقل نویسوں کے سیہ خانے کا اک زندانی
علم ہے عقل سے معذوروں کے اذہان کا پیچیدہ دھواں
علم کی عقدہ کشائی پہ ہیں مامور وہ بوڑھے طوطے
شیر خواروں کی طرح جن کی زبانوں پہ ہے اب بھی غوں غاں
علم کے مسلخ و زندان ہیں سب مدرسے، دانش گاہیں
علم کے مشہد و مقتل ہیں دفاتر کے سنہرے ایواں
علم کی مسندِ عالی کے سزاوار ہیں جہال کے بیٹے پوتے
کوہِ علم پہ فائز ہیں غلامانِ غلامانِ جہاں

علم کے قتل پہ مامور ہیں کم بین و کم آگاہ بزرگ
علم کی لاش کے کرگس ہیں بزرگوں کے جواں فرزنداں

اے دریغا کہ نہیں ایک بھی ممدوح سزاوارِ مدیح
اے دریغا کہ نہیں ایک بھی معشوق غزل کے شایاں٭
اے دریغا کہ ہمیں ایک قصیدہ بھی نہ لکھنا آیا
اے دریغا کہ ہوئی ہجو سے آلودہ پھر اک بار زباں
عصرِ حاضر کا ہے یہ جبر کہ پڑھتے رہو اپنا نوحہ
اور جب لکھنے کو بیٹھو تو لکھو مرثیۂ اہلِ جہاں
نظم لکھنے کی ہو خواہش تو لکھو خون میں تر عہدِ آشوب
غزل آمادہ طبیعت ہو تو کرتے رہو نفرت کا بیاں
اگر اس دور کا بھی کوئی خدا ہو تو یہ اس سے پوچھیں
ہم نے کیا ایسی خطا کی تھی کہ ملتا نہیں تیرا بھی نشاں
جرم کیا تھا کہ ملا منصبِ خونابہ فشانی ہم کو
تو نے کیوں ہم کو دیا روشنیِ ذہن و نظر کا ساماں
کیا گنہ تھا کہ ہیں پاداش میں جس کی دل و دیدہ ماخوذ
تو نے کیوں روزِ ازل سے ہمیں دی قسمتِ خونیں جگراں
ہم کو بھی اہلِ سیاست کی طرح تیرہ دلی دے دیتا
کامیابانِ زمانہ کی طرح دل میں نہ اُٹھتا طوفاں
ہم کو بھی مسندِ اعلیٰ کے لیے سر کا خلا مل جاتا
ہم کو بھی جہل کی دولت سے بنا دیتا فلاطونِ زماں

---

٭ اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل (انوری)

ہم کو بھی صدق کو جھٹلانے کی تھوڑی ہی سی جرأت ملتی
ہم کو بھی جہل کی پابوسی کا کچھ حوصلہ ہوتا ارزاں
ہم بھی اربابِ زمانہ کی طرح خود سے دغا کرسکتے
ہم بھی عمر اہلِ ریا بن کے بسر کرتے بہ حالِ شاداں
تو نے یہ سب نہ دیا، ذہن ونظر، صدق وصفا ہی جو دیے
تو کرم ہوتا جو دیتا نہ مرے مُنہ میں سخنور کی زباں

میں ہوں گستاخ خدایانِ جہاں سے تو مشیت ہے تری
میں ہوں گردن زدنی، سوختنی، تب بھی ہے تیرا احساں
اس نظم کے ابتدائی اشعار 1962 میں لکھے گئے۔ کئی برس بعد 1968 میں مکمل ہوئی۔

(1962-68)

علم کے قتل پہ مامور ہیں کم بین و کم آگاہ بزرگ
علم کی لاش کے کرگس ہیں بزرگوں کے جواں فرزنداں

اے دریغا کہ نہیں ایک بھی ممدوح سزاوارِ مدیح
اے دریغا کہ نہیں ایک بھی معشوق غزل کے شایاں؎
اے دریغا کہ ہمیں ایک قصیدہ بھی نہ لکھنا آیا
اے دریغا کہ ہوئی ہجو سے آلودہ پھر اک بار زباں
عصرِ حاضر کا ہے یہ جبر کہ پڑھتے رہو اپنا نوحہ
اور جب لکھنے کو بیٹھو تو لکھو مرثیۂ اہلِ جہاں
نظم لکھنے کی ہو خواہش تو لکھو خون میں تر عہدِ آشوب
غزل آمادہ طبیعت ہو تو کرتے رہو نفرت کا بیاں
اگر اس دور کا بھی کوئی خدا ہو تو یہ اس سے پوچھیں
ہم نے کیا ایسی خطا کی تھی کہ ملتا نہیں تیرا بھی نشاں
جُرم کیا تھا کہ ملا منصبِ خونابہ فشانی ہم کو
تو نے کیوں ہم کو دیا روشنیِ ذہن و نظر کا ساماں
کیا گنہ تھا کہ ہیں پاداش میں جس کی دل و دیدہ ماخوذ
تو نے کیوں روزِ ازل سے ہمیں دی قسمتِ خونیں جگراں
ہم کو بھی اہلِ سیاست کی طرح تیرہ دلی دے دیتا
کامیابانِ زمانہ کی طرح دل میں نہ اُٹھتا طوفاں
ہم کو بھی مسندِ اعلیٰ کے لیے سر کا خلا مل جاتا
ہم کو بھی جہل کی دولت سے بنا دیتا فلاطونِ زماں

؎ اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل (انوری)

ہم کو بھی صدق کو جھٹلانے کی تھوڑی ہی سی جرأت ملتی
ہم کو بھی جہل کی پابوسی کا کچھ حوصلہ ہوتا ارزاں
ہم بھی اربابِ زمانہ کی طرح خود سے دغا کر سکتے
ہم بھی عمر اہلِ ریا بن کے بسر کرتے بہ حالِ شاداں
تو نے یہ سب نہ دیا، ذہن ونظر، صدق وصفا ہی جو دیے
تو کرم ہوتا جو دیتا نہ بُرے مُنہ میں سخنور کی زباں

میں ہوں گستاخ خدایانِ جہاں سے تو مشیت ہے تری
میں ہوں گردن زدنی، سوختنی، تب بھی ہے تیرا احساں

اس نظم کے ابتدائی اشعار 1962 میں لکھے گئے۔ کئی برس بعد 1968 میں مکمل ہوئی۔

(1962-68)

# دوری کا نغمہ

یہی آسماں جو مرے سر پہ سایہ فگن ہے
تمھارے بھی سر پر کیے ہوگا سایہ
یہی آسماں جو اُگلتا ہے میرے لیے حبس، دھوپ، آگ، اذیت پسینہ
تمھارے وطن کی حدوں میں
گلستاں گلستاں لطافت طراوت ہوا بانٹتا ہے

تم اک پھول ہو
آسماں مہرباں ہے
تمھیں غنچہ و گل، نسیم و صبا چاہتے ہیں
میں ہوں اک بگولہ
خفا آسماں ہے
زمیں اپنے سینے پہ میرے قدم جمنے دیتی نہیں ہے
ہوا مجھ کو کاندھوں پہ اپنے اُٹھائے ہوئے گھومتی ہے

مگر کوہ و صحرا
نگر اور قریے
گلستاں، بیاباں
کوئی مجھ کو دامن میں اپنے چھپانے کا اقرار کرتا نہیں ہے
ہوا تم کو چھوتی ہے، پر ڈرتے ڈرتے
تمھارے بدن، پیرہن، گیسوؤں سے اڑاتی ہے خوشبو
زمیں چومتی ہے قدم کو تمھارے
جہاں پاؤں رکھ دو، وہاں کھِل کھِلا اُٹھیں غنچے ستارے
تمھارے لبوں پر مچلتی ہوئی مسکراہٹ چُرا کر
ہوا دشت در دشت مسرور و سرشار پھرتی ہے گاتی

ہوا دور دیسوں کے کہسار، دریا، پل اور شاہراہوں سے
ہو کر گزرتی پہنچتی ہے مجھ تک
تو میں اپنی وحشت کا بے تاب رقصاں بگولا
اُسے جیب و دامن میں، سینے میں، آنکھوں میں بھر کر
تمھارے وطن کی طرف بھاگتا ہوں
یہ کہسار و دریا، یہ پل شاہراہیں مری راہ روکے
کھڑی ہنس رہی ہیں

مجھے اور تم کو
ہوا جوڑتی، آسماں باندھتا ہے
مگر یہ زمیں توڑتی ہے
جُدا کرتی ہے

ملنے دیتی نہیں ہے
اُٹھا رکھی ہیں اِس نے دیواریں راہوں میں
رستے میں دریا بچھائے ہیں، کہسار ڈھالے ہیں
آؤ
ہوا سے کہو
آسماں بے کراں ہے
فصیلوں، حصاروں سے آزاد ہے
اس کا وہ گوشہ جو میرے سر پر ہے خیمہ فگن
اس طرح لے اُڑے
دوسرا گوشۂ آسماں جو تمھیں دیکھتا ہے
سمٹ آئے اُس میں

زمیں
آسماں کی حدوں کو لپٹتا سمٹتا ہوا دیکھ کر
اپنی تنگی پہ اس طرح شرمائے
سب دوریاں، فاصلے حرفِ موہوم کی طرح مٹ جائیں
اور یہ زمان و مکاں اس طرح سے سمٹ جائیں
بس ایک نقطہ رہے
جس پہ ہم تم ملیں

(11 جولائی 1969)

# وہ ایک شعلہ، منور تھے جس سے لاکھوں دماغ

(ذاکر صاحب کی وفات پر)

وہ ایک شخص تھا — پھر ایک سے ہزار ہوا
وہ ایک گل تھا، مگر فخر صد بہار ہوا
وہ ایک نور تھا، جس سے تھے بے شمار چراغ
وہ ایک شعلہ، منور تھے جس سے لاکھوں دماغ
وہ ایک لمحہ، ازل آشکار، ابد آثار
وہ ایک عزم جو تاریخ ساز، عہد شکار

وہ ایک شخص تھا — پھر ایک سے ہزار ہوا
ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں دلوں کا ناز بنا
جس انجمن میں گیا، اس کا امتیاز بنا
وہ ایک گل تھا — مگر فخر صد بہار ہوا
تبسم اس کا گلابوں کا مسکراتا چمن

وجود اس کا محبت کی آگ سے روشن
وہ ایک نور تھا— جس سے تھے بے شمار چراغ
وہ جامعات و مدارس کی شمع عالم تاب
وہ ہنستے کھیلتے بچوں کی خوش دلی کی کتاب
وہ ایک شعلہ— منور تھے جس سے لاکھوں دماغ
تعصبات سے نفرت کی آندھیاں اٹھیں
جہالتوں سے اندھیروں نے سازشیں کرلیں
مگر اندھیرے میں وہ نور ارجمند رہا
جہاں جہاں بھی جلے علم کے سنہرے چراغ
ہر اک چراغ کے شعلے میں سربلند رہا
وہ ایک نور تھا جو ہر چراغ میں چمکا
وہ ایک شعلہ تھا، جو ہر دماغ میں چمکا
وہ ایک عزم— جو تاریخ ساز، عہد شکار
جو سرفروش و سرافراز زندگی کا نام
جو ظلم و جبر کا باغی، جو صدرِ بزمِ عوام
وہ ایک لمحہ— ازل آشکار، ابد آثار
زماں کے سیل میں ہر لمحہ لمحۂ گزراں
زماں کے سیل میں ہستی ہے نیستی کا خروش
زماں کے سیل میں ہے زندگی عدم بردوش
مگر وہ لمحہ، جسے سرِ کن فکاں کہیے
زمانہ آفریں، تخلیق بے کراں کہیے
اُس ایک لمحے میں صدیاں اسیر ہوتی ہیں
وہ ایک لمحہ ہے سرچشمۂ حیات و زماں

وہ اندھے سیلِ زماں کا ہے دیدۂ نگراں
اُسی کا نام ازل ہے اسی کا نام ابد
ہم ایسے لمحے کو کہتے ہیں عہد ساز انساں

وہ ایک لمحہ تھا ایسا ہی، جو ابھی ڈوبا
وہ ایک شخص تھا ایسا ہی، جو ابھی بچھڑا

وہ لمحہ سیلِ زماں میں بھی گم نہیں ہوگا
وہ شخص بچھڑا کہاں ہے، یہیں کہیں ہوگا
گلاب ہنستے ہیں، اطفال مسکراتے ہیں
یہ تازگی، یہ تبسم اسی کی دولت ہے
ہیں جامعات و مدارس کی گودیاں آباد
یہ تشنگی، یہ تمنا اسی کی فطرت ہے
کھلے ہیں آج بھی میخانہ ہائے فکر و خیال
یہ روشنی کی پرستش اسی کی جرأت ہے

وہ بجھ گیا ہے، مگر روشنی ہے کام اس کا
وہ مرگیا ہے، مگر زندگی ہے نام اس کا

# شب و روزِ تماشا

ذہن جب تنگ ہے
خیالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے
ہونٹ جب تنگ ہیں
سوالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

بحث کرتے رہو، لکھتے رہو نظمیں غزلیں
ذہن پر صدیوں سے طاری ہے جو محبس کی فضا
اس خنک آنچ سے کیا پگھلے گی
سوچ لینے ہی سے حالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے وابستہ خواب
تیز کرنوں کی سنانوں پہ ہیں رسوا سرِ عام
یہ شہید اپنی صلیبوں سے پلٹ آتے ہیں دل میں ہر شام

صبح ہوتی ہے، مگر رات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

دن گزر جاتا ہے بے ثمرہ و بے فیض کدوکاوش میں
ایک اَن دیکھے جہنم کی تب وتابش میں
جسم اور جاں کی تگ وتاز کی پُرسش میں
غم وحسرت ومحرومی کی ہر کاہش میں
طلب وترکِ طلب سلسلۂ بے پایاں
مرگ ہی زیست کا عنوان ہے ہر خون شدہ خواہش میں
غم سے بھاگیں بھی تو فریاد وشکایات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

وقت وہ دولتِ نایاب ہے آتا نہیں ہاتھ
ہم مشینوں کی طرح جیتے ہیں پابندیِ اوقات کے ساتھ
وقت بے کار گزرتا ہی چلا جاتا ہے
کُرسیوں میزوں سے بے معنی ملاقاتوں میں
سینکڑوں بار کی دُہرائی ہوئی اُگلی ہوئی باتوں میں
زندہ رہنے کی تمنا کی مداراتوں میں
شکم وجاں کی عبادات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

جن کو مانا ہے نہ پوجے گی کبھی دیدہ وری
جن خداؤں سے طبیعت ہے نفور
اُن کے حضور
ہر گھڑی حمد وسلام اور دُرُود
اُن کی چوکھٹ پہ قیام اور قعود

اُن کے قدموں پہ سجود
جانتی ہے یہ مری بے ادبی
ہے یہ سب خدمتِ دنیا طلبی
کیا کریں پھر بھی ستائے جو بہت تشنہ لبی
ہائے آشفتہ سری
مدح و تسبیح و مناجات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

صبح سے شام تلک اتنے خدا ملتے ہیں ہر کافر کو
سجدۂ شکر سے انکار کی مہلت نہیں ملنے پاتی
سینکڑوں لاکھوں خداؤں کی نظر سے چھپ کر
خود سے مل لینے کی رخصت نہیں ملنے پاتی
خود پرستوں سے بھی طاعات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

رات آتی ہے تو دل کہتا ہے، ہم اپنے ہیں
خلوتِ خواب میں دنیا سے کنارہ کرلیں
کل بھی دنیا ہے لہو اپنا، دل و دیدہ کی جھولی بھرلیں
جسم کے شور سے اور روح کی فریاد سے دم گھٹتا ہے
دن کے بے کار خیالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

بے نیازانہ بھی جینا ہے فقط ایک گماں
فکرِ موجود کو چھوڑیں تو غمِ ناموجود
ساتھ ہر سانس کے ہے سلسلۂ ہست و بود
غمِ آفاق کو ٹھکرائیں، کریں ترکِ جہاں

پھر بھی یہ فکر کہ جینے کا ہو کوئی عنواں
بے نیازی سے غمِ ذات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

ذہن میں اندھے عقیدوں کی سیاہی بھرلو
تا کہ اس نگری میں
کبھی افکار کے شعلوں کا گزر ہو نہ سکے
جبر کا حکم سنو
ہونٹ تم اپنے سی لو
تا کہ اِن راہوں سے
کبھی لفظوں کا سفر ہو نہ سکے
ذہن ولب پھر بھی نہیں چپ ہوتے
اِن کے خاموش سوالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے
پیچ در پیچ خیالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

(28 اکتوبر 1970)

# ''میں'' کی تلاش

میرے اطراف آباد ہیں جسم کی بستیاں
آب و گل میں ہیں پیوست سب کی جڑیں
سب بدلتے ہوئے موسموں کی ہواؤں کے پروردگاں
اندھی بے رحم فطرت کے ظلم اور الطاف کے ٹھوس مرئی نشاں
ارتقا کے مراحل کی بکھری ہوئی داستاں

کچھ بدن ٹھوس، فربہ، تنومند، اصنام سنگ
آہنی استخواں اور سنگیں عضلات کی گٹھریاں
زندہ روحِ نباتی سے عاری، جمادات کی سطح پر

کچھ بدن پھیلنے پھولنے اور زمیں گھیرنے کی جبلت کے آثار ہیں
روشنی اور ہوا کے لیے جن کی شاخیں ہیں دستِ سوال
روحِ حیواں سے عاری نباتات کی سطح پر صید انفاس ہیں

کچھ بدن خواہشوں کے اُمڈتے ہوئے گرم طوفاں کی جولاں گہ
اشتہا اور شہوت کی چلتی ہوئی سانس لیتی دُکاں
روحِ انساں سے عاری بہایم کی دنیا میں ہیں حکمراں

کچھ بدن روح کا بوجھ کاندھوں پر اپنے اُٹھائے ہوئے
رشتۂ جسم و جاں میں بندھے غیر مرئی حقیقت کی دیدار کے مُلتجی
جسم ہونے پہ بھی منکرِ جسم اور زندہ رہ کر بھی ہیں خواہشوں سے تہی

میں بھی اک عمر سے جسم کی ایک بستی میں محصور ہوں
میری ہم نام اک روح اِس خاک داں میں مرے ساتھ ہی قید ہے
جسم کہتا ہے تو ہے مری خواہشوں، احتیاجوں، تقاضوں کا پیکر
روح کہتی ہے تو میری نادیدہ امید و شوق و طلب ہی کی پرچھائیں ہے
جسم اور روح کی اس کشاکش میں مجھ کو پتہ اپنا ملتا نہیں

میں اگر روح ہوں جسم مجھ پر ہے بارِ گراں
میں اگر جسم ہوں، روح کا یہ جہنم ہے میرے لیے اک وبال
میں اگر روح بھی جسم بھی تو کشاکش ہے دونوں میں کیوں؟

جسم کی بستیوں میں بھٹکتا ہوں اک عمر سے
روح کے راستے میں جمادات کا آہنی اور سنگیں حصار
خواہشوں کے دہکتے ہوئے دشت میں ہیں نباتات و حیوان میرے حریف
جسم کی کشمکش روح و روحانیت کے اندھیرے میں بجھتا دیا
جسم کی بستیاں اس کشاکش پہ خندہ زناں

ہاتھ آتا نہیں روح کا غیر مرئی جہاں
میں ہوں کیا اور کھڑا ہوں کہاں؟
میرے چاروں طرف جسم کا دشت ہے نوحہ خواں
میری پہنائی میں روح کا اک خلا از کراں تا کراں حکمراں
وہ جو "میں" ہوں
کہاں کھو گیا جسم اور روح کے درمیاں؟

(24 اگست 1973)

# آدمیوں کا چڑیا گھر

بلند و بالا گھنے درختوں کا ہر طرف سے حصار باندھے
زمیں جزیروں اور ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے
ہر ایک ٹکڑے کے گرد لوہے کے سخت تاروں نے تان رکھی ہے ایک چادر

جزیرے پانی کی خندقوں سے بٹے ہوئے ہیں

وہی ہوا اور روشنی ہے جو اک جزیرے سے دوسرے تک گزر رہی ہے
وہی ہوا اور روشنی ہے جو ایک ٹکڑے کو دوسرے سے ملا رہی ہے
وہی فضا ہے جو اپنی بانہوں میں اس زمیں کو لیے ہوئے ہے
یہ خندق آلودہ پارہ پارہ زمیں اُسی اک زمیں کا حصّہ ہے
جو ہمارے تمہارے سب کے قدم کے نیچے بچھی ہوئی ہے

یہاں بھی سب کے سروں پہ خیمہ فگن وہی آسماں ہے
جس کے ستارے سورج

زمیں کو کرّوں کے ایک رشتے میں باندھتے ہیں
مگر یہ آدم کا شعبدہ ہے اُٹھائیں دیواریں اور کھودی زمیں میں خندق
مشین، لوہے، سمنٹ، پانی سے درمیاں میں حصار کھینچے
یہ علم آدم کا ہے کرشمہ کہ پارہ پارہ ہوئی زمان و مکاں کی وحدت
یہ آدمی کی نظر کا ہے معجزہ حقیقت بنی ہوئی ہے ہزاروں لاکھوں کروڑوں
ٹکڑوں کی ریزہ کاری

جزیروں ٹکڑوں میں قید انساں ہوا کو اجزا میں بانٹتا ہے
حصار و خندق سے پارہ پارہ نظر فضا و فلک کو کرتی ہے ریزہ ریزہ

ہر اک جزیرے میں قید ہے اک گروہِ آدم
ہر ایک ٹکڑے میں اک قبیلہ بسا ہوا ہے
ہر اک قبیلہ گروہ اپنے ہی تنگ زنداں کو جانتا ہے حقیقتِ کل
ہر ایک قیدی خود اپنی ریزہ صفت نظر ہی کو جانتا ہے جہان پیما
حقیقتِ کل نہ یہ جزیرہ، نہ وہ زمیں کا حصار آلودہ تنگ ٹکڑا
جہان پیما نہ یہ حدیں ہیں، نہ وہ فصیلیں
زمیں کی وسعت نہ خندقیں ہیں، نہ خندقوں میں چھلکتا پانی
مشین، لوہے، سمنٹ، پتھر کے بطن سے پھوٹتی ہے کثرت
خلا کی وسعت میں تیرتی دوڑتی مشینوں
کی نارسائی کی حدِ آخر ہے صرف ظلمت

جزیروں ٹکڑوں میں قیدیوں کے قبیلے تحقیق کر رہے ہیں
کہ اُن کے حصے کے جُشتِ درگِل کا مزاج کیا ہے
کہ اُن کی قسمت کی چند کرّوں کا راز کیا ہے

کہ اُن کے چلّو میں قید پانی کی سمت کیا ہے
کہ اُن کی مٹھی میں بند موجِ ہوا کے اجزا کی اصل کیا ہے
جزیروں کے درمیاں حصاروں میں چند روزن کھلے ہوئے ہیں
لگائے اِن روزنوں میں آلے ہر اک قبیلے کا سرغنہ دوسروں کے
علم ونظر پہ خنداں

ہر اک سمجھتا ہے علم اُس کا حقیقتِ کُل کو پا چکا ہے
ہر ایک کو ہے گمان یہ کہ اُسی کی عینک نظارہ پیا بھی ہے نظر بھی
ہر ایک کو ہے یہ زعم اُس کی ہی خوردبیں کے قدم کے نیچے زماں مکاں ہیں

جزیروں ٹکڑوں میں قید انساں
خود اپنے ایسے ہی قیدیوں کو سمجھ رہا ہے عیارِ انساں
ہر اک قبیلے کو وہم ہے یہ اسی کے افراد آدمی ہیں
ہوس نے ٹکڑے کیے زمیں کے
نگاہِ آدم کا ہے کرشمہ کہ ہے حقیقت بھی پارہ پارہ
ہے ارتقائے علوم کا معجزہ کہ وحدت ہے ریزہ ریزہ

ہماری دنیا حصار و دیوار کی ہے دُنیا
ہماری دنیا کے رہنے والے اکہرے بے تہہ وحوش و حیواں

(3 ستمبر 1973)

# بازگشت

جنازہ کاندھوں پہ اپنے اٹھائے ہم اپنا
گئے تھے آج حدِ ممکنات سے آگے
جہاں پہ ختم ہیں صحرائے زندگی کی حدیں
جہاں سے دشتِ عدم کا سُراغ ملتا ہے
گزشتگاں کے قدم کا سراغ ملتا ہے
یہ فکر تھی کسی گوشے میں خود کو دفن کریں
یہ زندگی جو ہے دشمن کی بد دعا کی طرح
ہم اس کا بارِ گراں دوش سے اُتار آئیں
غبارِ قافلۂ رفتگاں نے ہم سے کہا
کہ زندگی سے رہائی نہیں ہے سہل اتنی
تمام رفتہ و آئندہ کا ہے تم پہ قرض
عدم میں حال نہ ماضی نہ کوئی مستقبل
نہ کائنات   نہ تخلیق کا دھڑکتا دل
ہمیں بھی ہے یہ تمنا کہ پھر حیات ملے

ہماری خاک بھی لے جاؤ اپنے دامن میں
خدا کرے یہ نئی زندگی کے کام آئے
سُوئے نیست سے ہم زیست کی طرف چلئے
تمام رفتہ و آئندہ کو سمیٹے ہوئے

(29 اکتوبر 1973)

# ملفوظات

(1)

بزرگوں کی خطاؤں کو پکڑنا ہے گنہ ایسا ہماری مملکت میں
کہ اس جرمِ کبیرہ پر بزرگانِ گرامی
تم کو جینے کی اجازت بھی نہ دیں گے

(2)

صحائف کی زباں سے
اولیا، گیانی، رشی کہتے رہے تھے
جہالت قید ہے اور علم آزادی
جہالت ہے فنا اور علم ہی رازِ بقا ہے
مگر ہم دیکھتے ہیں
جہالت ہی سے آزادی عبارت ہے
جہالت ہی کو حاصل ہے بقا بھی اور ترقی بھی

ہمارے علم نے ہم کو کیا ہے قید آدرشوں، اصولوں کے حصاروں میں
ہمارا علم ہے زنجیرِ پا اور طوقِ گردن
جہالت علم کو مُنہ مانگے داموں مول لیتی ہے
جہالت علم کو بازار میں جب چاہتی ہے بیچ دیتی ہے
جہالت طاقت و زر ہے، حکومت ہے
ہمارے شہر میں ہے علم پستی، مفلسی، حرماں، غلامی
صحائف اور پیغمبر رشی اور اولیا
کیا سب غلط کہتے رہے ہیں؟

(3)

پڑھا ہے میں نے کتابِ وجود میں اپنی
کہ دوسروں سے تعلق کا نام ہے انساں
کہ لاکھ قید ہو کوئی حصار میں اپنے
تعلقات کے رستے نکل ہی آتے ہیں
کہ آدمی کی رفاقت ہے آدمی کا وجود
مگر یہ کہتا ہے مجھ سے ہر آدمی کا عمل
وہی غنی ہے جو ترکِ تعلقات کرے
کسی سے کوئی تعلق رکھے، نہ عشق کرے
ہے آدمی کے لیے بار آدمی کا وجود
ہیں اعتبار کے قابل نہ دوستی نہ وفا
نہ خوں کے رشتے، نہ ہم سائگی، نہ ہم سخنی
اگر نہ جیب میں ہوں نقرہ وطلا کے پھول
تمام رشتے ہیں برگِ خزاں سے بھی کمزور

(4)

ہمارے شہر میں آیا تھا ایک دن قاروں
قریب و دور سے جو بھی ملا وہ ہے شاداں
ہزاروں لاکھوں زبانیں ہیں اُس کی مدح کناں
کوئی ہے شاد کہ دیکھا تھا اُس نے میری طرف
کسی کو فخر ہے، کی اُس نے مسکرا کے بات
کسی کو ناز کہ اُس نے ملایا مجھ سے ہاتھ
کسی کو زعم، دیا میں نے اُس کو جامِ آب
کسی کو وجد کہ تھا میں شریکِ بزم اُس کا
خوشی کے لاکھوں بہانے، ہزاروں پہلو ہیں

قبا میں اُس کے چمکتے تھے گوہرِ نایاب
قدم سے لپٹی ہوئی کفش تھی جواہر پوش
زباں سے اُس کی ٹپکتے تھے پھول گوش بہ گوش
نگہ میں اُس کی تھا جادو
نفس میں تھی خوشبو

وہ شخص آیا، گیا
ہوا نہ اک متنفس کو اُس سے حاصل فیض
خزانے اُس کے تھے پہلے بھی، اب بھی ہیں روپوش
ہزاروں لاکھوں میں اک شخص کو بھی کچھ نہ ملا
مگر ہر ایک کو وہ دے گیا ہے دولتِ ناز
غریب خوش ہیں کہ پائی تو دولتِ قربت

تمام عمر میں کچھ دیر کو سہی، لیکن
ملایا ہاتھ تو دولت سے
دیکھا ظلّ ہما
کمال یہ ہے کہ اربابِ علم و دانش و فن
ہیں اُس کی مدح میں سَو سَو طرح سے زمزمہ خواں
یقین ہے نہ ملے گا کسی کو فیض اُس سے
مگر ہیں دانش و علم اُس کے پھر بھی باج گذار
نہیں اُمید کہ پائے گا اُس سے داد ہنر
ہر ایک فن ہے مگر غائبانہ اُس کا شکار

(19 مارچ 1974)

# سوادِ دشتِ ندا میں

(1)

(سکوت و صدا)

صدائے حق پتھروں سے سر پھوڑتی ہے اپنا

حصار سنگیں، زمیں سنگیں
دریچے، در، سقف و بام سنگیں
نگاہیں پتھر، زبانیں پتھر
خیال و احساس و درد پتھر میں ڈھل گئے ہیں
قلم کی نوکیں، لویں چراغوں کی پتھروں میں بدل گئی ہیں
عقیدے پتھر کے بت ہیں
اقدار پتھروں کے سیاہ کہنہ بلند اہرام
زباں سے نکلیں تو لفظ پتھر
دلوں میں اتریں تو معنی پتھر
محبتیں پتھروں کی پوجا تو نفرتیں پتھروں کے قدموں میں خوں کا نذرانہ بن گئی ہیں

○

صدائے گُم گشتہ چیختی ہے خموش ویران مرقدوں میں
چلو یہاں سے یہ کیسی دنیا ہے
کس نے پھونکا ہے سحر ایسا
کہ دل کی دھڑکن، نظر کی جنبش، زباں کی گرمی
خیال وخواب، آرزو وتمنا، کسی کا کوئی نشاں نہیں ہے
حدِ نظر تک نئے پرانے بتوں کا گونگا صنم کدہ ہے
ہوس کی نظروں نے اپنے جادو سے شہر کو پتھروں کی نگری بنا دیا ہے

○

صدا جو نطق وزباں کی خالق ہے
لفظ ومعنی کی چارہ گر ہے
سکوتِ اصنام سنگ پیکر میں اپنا رستہ نہ پا سکے گی
وہ پتھروں کے مہیب جنگل میں، خامشی کی سیاہیوں میں بھٹک نہ جائے
وہ پتھروں کی لہو چشیدہ زباں سے ٹکرا کے خود بھی پتھر میں ڈھل نہ جائے
وہ دل جو شہرِ ہوس میں آنے سے پہلے اپنی صدا سے بھی منحرف ہوا تھا
کسی طلسمی اثر سے اب تک صدا کی زنجیر میں بندھا تھا
صدا نے اپنی طرف بلایا تو زخم خوردہ قدم سسکتے ہوئے کراہے
صدا نے کھینچا تو پتھروں سے الجھتے پیروں میں آئی حرکت
صدا نے دوڑا دیا رگوں میں لہو تو جاگا سفر لہو میں
قدم سے لپٹے بتوں نے پیروں کے خوں سے اپنے سیاہ چہروں کو تازگی دی
سکوت پروردہ تیرگی کے، دیوں نے اپنی لووں کو اس خون میں ڈبویا
تو دور صحرا میں کچھ صدائیں ہتھیلیوں پر چراغ اُٹھائے نقاب ظلمت میں جھلملائیں
نظر کے اندھے سیاہ مرقد میں روشنی کی شعاعیں اتریں

ندا نے کھینچی طناب گیتی
طلسم سنگ و سکوت ٹوٹا
حصار شہر ہوس میں دشت ندا بلندی پہ جگمگایا

O

بہت بلندی سے جھملاتے ستارگاں کی طرح لرزتی شعاعیں سرگوشیوں میں بولیں
وہ جس کے خوں میں ہے لفظ زندہ
ہے جس کے سینے میں کرب نغمہ
وہ لفظ و معنی کی غیر مرئی شعاعیں تھامے
صدا کی امواجِ برق آسا سے خود کو باندھے
تو میں دکھاؤں صدا کے ہر پل بدلتے جلوے
تو میں دکھاؤں قریب سے اُن نواؤں کے جگمگاتے چہرے
جو دوٗر سے چھب دکھا رہے ہیں
مری صدائے گریز پا نے ندا کے اس سلسلے کی انجانی ڈور تھامی
تو میں نے خود کو طلسمِ سنگ و سکوت شہر ہوس سے اوپر کو اٹھتے دیکھا
حصار و دیوار و در بتوں کو لپیٹے باہوں میں چپ کھڑے تھے
کسی کے دل میں شرار جاگا نہ لفظ مہکا
کہ پتھروں کی سماعتوں پر لگی تھیں مہریں
کہ پتھروں کے سیاہ سینے میں اک خلا تھا
خلا میں بے حس سکوت پہرے پہ مستعد تھا
میں اپنی بچھڑی صدا سے لپٹا اکیلا دشتِ ندا کی موجوں پہ اڑ رہا تھا

(2)

(شجرِ صدا کے خوشہ چیں)

صداؤں کے وہ چمکتے چہرے جو دوٗر سے جھلملا رہے تھے
قریب آئے تو نور ان میں ہے اور نہ شعلہ

تمام چہرے تمازتِ مہرِ آتشیں سے جھلس رہے ہیں
نگہ کی کرنوں میں گرد سی اڑ رہی ہے
آنکھوں میں نور سویا ہوا پڑا ہے
بدن تڑختی چٹختی دھرتی کی طرح بنجر اداس ویراں
وہ آگ جس نے کبھی رگوں میں لہو کے شعلے جگائے ہوں گے
بھڑک بھڑک کر رگوں کے اندر ہی سو چکی ہے
وہ گرم روشن پگھلتا لاوا جو ذہن و دل سے اچھلتا ہوگا تو زندگی تابشِ تمنا میں ڈھلتی ہوگی
اب ان کے لاغر برہنہ جسموں پہ راکھ بن کر جما ہوا ہے
اس اپنے اندر کی راکھ میں کچھ سنہرے ذرّے چمک رہے ہیں
جو سونا چاندی کبھی بدن نے نگل لیا تھا
مریض چہروں پہ زخم بن کر دہک رہا ہے
وہ انگلیاں جن میں آگ سے کھیلنے کی جرأت کبھی تھی زندہ
اب ان کی پوریں جھلس کے بے جاں خمیدہ شاخوں کی طرح بے برگ و بر ہوئی ہیں
وہ ہونٹ جن سے کبھی زمانے کو زندگی کا سبق ملا تھا
اب ایسے ویراں ہیں جیسے ان پر قضا نے کر دی ہو مہر اپنی
زباں جو پہلے مسیح و خضر و کلیم و بدھ کے دہن سے حق بن کے بولتی تھی
اب اس پہ چھالے پڑے ہوئے ہیں
ٹپک رہا ہے سیاہ گندہ لعاب اس سے
دہن جو پہلے کبھی نسیم و صبا کو رقصِ بہار کے گُر سکھاتا ہوگا
اب اس میں بادِ سموم یوں چل رہی ہے جو ہڑ سے جیسے گزرے ہوا کا بوجھل کثیف جھونکا

O

صداؤں کے یہ نحیف، لاغر مریض چہرے
بدن میں ایسے جڑے ہوئے ہیں کہ جسم کو روح سے ہے شکوہ

جذام خوردہ بدن پہ تہمت ہے زندگی کی
اجل گرفتہ زخموں پہ الزام روشنی ہے
گلو گرفتہ زباں پہ تہمت ہے نغمگی کی
خلا میں ذہنوں کے فکر و احساس کا سمندر سراب ظلمت بنا ہوا ہے
دلوں کے اندھے گڑھے میں جذبات کا لہو بھی نہیں رہا ہے

O

میں اپنی رہبر صدا کا دامن جھٹک کے اُس سے یہ پوچھتا ہوں
یہی وہ دشتِ ندا ہے جو مجھ کو نور بن کر بلا رہا تھا؟
یہی وہ دشتِ ندا ہے جس کی طرف لپکتی رہی ہے صدیوں سے زندگانی؟
یہی وہ دشتِ ندا ہے جس کی حسین روشن صدائیں شہر ہوس میں پاتی رہیں شہادت؟
یہی وہ دشتِ ندا ہے جو میرے خوں میں صدیوں سے جاگتا تھا؟
یہی وہ دشتِ ندا ہے جس سے ازل ابد کی حدیں ملی ہیں؟
یہی وہ دشتِ ندا ہے جو حرفِ 'کن' کا تنہا امیں رہا ہے؟
یہی وہ دشتِ ندا ہے جس نے اٹھایا بارِ امانتِ حق؟
یہی وہ دشتِ ندا ہے جس کی طرف تو مجھ کو بلا رہی تھی؟

O

مرے سوالوں سے تنگ آ کر
کہا یہ رہبر صدا نے مجھ سے
تو ان صداؤں کے چہرے اچھی طرح سے پڑھ لے
ہر اک صدا نے جو ڈھیر لفظوں کے چن رکھے ہیں
تو پہلے ان کے چمکتے رنگوں بھڑکتے پیراہنوں کو پڑھ لے
ہے عین ممکن
یہیں کہیں تیرے سرد مردہ چمکتے الفاظ بھی پڑے ہوں

تو اُن کو اپنی صدا کی جھولی میں پھر سے بھر لے
تو میں تجھے آخری حدوں تک دکھاؤں دشتِ ندا کی وسعت
ابھی تو ہے تو سوادِ شہرِ ندا کی حد میں

O

میں لڑکھڑاتا، برہنہ سر، دھوپ میں کھڑا ہوں
زباں پہ چھالے پڑے ہوئے ہیں
لبوں پہ کانٹے اُگے ہوئے ہیں
لہو کفِ پا سے بہہ رہا ہے
صدائے رہبر کشاں کشاں لے چلی ہے مجھ کو
ہر ایک چہرہ خود اپنے لفظوں کے ڈھیر میں گم، گزر رہا ہے نظر سے میری

(3)

(محققانِ مردہ خُو)

سوادِ دشتِ ندا کے صفحاتِ اولیں پر
کھڑی ہے دیوار اک پرانی
لگے ہیں جس کی شکستہ اینٹوں کے درمیاں کچھ قدیم کتبے
لکھے ہیں جن پر چمکتے لفظوں میں نام اگلے سخن وروں کے
پڑے ہیں قدموں میں جن کے انبارِ لفظ و مضموں — خزاں زدہ برگ و بر کی صورت
یہ وہ شجر ہیں نمو کی قوت نے جن کو صدیوں حریفِ دورِ خزاں بنایا
بلندی جن کی ہے اپنے اندر کی آگ کا اک امر منارہ
جو پھول ان پر کھلے ہوئے ہیں وہ ان کے خونِ جگر سے پاتے رہے ہیں نکہت کی موج، رنگوں کی آبیاری
خزاں کے جھونکوں نے واران پر کیے ہیں صدیوں
تو وہ گل و غنچہ و ثمر جو لہو کی گردش سے کٹ چکے تھے

گرے پڑے ہیں اب ان کے قدموں میں سر بہ زانو، اجل رسیدہ
خزاں چشیدہ

ہر ایک کتبے کے زیرِ پا اک ہجومِ حیراں کھڑا ہوا ہے
جو لفظ اوپر سے گل کے گرتا ہے اُس کو ہونٹوں سے تھام لیتا ہے کوئی بڑھ کر
تھپیڑے کھا کر ہوا کے شاخوں سے ٹوٹ جاتا ہے جو کوئی پھل
تو اس کے خالی بدن کی جانب لپکتی ہیں اَن گنت زبانیں
کسیلا، کڑوا، سڑا ہوا ذائقہ لبوں سے ٹپک رہا ہے
جو پھول گرتا ہے رنگ و بو سے چھڑا کے دامن
تو کھو کھلے پیرہن کو اس کے ہوائیں کرتی ہیں ریزہ ریزہ
گداگروں کی نگاہیں چنتی ہیں پتی پتی
غبارِ رنگ اس طرح سے اڑتا ہے کشمکش میں
کہ خالی آنکھوں میں گرد بن کر کھٹکنے لگتے ہیں ریزۂ گل
گلوں کی خوشبو، پھلوں کی دولت تو ہاتھ آتی نہیں کسی کے
جھڑے ہوئے زرد و سرد پتوں کے ڈھیر حاصل ہیں کشمکش کا
انھیں کو چن چن کے گوندھتے ہیں خیالی دھاگوں میں لوگ بیٹھے
ہر اک کی خواہش کہ دوسرے سے جھپٹ لے گلدستہ مضامیں
ہر اک کو ضد ہے کہ اس کے سر پر ہی تاجِ معنی رکھا ہوا ہے
مگر معانی شکستہ کتبوں کی اُن دراڑوں میں منہ چھپائے ہوئے پڑے ہنس رہے ہیں پیہم
جہاں تلک سائلوں کے دست و زباں کی نہیں رسائی

O

گداگرانِ شکستہ پا کا ہجوم پیچھے ہی رہ گیا
بلند کتبوں کی پشت پر اک وسیع میداں پرانی قبروں کے بوجھ سے تلملا رہا ہے
یہ قبریں وہ ہیں جنھیں میسر نہیں ہیں کتبے

سرہانے طاقوں میں جلنے والے دیوں کا حاصل دھوئیں کا دھبّا
مجاوروں کا لباس پہنے ہوئے بھٹکتا ہے غولِ صحرا
تمام قبروں کو چومتا ہے
کبھی جو کتبے نہیں لگائے گئے ہیں، ان کی تلاش میں ہے
کبھی جو شمعیں نہیں جلائی گئی ہیں، ان کو سمیٹتا ہے
کبھی جو آنکھیں نہیں بچھائی گئی ہیں، ان کو کریدتا ہے
کبھی جو زندہ نہیں رہے ہیں، وہ لفظ قبروں پہ لکھ رہا ہے
کبھی جو روشن نہیں رہی ہیں وہ شمعیں طاقوں میں ڈھونڈتا ہے
کبھی نہ گرمی رہی ہیں جن میں، وہ سانسیں مردوں سے مانگتا ہے

O

کہیں کہیں ان مجاوروں کے ہجوم میں گورکن کھڑے ہیں
سروں پہ بوسیدہ پگڑیاں ہیں غبار خوردہ
لبوں پہ مونچھوں کے بال سانسوں کے زیر و بم سے اُلجھ رہے ہیں
اداس چہرے پہ جھاڑ جھنکاڑ داڑھیاں ہیں
گلے سے ٹخنے تلک لٹکتے ہیں لمبے کرتے
کھلے گریباں میں ہڈیوں سے گندھی ہوئی ہے سروں کے خالی شکستہ کاسوں کی خونی مالا
بجھے ہوئے حلقہ ہائے چشم شغال میں ہیں ہوس کے شعلے
لیے ہوئے استخوانی ہاتھوں میں بیلچے، پھاوڑے، کدالیں
شکستہ قبروں کا بخیہ بخیہ ادھیڑتے ہیں
گلا سڑا جو کفن بھی ہاتھ آ گیا تو خوانِ کرم کا تازہ صحیفہ جانا
کسی مزار کہن کی مٹی سے کرم خوردہ ورق ملے تو انھیں زبانِ قلم سے چاٹا
کسی لحد میں شکستہ ڈھانچوں کی ہڈیاں ہی ملیں تو ان کو قبا میں ٹانکا

○

بچھائے بوسیدہ کاغذوں کے عریض دفتر
نظر پہ ٹوٹی کمانیوں کے کثیف چشمے لگائے
کانوں پہ اپنے رنگیں قلم جمائے
جھکے ہوئے منشیانِ کہنہ حساب قبروں کے مال و دولت کا لکھ رہے ہیں
مجاوروں کو گلہ ہے دزدِ کفن سے
دُزدِ کفن کو شکوہ ہے گورکن سے

(4)

(ابلاغ)

میں پہرہ دارانِ علم و دانش کی دسترس سے پرے
صدائے کوہِ ندا کے شہپر سے اُڑ رہا ہوں
حدودِ شہرِ ندا میں آخر پہنچ گیا ہوں
رسالہ دارانِ علم پیچھے سے بھونکتے ہیں
مگر صدائیں اب ان کی گردو غبارِ پس ماندگی میں ڈوبی
خود ان کے کانوں سے لڑ رہی ہیں

کسی نے چپکے سے میری آنکھیں
مرے لب و گوش و ذہن و دل اور زبان دے دی ہے مجھ کو واپس
مرا تکلم، مری سماعت، مری بصارت، مری چھٹی حس
تمام بیدار ہو چکی ہیں

جو زنگ ان پر لگا ہوا تھا، اُتر چکا ہے

○

میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں قدم قدم پر ندا کے جلوے

زباں پہ میری اتر رہی ہیں وہ آیتیں
جو ندا کی شکلوں میں فرق کرنا سکھا رہی ہیں

○

ندا کے روشن نگر میں
ہر روشنی سے الفاظ پھوٹتے ہیں
تمام رنگوں میں ان کے معنی جھلک رہے ہیں
خطوط واشکال اور دوائر
حروف واصوات اور ضمائر
نظر کی جنبش
قدم کی لغزش
گلے کی ہلکی سی گنگناہٹ
لبوں کی مدھم سی تھرتھراہٹ
بدن کی حرکت
بدن کے اعضا کا رقصِ خفتہ
ہر ایک زیر و بم صدا میں
ہزار معنی تڑپ رہے ہیں
سماعت اپنے وسیع دامن میں اُن کو چنتی
بصارت ان کو سمیٹتی ہے
زبان اُن کو دماغ و دل سے گزارتی ہے
دماغ و دل اپنی اپنی سطحوں پہ ان کو رکھ کر
تہیں معانی کی کھولتے ہیں
دماغ و دل کی تمام سطحوں پہ رنگِ معنی جدا جدا ہے
دماغ یا دل کی سطح پر معانی

جو نقش چھوڑیں قبول کرو
مکمل ابلاغ کی تمنا
سرشتِ معنی کی ناشناسی ہے
اور نامحرمی ہے فن کی

O

نامحرمانِ الفاظ کے لیے مرگ
معانی
لاف و گزاف دانش کے دعوے داروں پہ منکشف ہوں
تو پستیاں کرسیوں کی ظاہر ہوں ایک پل میں
تو لفظ کو پوجتے لبوں پر سکوت مہر دوام کر دے
تو برتری کے تمام دعوے اندھیرے سینوں کی قبر میں منہ چھپا لیں اپنا
تو فضل و علم و کمال کے یہ عمامے، جبے، عبا، قبا، سب زمیں پہ لوٹیں
کہ ردی کاغذ کے چیتھڑوں سے زیادہ وقعت نہیں ہے ان کی
معانی خود کو گزاف فضل و کمال و دانش سے بے تعلق کیے ہوئے ہیں
فضیلتوں کے عمامے معنی کو سر میں آنے سے روکتے ہیں
عبا، قبا کی بلند پستی کی دسترس میں نہیں معانی
مناصب اقتدار و دولت
مراتبِ اختیار و ثروت
علاقہ رکھتے نہیں معانی کی سرحدوں سے
کہ بھیک معانی کی مانگتے ہیں ہمیشہ کو و ندا کے اُفتادہ پتھروں سے

(5)

(جزیرۂ سخن وراں)

میں آ کے شہر ندا میں بھی دیکھتا ہوں
کچھ ناشناسِ معنی

جو پہرہ دارانِ علم و دانش کی کرسیوں کے حضور
ذہن و دل و نظر رہن رکھ چکے ہیں
اور ان کی قیمت میں
گونگے تتلاتے تاجرانِ زباں سے
عجزِ بیاں کی تھوڑی سی بھیک پا کر
بزعم خود ہیں کلیمِ لفظ و مسیحِ معنی
دماغ میں تمکنت کا گرد و غبار بھر کر
پرانے لفظوں کا رنگ دھو کر ملمع کر کے
شکستہ اور کھوکھلے علائم کا رنگ و روغن لبوں پہ مل کر
دلوں کی تاریکیوں کو روشن چمکتے لفظوں کا روپ دے کر
حصارِ شہرِ ندا میں درّانہ گھومتے ہیں
معانی
ان سارقانِ لفظ و بیاں کو زنجیرِ شوقِ شہرت سے باندھ کر
اک حسیں جزیرے میں قید کرتے ہیں
تا کہ دزدانِ فن کا آ کر تماشہ دیکھیں ندا کے طالب

O

جزیرۂ سارقانِ فن کے چہار جانب
چھلک رہی ہے وہ جھیل
دامن میں جس کے ساتوں سمندروں کا ہے تھوڑا تھوڑا سا آب شامل
ہر اک سمندر کا پانی اپنے علیحدہ رنگ کی بدولت
ہے باقی چھ پانیوں کا دشمن
یہ سات رنگوں کی جھیل اپنے اپنے جدا جدا پانیوں کی موجیں سمیٹتی ہے
تو ناچتا ہے جزیرہ موجوں کی کشمکش میں

رکے ہوئے پانیوں میں اٹھتا ہے زم طوفاں
لپیٹ لیتا ہے جو جزیرے کو چار سو سے
ہوائیں طوفاں کی ایک حد میں ہمیشہ چلتی ہیں
سمتیں ان کی مقررہ ہیں
ہوائے دوراں کی تیزی وتندی وتباہی
جزیرے والوں تلک پہنچتی نہیں
کہ ان کا حصارِ آبی قبول کرتا نہیں ہواؤں کی تیزگامی

O

جزیرہ رنگیں دھند لکا اوڑھے
تمازتِ مہرِ آتشیں سے نہیں ہے واقف
زمیں یہاں کی تصوراتی ہے
جو جھلتی نہیں کبھی بھی
مکاں یہاں کے ہیں شیشہ گر کے فنِ لطیفہ کے شاہ پارے
یہاں کی سڑکیں یہاں کی گلیاں
ہیں ست رنگے کاغذوں کے نقشے
بگولے اٹھتے نہیں یہاں سے
یہاں پہ گرد وغبار ڈھونڈے سے بھی کسی جا نہ مل سکے گا
یہاں کسی کے قدم کے نیچے زمیں نہیں ہے
یہاں کسی کے بھی سر پہ وہ آسماں نہیں ہے
جو پیستا ہے زمین والوں کو روز و شب ماہ و سال پیہم
یہاں زماں ہے وہ ٹھہرا دریا
جو سیکڑوں ہی برس سے ساکت پڑا ہوا ہے

سخنورانِ جزیرہ ہیں گردشِ زماں وزمیں سے عاری
یہ اپنی تخیل کے جزیرے کو مانتے ہیں خلاصۂ کائناتِ انساں
یہ اپنے اصنامِ ذہن ہی کو تراشتے ہیں سنوارتے ہیں
اور ان کی پوجا میں روز و شب کا ہر ایک لمحہ گزارتے ہیں
یہ اپنی انسانی روح و صورت سے اجنبی ہو چکے ہیں
اپنے دماغ و دل سب حسین دھندلکوں میں کھو چکے ہیں
یہ اپنے سارے حواس نہرِ شرابِ فن میں ڈبو چکے ہیں
اب ان کو اپنے اور اپنے فن کے علاوہ اطراف کی خبر ہے، تو صرف اتنی
کہ ان کا خود بیں و خود نما فن کچھ ایسے آئینے مانگتا ہے
جو صرف ان کی ہی شکل کا انعکاس کرتے رہیں ہمیشہ
اور آئینوں کی قطار اپنے حضور رکھ کر
یہ فن کے نرم و لطیف سانچوں میں خود سنورتے رہیں ہمیشہ
تمام انساں وہ آئینے ہیں
جو ان کی شکلوں کو اپنے سینوں میں بند کرلیں
جو ان کی باتوں کو اپنے ذہنوں پہ نقش کرلیں
جو ان کی صنعت گری کو روحوں میں جذب کرلیں
جو ان کے ڈھالے ہوئے ہیولوں کو اپنی آنکھوں میں بند کرلیں
سخنورانِ جزیرہ رہتے ہیں آئینوں کے نگر میں
آئینے ڈھالتے ہیں
اور آئینوں میں خود اپنی صورت کو پوجتے ہیں
یہ رکھ کے آئینے اپنے آگے
خود اپنے عکسوں کو سجدہ کرتے ہیں دیکھتے ہیں کہ عکس بھی کر رہے ہیں ان کے حضور سجدہ
تو ساری دنیا کو اپنا سجدہ گزار و مخلوق جانتے ہیں

خیالی عکسوں کی اس پرستش میں خود کو معبود مانتے ہیں

سخنوروں کو یقین محکم
"کہ ان کی دنیائے ذات ہی سے زماں مکاں کی حدیں ملی ہیں
وجود برحق ہے ذات ان کی
ہے اور جو کچھ بھی نقشِ باطل
وجود ان کا ہی امر کن ہے
ہیں اور جتنے وجود دنیا میں حرفِ معدوم و منتشر ہے
ہیں آدمی وہ ہیولے بارِ وجود سے جو بے ہوئے لڑکھڑا رہے ہیں
وہ دستِ محنت زمیں کے سینے کو جو ٹٹولے
ہے رمزِ تخلیقِ فن سے جاہل
جو اپنا خون اور پسینہ ٹپکا کے خشک مٹی کو گوندھتا ہے
جو اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکرِ بے فیض میں مگن ہے
یہ جانتا ہی نہیں کہ فن وہ عظیم دولت ہے
جو شکم کی ضرورتوں کو مٹا کے انسان کو ماورائی وجود دیتی ہے
اس کو انسانی بندھنوں سے نجات دیتی ہے
ایسی دنیا میں لے کے جاتی ہے، خیریت ہے جہاں ہمیشہ"

یہ خیریت، عافیت کے نغمہ گرانِ خفتہ حصارِ گم گشتگی کے قیدی
یہ ایسے شہرِ طلسمِ ظلمات کے ہیں شہری
جہاں نہ فکرِ معاش ہے اور نہ فکرِ دوراں
جہاں نہ شر ہے، نہ خیر ہے، اور نہ کوئی حق ہے، نہ کوئی باطل
جہاں معیشت مآل سے ہے تہی

سیاست، سماج، جہدِ بقا، تباہی، صعوبتیں، ابتلا، شہادت
مجردات خیال ہیں، اور خیال دنیا سے بےخبر ہیں
سخنورانِ جزیرہ لفظوں کے شعبدوں کو سخن کا عنوان مانتے ہیں
علامتوں کو علاحدہ کر کے ان کے معروضِ خارجی سے پھر اپنی نظموں میں ٹانکتے ہیں
وہ استعاروں کو توڑ کر ریزہ ریزہ معنی کو پیٹتے کوٹتے ہیں اتنا
کہ ان کا سونا بھی راکھ ہو کر نظر سے گم ہو
بیان کے تجربے کی خاطر زبان کو یوں مروڑتے توڑتے ہیں پیہم
کہ ان کی گرہوں کو کھول دو تو سکوت کا شور وغل ہی نکلے سخن کا حاصل

**(6)**

**(واژگوں)**

سکوت کے شور وغل میں گم ہے سخن کی دولت
خیال کے کاغذی درختوں کی نرم شاخوں سے اُلٹے لٹکے ہوئے سخنور
سمجھ رہے ہیں کہ آسماں سے بلند ہیں وہ
نجوم و مہر و قمر ہیں ان کے قدم کے نیچے
زمین ان کی نظر سے اوجھل ہے
اور زمیں کے تمام باسی حقیر کیڑے ہیں، رینگتے ہیں جو پستیوں میں
سمجھ رہے ہیں
ہر ایک رشتہ الٹ گیا ہے
ہر ایک شے واژگوں ہوئی ہے
ہر ایک رستے نے اپنے رخ کو بدل دیا ہے
اگر کوئی تند و تیز جھونکا کہیں سے آجائے بھولا بھٹکا
خیال کے کاغذی درختوں کو توڑ ڈالے
زمیں پہ گرتے ہیں منہ کے بل اور بزعمِ خود آسماں کے تاروں سے کھیلتے ہیں

زمین ان کو اٹھا کے سیدھا کھڑا کرے تو یہ جانتے ہیں کہ سارا منظر الٹ گیا ہے
وہ سارے منظر کو اپنی الٹی نظر سے سیدھا نہ کرسکیں تو
نئی خیالی بلندیوں پر اُگائے اشجار وا ہمہ پر لپک کے چڑھتے ہیں
پھر سے اُلٹا لٹک کے دنیا کو دیکھتے ہیں
اور اپنے اس تجربے کو لفظوں کے واژگوں ساغروں میں پیہم انڈیلتے ہیں
وہ لفظ و معنی کے سارے رشتے اُلٹ کے خوش ہیں
کہ ان کی باتیں زمین کے بے وقوف باسی
(جو زندگی کے جھلستے میداں کے خارزاروں میں اپنے پیروں سے چل رہے ہیں)
کبھی نہ شاید سمجھ سکیں گے
سکوت بھی ان کا ہے اندھیرے میں غرق ایواں
کلام بھی ان کا ہے ورق در ورق خموشی کا ایک بنجر اداس میداں

(7)

(منطق الطیر)

سکوت کے شور وغل میں گم ہے سخن کی دولت
مراقبے میں ہے غرق برسوں سے اک سخنور
کروڑ ہا رنگ رنگ لمحوں نے اُڑتے اُڑتے سدا یہ دیکھا کہ اس کی آنکھیں مندی ہوئی ہیں
ہزار ہا روز و شب نے اس کے حواس کو جب چھوا تو پایا ہے ان کو مختل
قریب ہی اس کے ایک طوطا قفس میں بیٹھا پکارتا ہے
کہ یہ سخن ور ہے ذات کے اُس اندھیرے جنگل میں راہ پیما
رشی، منی، اولیا، پیمبر جہاں پہنچ کر سراغ پاتے ہیں زندگی کا
ہے سبز طوطے کی سرخ منقار میں جریدہ
لکھا ہے جس پر کہ یہ سخنور ہے عارف ذات، اس کا کلام سن لو
قفس میں بیٹھا ہوا پرندہ جریدۂ شب کے پیلے کاغذ اُلٹ الٹ کر سنا رہا ہے
سیاہ حرفوں میں لکھا گنج مخ کلام شاعر

○

(غزل بعنوانِ ذات)

سمٹ گیا ہے مری نظر میں سیہ ظلمات کا اندھیرا
ہے میرے اندر بھی میرے باہر بھی میری ہی ذات کا اندھیرا
حیات کا بیکراں سمندر شعور کی تہہ میں چیختا ہے
میں جذب کرتا ہوں قطرہ قطرہ وجود میں رات کا اندھیرا
زوال، ذلت، ظہور زائد، زمین ضیغم، ذخیرہ زخمی،
کسی طرح سے بھی لفظ جوڑو گھٹے گا کب بات کا اندھیرا
میں ہار کر بھی شکستہ خاطر، میں جیت کر بھی شکستہ خاطر
ہے فتح کی روشنی میں شامل حریف کی مات کا اندھیرا
بکھرتا ہے لمحہ لمحہ میرا وجود دن بھر کی کشاکش میں
مجھے دوبارہ سمیٹ لیتا ہے، جمع کرتا ہے رات کا اندھیرا
اندھیرے کمرے میں کالی بلی کی چشمِ روشن کلام شاعر
چراغ ہنستا ہے یا بھڑکتا ہے، خود مرے ہات کا اندھیرا

○

(منطق الطیر)

اندھیری آیاتِ ذات مجھ پر اُتر رہی تھیں
مری سماعت میں پگھلا سیسہ ٹپک رہا تھا
کہ ہر طرف سے بہت سے طوطوں کی دادِ تحسیں کے شور و غل نے
مرے مذاقِ سخن کو اس طرح سے جھنجھوڑا
میں چونک اٹھا
وہ سر جو زانو پہ تھا، اُٹھا تو عجیب منظر نگاہ میں تھا
طیورِ نغمہ طراز پنجروں سمیت اُڑ اُڑ کے آ رہے تھے ہر اک طرف سے

ہر اک کی منقار اپنے پر سے جریدۂ شب نکالتی تھی
سیاہ اوراق کے اندھیروں سے کالے الفاظ گر رہے تھے
رٹے رٹائے، بجے سجائے، بنے بنائے یہ لفظ مجھ پر برس رہے تھے
مری نگاہوں کے آگے لفظوں کا ایک پردہ تنا ہوا تھا
مری سماعت سے کھوکھلے چیختے سخن کا سمندر آ کر الجھ رہا تھا

○

کسی طرف سے فرار کا راستہ نہیں تھا
مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا
کہ میں بھی اک بند اندھا بے روزن و دریچہ سیاہ کمرہ بنا ہوا ہوں
اگر نہ ان کھوکھلی صداؤں کا تنگ و تیرہ حصار ٹوٹا
تو میں ابد تک رہوں گا زندانی حصار طلسم ظلمت
کبھی نہ کوہِ ندا کی سب سے بلند چوٹی پہ جا سکوں گا
کبھی نہ تجی ندا کے طور تجلیاتِ سخن سے نظریں ملا سکوں گا

○

سخن نے کی میری دستگیری
صدائے کوہِ ندا کی بجلی نے آگے بڑھ کر حصار توڑا
تمام لفظوں کے تیرہ پردے جلا دیے اور تمام دیواریں بھسم کر دیں
تھے اب وہ دھونی رمائے سادھو، نہ ان کے طوطے
نہ ان کے کاغذ، نہ ان کی منقار، اور نہ پنجرے
بس اک تجلی برقِ معنی سے راکھ بن کر سب اڑ گئے تھے
جزیرہ الفاظ کے سمندر کی تہہ میں گم تھا
ندا کی سب سے بلند چوٹی کے زیرِ سایہ میں آ گیا تھا

'اظہار' (پہلی کتاب)، ترتیب: باقر مہدی، فضیل جعفری، جنوری-اپریل 1975

# دُعائیں

## آدمی کی دُعا

اے خدا
یہ بھی تیرا کرم ہے کہ تو نے
مسلّط کیا ہے ہمارے سروں پر
اُنھیں جو تجھے صرف ہونٹوں ہی سے مانتے ہیں
مگر جتنے حشراتِ ارضی ہیں
مسجود و معبود اُنھیں مانتے ہیں

خدایا یہ حشراتِ ارضی
یہ حشراتِ ارضی کے سجدہ گزاروں کی دُنیا
مجھے ایسی دنیا میں تو نے
بنایا ہے انساں
یہ ہے تیرا احساں
کہ ہے میرا نقصاں
جو تیری رضا ہو نہ کرنا مجھے نادمِ واپسیں جنسِ ارزاں

# آگہی کی دُعا

اے خدا، اے خدا
میں ہوں مصروفِ تسبیح و حمد و ثنا
گو بظاہر عبادت کی عادت نہیں ہے
رند مشرب ہوں، زہد وریاضت سے رغبت نہیں ہے
مگر جب بھی چلتا ہے میرا قلم
جب بھی کھلتی ہے میری زباں
کچھ لکھوں، کچھ کہوں
تیری تخلیق کا زمزمہ مدّعا، منتہا
حرف بجھ کر بنیں لفظ تو کرتے ہیں تیری حمد و ثنا

یا خدا، یا خدا
میرے اطراف ہیں پیٹ خالی، بدن نیم جاں
کوئی تکتا ہے جب میرا دستِ تہی
شرم آتی ہے مجھ کو خدائے غنی
سوچتا ہوں میں اپنی زباں رہن رکھ دوں کہیں
رزق سے خالی پیٹوں کو بھر دوں
اور اپنے لیے تھوڑی آسائشیں مول لے آؤں بازار سے
اپنے بچوں کی ضد پوری کر دوں
جو واقف نہیں ہیں معیشت کے انداز و رفتار سے
پھر یہی سوچتا ہوں
خدا، اے خدا

کیا زباں رہن ہو کر بھی تیری اطاعت کرے گی
کیا قلم بِک کے بھی نام تیرا ہی لے گا
دوسروں کو خدا مان کر
وہ نہ کرنے لگیں ماسوا کی بھی حمد و ثنا

اے خدا، اے خدا، ہے دُعا
یہ قلم، یہ زباں
آخری سانس تک
کہتے، لکھتے رہیں
لا الٰہ

## تشنگی کی دُعا

اے مُسبّب، جہانوں کے رب
تو ہی ہر چیز ہر بات کا ہے سبب
سُن رہا ہوں کہ وہ جو تری چشمِ عادل میں مجھ سے بھی کم تر ہیں
کہتے ہیں یہ
خلق کے ہیں وہ روزی رساں

سیر و سیراب کا، تشنگی کا بھی ہے تو ہی رب
میں کہ ناچیز اک ذرّۂ دشتِ تشنہ لبی
پوچھتا ہوں میں خاکم بہ لب، با ادب
کیا یہ تو ہی ہے جس نے دیا ہے خسیسوں کے ہاتھوں میں تقسیم کا انتظام؟
تو ہے مبداءِ جود و کرم

خلق کے واسطے جن کو تو نے بنایا تھا دریائے فیضِ رواں
مصلحت کیا تھی؟ ہم تشنگاں کا امام
صرف تیری رضا سے رہا ساتھ اطفال کے تشنہ کام
یہ کیا عدل ہے شمر سے مانگنے جائیں ابنِ علی ایک جام
حُرملہ قطع کرتا ہے تیرِ سم خوردہ سے تشنگی کا کلام
اور پھر تشنگی کا گلا کٹ کے بھی شکر کرتا ہے تیرا ہی صبح و شام
اے خدائے ذوالاکرام
اعلیٰ تر از ہر مقام
ساقیِ کوثر اور ابنِ ساقیِ کوثر پہ میرا اسلام
یہی مصلحت ہے، رضا ہے تیری
تو وہ صبر اور حوصلہ دے
علی اور ابنِ علی کے غلام
اپنے سرمایۂ تشنگی میں رہیں شاد کام
ہر اک تشنگی کو عطا ہو حُسینی صداقت کا جام

(22 اگست 1974)

## سفر کی دُعا

میں یہاں قید ہوں
میری واماندگی نے مرے پاؤں میں ایک زنجیر ڈالی ہے
ماحول نے میری زنجیر میں اور کڑیاں بڑھا دیں
رشتۂ روح و جاں آج تک قفلِ زنجیرِ پا
فکرِ نانِ جویں پر کترتی ہے پرواز کے
پا پیادہ نہ طے ہو سکیں گے کبھی فاصلے دور سے آتی آواز کے
اک جزیرے میں محصور ہیں حوصلے سب تگ و تاز کے

مجھ سے چل کر مجھی تک پلٹ آتے ہیں سایے میری ہی آواز کے

پائے وحشت نہیں لنگ
(جیسا جزیرہ پرستوں کا ہے)
بزمِ امکاں نہیں تنگ
(جس طرح اندھی انا کے جزیروں کی ہے)
کرۂ ارض تو ایک سیارہ ہے
نیم روشن خلا میں مُعلّق
نوکِ سوزن پہ اک قطرۂ خوں گرفتہ
کیا مرے شوق کے پاؤں اس نوکِ سوزن سے بھی ہیں حقیر؟
کیا مری جرأتِ آرزو نیم روشن کُرے سے بھی ہے کم مستنیر؟

نیلے، اُودے، ہرے، گہرے دھانی، کالے چمکتے ہوئے پانیوں کے سمندر
ہیں میری نگاہوں کے بھی منتظر
سخت اور نرم خشک اور نم اونچی نیچی زمینوں کے زینے
کہیں سبز پوش اور کہیں گل بدامن
کہیں صرف بے رنگ گرد و غبار
اور کہیں ساتوں رنگوں کی آمیزشوں کے مصوّر ورق
یہ تنوع کے منظر بھی میری نگاہوں کے ہیں منتظر
کارواں کارواں شاہراہوں پہ چلتے ہوئے زندہ شاداب روشن بدن
تنگ سیلے سیہ قبر آسا مکانوں میں
بیٹھے ہوئے سرنگوں رنج و درد و تعب
ظلم کے آتشیں خون آلودہ ایوانوں میں
جبر و قہر و غضب

میرے چشم و لب و دست و پا کے بھی ہیں منتظر
حوصلے زیست کرنے کے میری دُعا کے بھی ہیں منتظر

عشق کے مکتب اور علم کے مدرسے
مقتل اور میکدے، سوچ کے سلسلے، جہد کے قافلے
ہوں جہاں بھی
مرے ذہن و دل کی ضیاؤں کے ہیں منتظر
نطق و حرف و صدا کے ہیں جتنے بھی رنگ
آرزو کی امنگ
زندگی کی ترنگ
عشق اور غم کے ڈھنگ
میرے لفظ و معانی کی رقصاں شعاعوں کے ہیں منتظر
یہ زمیں اپنی وسعت تلک
آسماں اپنی رفعت تلک

دے رہے ہیں صدا
پانیوں کے سمندر
زمینوں کے منظر
مرے منتظر ہیں
میں یہاں قید ہوں
اے خدا!
اس جزیرے کے محصور پانی میں بھی در کھلیں
ساحل آغوش کشتی کے لنگر کھلیں
میری زنجیر میں پر کھلیں

(9 نومبر 1975)

# مٹّی کی صدا

(مرحوم والدین کی رُوحوں کے نام)

زمیں آواز دیتی ہے
بدن میں روح اِس آواز کو سُن کر تڑپتی ہے
زمیں کی روح اپنے پیکرِ سنگ وسفالی میں مچلتی ہے
بدن زندان ہے اور دست و پا ہیں ہتھکڑی، بیڑی
گلا ہے طوق اور انفاس سم آلودہ شمشیریں
قدم ہیں قید خانے کے ستوں اور خواہشیں لوہے کی زنجیریں
زمیں کی روح ہو یا آدمی کی روح
قیدی یہ بھی ہے، وہ بھی
یہ قیدی مجلسِ تنہائی کے بے روزن و در، بے صدا، بے روشنی کمرے ہیں
عمریں ساتھ کٹتی ہیں
مگر اک دوسرے سے اجنبی ہیں
اِدھر ہے جسم اندھا گونگا بہرا

اُدھر بے چشم و گوش ولب بدن ہے

زمیں کی روح سے آواز آتی ہے
زمیں کے بطن میں پانی کے سوتے ڈھونڈنے والے
صدا سنتے ہیں پانی کی
چھٹی حِس گونگے بہرے اور اندھے جسم کی
سنتی ہے آواز اپنی مٹی کی

میں اُن روحوں سے واقف ہوں
جو میرے ساتھ ہی تھیں قیدِ زندانِ بدن میں
وہ مجھ کو دیکھتی سنتی تھیں، مجھ سے بولتی تھیں
میں ان کو دیکھتا سنتا تھا، اُن سے بولتا تھا
مگر بے روزن و در، بے صدا، بے روشنی کرے
کہاں کچھ دیکھتے، سنتے ہیں، کہتے ہیں
یہ سننا دیکھنا کہنا ہے لا حاصل
مگر وہ جو مرے اندر ہے، سنتی دیکھتی تھی
مجھ سے کہتی تھی
کہ ہم زندان روحیں اپنی مٹی کی صدائیں سُن رہی ہیں
وہ روحیں اپنی مٹی کے لیے بے تاب ہیں کب سے
بدن نے سیکڑوں میلوں کی دیواریں کھڑی کی ہیں
بدن کو توڑنا آساں کہ بے تابی ہی کافی ہے
مگر دیوار ہائے فاصلہ سدِ سکندر ہیں
زمیں کے فاصلے ہوتے ہیں جسموں کے سفر سے طے

تہی جیبی کو اسبابِ سفر کیسے میسّر ہوں
سفر کا شوق ہے آزاد
لیکن خود سفر زندانیِ قیدِ معیشت ہے
بدن تو بے معیشت تھے
زمیں کی روح نے برسوں پکارا
مگر زر ہی بدن کو بال و پَر دیتا ہے
زر آتا کہاں سے
جہاں سے ریزۂ زر ہو مہیّا
شکم کی آگ کھا لیتی تھی ہیزم کی طرح اُس کو
وہ روحیں بے زر و بے پَر
بدن میں قیدِ سدِّ فاصلہ سے سر پٹکتی تھیں
بہت بے تاب ہو کر اپنی مٹی کی صدائیں روز سنتی تھیں
بدن تو پھر بھی ہے کمزور، آخر ٹوٹ جاتا ہے
وہ روحیں فاصلوں سے ہار کر اپنے بدن ہی سے اُلجھتی تھیں
وہ آخر ایک دن قیدِ بدن کو توڑ کر نکلیں
زمیں نے تب سے اب تک بیس سے زائد ہی پھیرے
کر لیے ہوں گے مکمل اپنے سورج کے
وہ نامحسوس دیواریں کبھی کی گر چکی ہیں
جو مٹی کی صداؤں اور مقید روح کے مابین حائل تھیں
وہ دو مٹی کے تودے
جن میں لوگوں نے جتن سے جسم کی ٹوٹی ہوئی زنجیریں دفنا دیں
ہزاروں روز و شب کی گرد سے پامال ہو کر مٹ چکے ہیں
اُسی مٹی سے پوچھیں

جو ہزاروں کوس سے آواز دیتی تھی
تری محبوب روحیں کیا تری آغوش میں آرام سے سوتی ہیں اب تک
ہیں قبریں بے نشاں، پر روح کا کوئی نشاں ہوگا کہیں تو
کسی مٹی پہ چل کر فاتحہ پڑھ لیں
کہ مٹی کی صدا میں گم شدہ روحوں کی آوازیں بھی شامل ہیں
وہ آواز اب مرے صحرائے جسم و روح سے اٹھتی
مجھے لبیک کہتی ہے
ہے روحوں اور صداؤں کے تعاقب سے تسلسل زندگی کا
صدا مٹی کی نغمہ بھی ہے، سرگوشی بھی، آہٹ بھی
نمودِ غنچہ و گل بھی، ہوا کی سرسراہٹ بھی
جو اُگھوے جاگنے والے ہیں، ان کی کسمساہٹ بھی
یہ مٹی ایک کے بعد ایک کو آواز دیتی ہے
کبھی میلاد کے نغمے، کبھی نوحے کی صورت میں

کسی مٹی پہ چل کر فاتحہ پڑھ لیں
ثواب اس فاتحے کا زندگی ہی کو ملے گا

(5 دسمبر 1976)

# چہل سالِ عمرِ عزیزم گذشت

چہل سال عمرِ گریزاں سرابِ رواں کی طرح میرے پیچھے ہیں پھیلے ہوئے
سرابِ رواں قطرہ قطرہ مری تشنگی کا حساب
سرابِ رواں لہر در لہر نا سودہ خوابوں تمناؤں کا التہاب
سرابِ رواں کا سمندر ہے گرداب کے بعد گرداب کا پیچ و تاب
سرابِ رواں کھوکھلے ٹوٹتے صف بہ صف حلقہ در حلقہ سرکش حباب

زماں بے کراں
مصدر اس کا عدم، موج اس کی وجود
زماں نقطۂ آفرینش، زماں منبعِ ہست و بود
زماں سیلِ تخلیق و تعمیر و تخریب کا تار و پود
چہل سال فرد و اجتماؤں کی شمعوں کا لا انتہاؤں میں گم حلقہ در حلقہ معدوم دو د
حاضر و رفتہ، آئندہ کے مستقل سلسلے میں کسی فرد کی زندگی
صرف التزامِ موجود

اور تجسّسِ زندگی کربلائے وجود و بلاد
میرا قصہ سرابِ رواں
میری تقدیر پیمائشِ ریگِ دشتِ تپاں
زندگی کے فرستادہ قاصد ہوئے کوفۂ عہد و پیماں کے وعدہ گزیدہ شہید
ہے سرابِ رواں کے سفر میں ہر اک منزلِ نو بچھڑ جانے والوں کی اک داستاں
سدِّ راہِ سفر تو ہوئے شیخ و سالارِ فوجِ یزید
پر بلا قافلوں میں نہ ٹھہرا ایسا کوئی بھی فردِ فرید
کسی لحنِ حق کی جوانی نے بھی کی نہ جینے کی اک بار تاکید
اور آسمانوں سے اتری نہ عزمِ شہادت کی تائید
بس اک سرابِ رواں تھا
جسے آنے والے سفر کی سمجھتے رہے مرحلہ ہائے دشتِ سرابِ رواں
صرف تمہید......تمہید......تمہید

زندگی کی کتاب آج تک چند صفحاتِ تمہید ہیں
پردہ ہائے سماعت فقط لفظ ہی لفظ کی گونج ہیں
ہونٹ ناگفتہ، عریاں معانی کی قبروں کی تعویذ ہیں
ذہن اُلجھے خیالات کی قتل گہ
آنکھیں اشخاص و اطراف و امصار کو ایک ترتیب دینے کی
بجھتی ہوئی حسرتِ دید ہیں
چالیس سالِ عمرِ عزیزم گزشت

اس گزشتہ کی کیا داستاں
صرف رودادِ دشتِ سرابِ رواں

(2)

کربلا کی شہادت کا میں تذکرہ خواں
مگر کربلا میرا حصہ نہیں
قید خانے میں سقراط کے سچ کا سم میرے نوکِ زباں
سچ کے زندان کا زہر میرا نصیبہ نہیں
میں بھی کاندھے پہ اپنے اٹھائے ہوئے زندگی کی صلیبِ گراں
پر صلیبوں کے جنگل سے مجھ کو کسی نے ابھی تک پکارا نہیں
مجھ کو بھی سترہ سال کی عمر میں شہر سے، گھر سے، ماں باپ سے
چھوٹ کر ایک بن باس لینا پڑا
پر مرا لکشمن مر گیا اور بھرت گھر سے بے گھر ہوئے
اور پھر میں کبھی گھر کو لوٹا نہیں
میں بھی نروان کی کھوج میں سب علائق کی زنجیروں کو توڑ کر چل پڑا تھا کبھی
خواہشوں کے علائق مگر پاؤں سے ایسے لپٹے ہوئے ہیں کہ نروان کا
کوئی رستا نہیں

تین رائل بری آتما بن گئے
اور یشودھا کے در پر گیا بن کے سائل تو دامن مرا اُس نے چھوڑا نہیں

میں نے خلوت کے غاروں میں عرفانِ نفس وخدا کے لیے کی ریاضت بہت
منقبت، نعت اور حمد پر کی قلم نے مشقت بہت
پر جرا دل کا، اِقرا باسم کی آیت سے گونجا نہیں
مکتب اور مدرسے، آرٹ کے بُت کدے، مقتل اور میکدے
علم ودانش کے مشہد، مذاہب کے معبد
ہر اک در پہ امیدوں سے ذہن بھر کر گیا اور خالی پھرا

کربِ انکار و تشکیک کے دشت میں پابرہنہ چلا
تشنہ لب، سر برہنہ پھرا
ہونٹ انکار کی آگ سے جل گئے
دل نفی، ترک اور نیستی کا سمندر بنا
آسمانی خدا اور زمینی خداؤں کے قہر و غضب کا ہدف بن گیا
کس کا اقرار کرتی زباں
کس کا اثبات کرتے جھلستے ہوئے جسم و جاں
میرے ماضی کی قبریں شکستہ حبابوں کے مانند گم گشتۂ موجِ سیلِ زماں
کھو دیا میں نے خود اپنا نام و نشاں

(3)

ماحصل اس سرابِ رواں کے سفر کا ہے کیا
چند ٹوٹے ہوئے لفظوں کی شعلہ افشاں زباں......
باتیں کہہ لو جنھیں
کچھ علائم میں پیراہنِ سعیِ اظہار کی دھجیاں......
نظمیں کہہ لو جنھیں
چند مقتول جذبوں کی پرچھائیاں ......غزلیں کہہ لو جنھیں
چند بکھرے خیالات کا شورِ طوفاں......مضامین کہہ لو جنھیں
چند سنگ ریزے جن کے بیابان میں کچھ صدف ہیں، یہاں اور وہاں......
کس مپرسی کی ناخواندہ تصنیفیں کہہ لو جنھیں
چند اوراق ترتیب دینے کی فرصت نہیں دیتا جن کو سرابِ رواں......
خود شکن بے نیازی کی امیدیں کہہ لو جنھیں
چند افکار و جذبات، قرطاس سے خامے تک جن میں حائل کئی دوریاں......

ساحلوں تک سرابوں کے آ کر پلٹتی ہوئی لہریں کہہ لوٹتیں
اس سراب رواں کے سفر کا یہی ما حصل ہے......
تو اس کو بھی زائد سے زائد نقوشِ سراب رواں ہی کہو

چہل سال عمرِ گذشتہ حبابوں کی زنجیر ہیں
قہقہہ مار کر جو اُٹھے تھے ابھی
پھوٹ کر ایسا روئے کہ موجوں میں گم ہو گئے
وہ حباب ہاتھ آ ئیں تو رودادِ عمرِ گریزاں سنو
ان حبابوں کو بچھڑی ہنسی مل سکے گر تو دریا بہ دریا بکھیر و اُسے
ان حبابوں کے آنسو اگر موج در موج تم چن سکو
تو مری خشک آنکھوں کے صحرا میں بو دو انہیں

چہل سال روز و شبِ پرفشاں
دولتِ رائیگاں
حاصلِ عمرِ بے حاصلی کا بیاں

(2 مارچ 1976)

# لور پول کا نیگرو مزدور

(افریقی شاعر ڈیوڈ روبادیری کی نظم کا ترجمہ)

وہ مجھے راستے میں ملا
تیرہ گم نام گلیوں کے فٹ پاتھ پر رینگتا
سر جھکائے ہوئے
مضمحل، سرگراں، اپنے اندر سے ٹوٹا ہوا
ایک تاریک سایہ ہزاروں ہی تاریک سایوں کی دنیا میں چلتا ہوا

میں نے رُخ اپنا بدلا کہ چہرے سے چہرا ملے
اور آنکھوں سے آنکھیں ملیں
لیکن اُس کے سیہ نیگروئی رُخ پہ کچھ بھی نہ تھا
مسکراہٹ کی کرنیں نہ تھیں
ایک موعودہ امید کی آرزو بھی نہ تھی، آسرا بھی نہ تھا
صرف سہمی ہوئی آنکھ کے تیز نشتر جھکتے ہوئے
بے حس انبوہ میں تیرتے ڈوبتے

کس تمنا سے ہر چہرے میں کھوجتے
ایک چہرہ
کس قدر دُکھ کے ساتھ ایک دل ڈھونڈتے
جو سمجھا اُسے
جس میں احساس کی لَو لرزتی ملے

یہ وہی ہے
لوسپڑ ل کا نیگرو کارکن
جس نے چھوڑی تھی آغوشِ خاکِ وطن
بھاری دل
اور سو سال کے جبر کا بوجھ اٹھائے ہوئے
خود کو پانے کی خاطر وہ کس شان سے جہد کرتا رہا
اُس نے چاہا کہ مردانگی کا وہ شعلہ اُسے بھی ملے
جو ہے آزاد دنیا میں ہر فرد کی زندگی
لیکن اِس جا بھی آباد ہیں صرف آزاد مُردے
اُسی روشنی شعلگی کی تمنا لیے

کیا وہ سورج، وہ یک امید
جو اُسے بطنِ مادر سے آنے پہ روشن جھلکی سی ہنستا ملا تھا
کبھی اُس کی دنیا پہ چمکے گا پھر؟
نہیں، یہاں کبھی بھی نہیں!
یہاں دستِ محنت کی اُمید ہے صرف اک پھاوڑا
اور مقدر ہے ہر آرزو سے کنارہ کشی

(1974 اور 1977 کے درمیان)

# ایک شکستہ یورپی انقلابی کے نام

(والٹ وٹ مین)

اے مرے بھائی یا اے بہن جو بھی ہو
اپنی ہمت کو قائم رکھو
حریت کا تقاضا ہے ہر حال میں اُس کی خدمت کرو
مقصدِ حریت ناشناسِ شکست
اک دو نا کامیاں یا ہزاروں ہی ناکامیاں
قوم کی بے حسی، ناسپاسی ہو یا نا وفاداریاں
یا کہ ہوں دھمکیاں طاقت و فوج کی، گولہ بارود کی
یا قوانینِ تعزیر کی دھمکیاں

حریت ناشناسِ شکست
وہ نہ پسپا ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی
جو ہمارا ہے ایماں، ہمیشہ سے مستور ہے برِ اعظم سے تا برِ اعظم

ہمارے لیے منتظر

وہ کسی کو بلاتا نہیں، کوئی وعدہ بھی کرتا نہیں
روشنی میں سکوں سے ہے بیٹھا ہوا
اُس کو اپنا یقیں ہے، وہ ہے مطمئن، جانتا ہی نہیں ناامیدی کا وہ نام بھی
صبر سے منتظر ہے، زمانوں سے وہ منتظر

میرے نغمے وفا بستگی ہی کے نغمے نہیں ہیں
یہ نغمات ہیں انقلابوں کے بھی
میں قسم بستہ شاعر ہوں ہر ایک بے خوف باغی کا، دنیا میں وہ ہو کہیں
اور جو ہم سفر ہے ہر اک تج کے چلتا ہے گھر سے سکون و قرار
جاں کی بازی لگی ہے،
کوئی لمحہ بھی مانگ لے،
ہے ہتھیلی پہ سر کو لیے جاں نثار

جنگ جاری ہے
خطرات کی سائرن چیختے ہیں مسلسل،
کبھی پیش قدمی، کبھی واپسی
جیت جاتے ہیں اقتدار یا فرض کر لیتے ہیں فتح ہاتھ آ گئی
تیرہ زندان اور سولیاں
ہتھکڑی، بیڑیاں، طوق و زنجیر
پگھلی ہوئی سیسے کی گولیاں
کاروبار اپنی کرتی رہیں
نامور اور گمنام سارے شہیدا پنے تن چھوڑ کر عالم نو کو جاتے رہیں

شعلہ افشاں ادیب وخطیب اپنے ملکوں سے ہوتے رہیں دربدر
دوُردیسوں میں بیماریاں اُن کی ساتھی بنیں

مقصدِ حریت کو سلاتے رہو، شعلہ افشاں زبانوں پہ مہریں لگاتے رہو
آتشیں نغموں کے حلق کو گھونٹ دو
نوجواں جب ملیں شرم سے اپنی آنکھوں کو نیچی رکھو
لیکن ان سب مظالم سے بھی حریت اپنے میداں سے ہٹتی نہیں
اور غدار پوری طرح غالب آتے نہیں
حریت چھوڑتی ہے اگر ایک میداں تو وہ پیچھے ہٹنے والوں میں
پہلی نہیں، دوسری بھی نہیں، تیسری بھی نہیں
منتظر رہتی ہے وہ کہ سب رن سے ہٹ جائیں، تب وہ ہٹے
جب مجاہد رہیں اور نہ یادِ شہیداں رہے
جب زمیں پر کسی جگہ بھی پوری ہی زندگی
روحیں مردوں اور عورتوں کی سرے ہی سے مٹ جائیں
تب ہی کہیں حریت، حریت کا تصور ہٹے گا اُس اک گوشۂ ارض سے
اور تب وہ کہیں غالب آئیں گے غدار پوری طرح

جراُت اے یورُپی باغیو،
انقلابی زن ومرد، جراُت کرو
جب تلک جان ہے جب تلک زندگی ختم ہوتی نہیں
تم جہد اپنی جاری رکھو

میں نہیں جانتا تم ہو کس کے لیے تیغ در دست سینہ سپر

میں نہیں جانتا میں ہوں کس کے لیے نغمہ خواں،
اور نہ یہ جانتا ہوں کہ مقصد کسی چیز کا بھی ہے کیا
لیکن اتنا ہے میں سوجتن سے اُسے ڈھونڈنے جاؤں گا
خواہ پسپائی میرا مقدر بنے
ہیں شکست اور افلاس، قید و سقوط اپنی اپنی جگہ پر بہت ہی عظیم
فتح کو ہی فقط ہم نے جانا ہے شاید عظیم
وہ ہے بے شک عظیم،
اب یہ معلوم ہوتا ہے مجھ کو مگر،
فتح حاصل نہ ہو ہزیمت عظیم
اور یہ جان لو موت بھی ہے عظیم اور مایوسیاں بھی عظیم

(1974 اور 1977 کے درمیان)

# زادِ نجات

مہ و سال خوردہ ضعیف اپنے ہاتھوں پہ تھمے
لرزتی ہوئی کانپتی انگلیوں میں سیہ دانہ تسبیح تھامے
بغل میں مصلّے دبائے
خمیدہ کمر پر عبادات کا بوجھ لادے
سیہ میلے دھاگے سے باندھی ہوئی عینکیں ناک پر نیچے کھسکا کے
اوپر سے مجھ کو بہت دیر تک گھورتے ہیں
وہ بے دانت منہ میں زباں کو گھما کر
پھٹی، کپکپاتی، بدآہنگ آواز میں بولتے ہیں
"تمھاری بھی اب عمر آئی عبادت ریاضت کی
اللہ سے لو لگاؤ
یہ کیا زندگی ہے
سحر دم کھلی آنکھ، ہاتھوں میں اخبار
اور چائے پر چائے کی پیالیاں

ملحدانہ کتابوں کے اوراق کے دشت میں دن بھٹکتے گذرتا ہے
یا پھر قلم لے کے اعمالنامہ سیہ کرتے رہتے ہو
یا دوست احباب مل جائیں تو صبح سے شام تک شام سے صبح تک
بحثیں علم وادب کی، سیاست کی، حالات کی
بے سبب شہر پیمائی، کوچہ نوردی
کبھی تو بہت رات ڈھلتے تم آتے ہو آنکھوں میں روٹھی ہوئی نیند بھر کر
اِدھر دیکھو
بچے تمھارے جوانی کی دہلیز پر آنے والے ہیں
اور تم جس زمیں پر کھڑے ہو، بہت جلد اپنے شکنجے میں کس لے گی تم کو
جاتے جاتے بھی تم اُن کو گمراہیوں ہی کی میراث دو گے؟
گئے دن کہ جب لغزشِ پا میں تھا رقصِ مستی
اب ان پائے لغزیدہ کو توڑ کر بیٹھو خلوت میں تم
سر اٹھا کر ملامت کے جادے پہ بھٹکے بہت روز تم
اب اس سرگرانی کو آدابِ سجدہ سکھاؤ
تمھیں تیس برسوں سے دانش گہوں میکدوں کی زباں یاد ہے
ہے لازم کہ بھولے ہوئے کم عقیدے کی تسکین آور زباں میں،
کبھی جو تمھیں یاد تھی، پھر سے باتیں کرو
مناجات وتوبہ میں صرف اپنی راتیں کرو

سنا ہے تمھارے درِ دل پہ اب روز درد آ کے دیتا ہے دستک
کسی دن رگوں میں لہو تھم نہ جائے
دھڑکتا سُلگتا ہوا قلب اک قطرۂ موم کی طرح سے جم نہ جائے
کسی زندگی کا بھروسا نہیں ہے

یہ آندھی میں جلتی ہوئی شمع، سیلاب میں تنکا ہے
وہ شمعیں جو دونوں سروں پر سلگتی ہیں
وہ بلبلے جو ہر اک سیلِ تند و غضبناک پر ہنستے ہیں سر اٹھا کر
ہوا کے کسی تند جھونکے سے بجھ جائیں گے اور بکھر جائیں گے
زندگی کر چکے، موت کرنے کے آداب بھی باقیِ انفاس سے سیکھ لو
یہ نہ ہو، موت اچانک چلی آئے اور اس سے پہلے کہ پھر وہ تم
بساطِ تخلّل کر دتہہ، بجھا دو تفکّر کے شعلے
تگ و تازِ تخیل کے بے کراں دشت کے دامنوں کو سمیٹو
کچھ آخرت کی بھی فکر، بخشش کا بھی کوئی ساماں کرو
ترکِ لذّات و عصیاں کرو"

میں خود زندگی کی کشاکش، جہادِ مسلسل سے اب تھک چکا ہوں
شبِ عمر کاٹی ہے آنکھوں میں تو نیند آنے لگی ہے بہت
میں لاحاصلی کے شب و روز کے بوجھ سے مضمحل ہوں
نجات آزما، عاقبت بیں بہی خواہوں کی زجر و توبیخ و تلقیں سے منفعل ہوں
مگر کیا جوانی کی سرگشتگی، عشق کے سلسلوں
جہدِ فکر معاش و سماج و سیاست سے رہ کر الگ بھی عبادت ریاضت کا امکان ہے؟
کیا عبادت رسومات کی قید ہے اور شعلگی کی بے چارگی کی پناہ گاہ ہے؟
کیا سب اعمال حوا و آدم کے پہلے گنہ کا ثمر ہیں؟
یہ نعمات و لذّات، یہ زندگانی کی کشف و کرامات اشجارِ ممنوع ہیں؟
کیا یہ کُل کائنات اس لیے ہے کہ دیکھو نہ اس کی طرف بھی؟
فقط آخرت کے لیے زادِ راہِ نجات اپنے دامن میں بھرنے کے خواہاں رہو
خدا کیا فقط معبدوں ہی میں حاضر ہے، ناظر ہے اور اس سے آگے نہیں دیکھتا ہے؟

اُسے اتنی فرصت نہیں ہے شمارِ عبادات سے
جو وہ دیکھے کہ سجدہ گزار اپنے ماضی میں کیا تھے؟
وہ معبد سے باہر نکلتے ہیں تو اپنے معبود کو اُس کا در بند کر کے وہیں چھوڑ دیتے ہیں
ان کا خدا کارزاروں، دکانوں میں، بازار و دفتر میں ساتھ اُن کے آتا نہیں ہے

خدا کے یہ مخصوص بندے بتائیں
کہ کیا صرف حجلہ گزینی، مصلّےٰ نشینی و تسبیح چینی ہی اک راستا ہے؟
میں عاصی، گناہوں کا اپنے مُقر ہوں
کبھی اپنے ماتھے پہ سجدوں کے تمغے سجائے نہیں ہیں
احادیث و آیاتِ قرآں رہیں نقشِ دل پر
مگر اِن نقوشِ منوّر سے جشنِ چراغاں منائے نہیں ہیں
رہا کربلا میرے سینے میں زندہ، یزیدوں کے آگے جھکایا نہیں سر کبھی
یہ ہے بات اور، ایک سچ کے لیے بھی کٹایا نہیں سر کبھی
کہ منزل شہادت کی میرے مقدّر میں لکھی نہ تھی
یہ شکلِ نجات اپنے اعمالنامے کے دفتر میں لکھی نہ تھی
مگر زندگی کرنا، ہر سانس پر مر کے جینا جہاد و عبادت نہیں ہے تو کیا ہے
ہزاروں جتن سے دماغ اور دل کو اندھیروں کے حملے سے محفوظ رکھنا ریاضت نہیں ہے تو کیا ہے
رہے زندگی کا نہ کچھ قرض باقی، نہ ہو موت کے آگے خوف و ندامت
نجات اس سے بھی گر عبارت نہیں ہے تو کیا ہے؟

(اگست 1973)

# چہرہ خانے میں

ابھی تو بیٹھا تھا تھک کر خود آگہی کا جنوں
کہ پھر حیات نے آئینے جڑ دیے ہر سو
پھر ایک چہرے کے آئے نظر کئی پہلو
سکوتِ خلوتِ شب شور سے چٹخنے لگا
ہجومِ چہرہ سے ہر آئینہ تڑخنے لگا
تمام عمر کی کاوش سے جس کو ڈھونڈا تھا
وہ چہرہ آئینہ خانے میں اجنبی نکلا
جسے سمجھتے تھے عرفانِ ذات، یوں ٹوٹا
ہر اک کرچ میں فریبِ خود آگہی نکلا
سمیٹتے رہو یہ ریزہ ریزہ خود نگری
مآلِ دیدۂ نظارگی ہے بے خبری
ہزار رُخ ہیں، کہو گے کسے کسے نظری
تم ہی ہو یہ بھی، تم ہی یہ بھی، اور تم ہی یہ بھی

ہیں اتنے رُخ کہ انھیں جاننا بھی ہے مشکل
خود اپنے چہرے کو پہچاننا بھی ہے مشکل
کچہری، بینک، دوا خانوں، ڈاک خانوں میں
سینما، ریلوے، بس، دفتروں، دکانوں میں
ہزاروں کاؤنٹر اور سب پہ ہے قطار لگی
تم ان قطاروں کا بے نام ایک نمبر ہو
تمھیں بھی کرنا ہے باری کا انتظار یہاں
نہیں ہے مسئلۂ جبر و اختیار یہاں

وہ بھیڑ علم کدوں میں، نہیں ہے جس کا شمار
اسیر خوف کے آسیب میں ہیں طالبِ علم
یہ خوف دانش و علم و ادب سے ناآگاہ
جلوس، جذبۂ تخریب اور ہڑتالیں
دہکتی کھولتی تقریریں، نعرے، آوازیں
عدم تحفظِ فردا کے خوف کی شکلیں
اساتذہ کا ترقی کی کوششوں پہ مدار
مطالعہ ہو کہ تحریر، سب ہیں کاروبار
جو چہرے صاف چمکتے ہیں اس سمندر میں
وہ ڈوبتے ہیں اُٹھاتے ہی سر حباب آسا
وہ آنکھیں، ماتھے ذہانت سے جو چمکتے ہیں
غروب ہوتے ہیں ظلمت میں ماہتاب آسا
یہ بھیڑ اپنی طرح سب کو کر کے بے چہرہ
الگ جو کرتی ہے تو کرسیوں کے نمبر سے

جو جانتی ہے کسی کو تو اُس کے دفتر سے
تھا کون اہلِ نظر، کون کم نگہ، کج بیں
تھا کس جبین پہ سورج، تھی کس کی آنکھ کرن
نہ ڈھونڈو، کھا گئے سب کو علوم کے مدفن
جو خود کو دیکھ لو، پہچان بھی نہ پاؤ گے
کہاں ہو بھیڑ میں تم، جان بھی نہ پاؤ گے

جمی ہیں کرسیاں ایوانوں میں قرینے سے
بڑی، پھر ان سے ذرا کم پھر ان سے بھی چھوٹی
یہاں شمار میں انساں نہیں ہیں رُتبے ہیں
یہاں کسی کا نہیں چہرہ، صرف درجے ہیں
اسیر ہونے کو آئے تھے کرسیوں میں جو تم
تمھارا چہرہ تھا سب سے جدا، صدا تھی الگ
تمھاری بات کا انداز الگ، ادا تھی الگ
نگاہِ ظلمتِ شب بستگاں کے شعلوں سے
تمھاری آنکھوں، نگاہوں میں اک ضیا تھی الگ
کہاں اٹھا کے رکھا وہ نگہ کا آئینہ
نکال کر اُسے دیکھو کبھی اکیلے میں
تو اپنے آپ کو پہچان بھی نہ پاؤ گے
ہو کرسیوں میں کہاں، جان بھی نہ پاؤ گے

وہ محفلیں جہاں رنگینیاں برستی ہیں
جہاں خود آگہیاں ملنے کو ترستی ہیں

ہر ایک چہرے پہ تنہائیاں ملیں گی وہاں
طرب میں درد کی پرچھائیاں ملیں گی وہاں
غرورِ شہرت و مقبولیت، فریبِ خودی
اثر کے طنطنے اور طمطراقِ زرداری
شکست و خوف کے ہیں نقرئی طلائی غلاف
یہ نشے اور نقابیں ہیں چہرہ پوشی کو
بنالیا ہے پناہ گاہ عیش کوشی کو
زمیں سے چھپتے ہیں بالائے بام کے چہرے
یہ رات کھا گئی ماہِ تمام کے چہرے
ہیں سارے چہرے دھندلکوں کے شام کے چہرے
ہیں تا بہ حدِ نظر ازدحام کے چہرے
کبھی کبھی ہوئے ان محفلوں میں تم بھی شریک
خود آگہی کا جنازہ اُٹھائے آنکھوں میں
کبھی جو دیکھو گے ان محفلوں کی تصویریں
تم اپنے آپ کو پہچان بھی نہ پاؤ گے
ہو محفلوں میں کہاں، جان بھی نہ پاؤ گے

ہر ایک موڑ پہ اک ازدحام بے چہرہ
حیاتِ عام ہو یا مرگِ عام بے چہرہ
ہے ازدحام کا اک چہرہ، تیرہ، بے خط و خال
ہے ازدحام کا اک جذبہ، خوف وحزن وملال
وہ ہم ہوں، میر ہوں، یا تم، بدل گئے ہیں سبھی
اس ازدحام کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں سبھی

خود آگہی کے جنوں سے کہو، نہ فارغ بیٹھ
نہ راس آئیں گے جادے یہ خود نمائی کے
تم ایسے کون خود آگاہ ہو کہ بیٹھ گئے
نظر میں خواہشِ آرائشِ جمال لیے
جڑے گی آئینے خلوت میں زندگی لاکر
تو اپنے آپ سے بھاگو گے خود ہی گھبرا کر
ابھی نہ بیٹھو کہ تم اپنی ہی تلاش میں ہو

(7 مارچ 1979)

# محوروں کی تلاش

بہت دنوں سے نہیں دل میں دردِ بے وطنی
وفاتِ یادِ وطن کو زمانے بیت گئے
سفر کی بھول بھلیاں میں بچھڑا گھر کا خیال
پرائے دیسوں میں ساتھی بسے، رفیق چھٹے
وہ جن سے گھر تھا گھر، اک عہد گزرا خاک ہوئے
جو زندگی تھے، غمِ زندگی سے پاک ہوئے
اک عمر گزری، رفو دل کے سارے چاک ہوئے
زمیں کے رشتے سب آلائشوں سے پاک ہوئے

زمیں کا ایک ہی محور، ہمارے سو محور
کسی کا نام وطن ہے، کسی کا ماضی ہے
کسی کو کعبہ، قبیلہ، کسی کو گھر کہیے
ہزاروں رشتے ہیں، ہر اک کو معتبر کہیے

زمین گھومتی ہے اپنے چاک پر یکساں
ہم اپنے محوروں کی گردشوں کے قیدی ہیں
جو محوروں کی کشاکش میں ٹوٹے اک محور
تو زندگی نئے محور تلاش کرتی ہے
مگر ہے اب کوئی محور، نہ زندگی کا مدار
نہ کوئی سمتِ سفر، نے شگفتگی کا مدار
قبیلہ، کنبہ، وطن، خاندان ٹوٹ گئے
مسلمات کی بنیاد پر پڑیں ضربیں
عقیدے بیٹھے تھے جس عافیت کے گوشے میں
ہے اس کی سقف شکستہ، دریدہ دیواریں
کچھ ایسے ہیں کہ ہے جن کا شگفتگی پہ مدار
کریدیے تو خدا پر نہ بندگی پہ مدار

ہماری نسل کی تقدیر ٹھہری در بدری
ہمارے بعد کی نسلوں کی زندگی ہجرت
یہ ہجرتیں ہیں وہ، ایماں ہے جن کا فکرِ معاش
سحر سے تا بہ شبِ تار جنگ ہوتی ہے
کبھی غنیم کا حملہ، کبھی خود اپنوں سے جنگ
کمینِ خواب میں اندیشہ ہائے دور و دراز
ہر ایک روز دفاعِ محاذِ نانِ جویں
ہر ایک رات ہے نیندوں پہ خوف کی یلغار
یہی دفاعِ شکم، خوف اور اندیشے
پرائے دیسوں میں ہجرت کے قافلوں کا مدار

نہ ٹوٹے رشتۂ انفاس و جسم، فکر یہی
شکست اور ترقی کے حوصلوں کا مدار

کہیں ہو جنگ ، کہیں انقلاب آئے نہ آئے
پرائے دیسوں کی تعمیر کے تنوروں میں
مہاجرینِ شکم روز بنتے ہیں ایندھن
اسی تنور میں آسائشوں کے کچھ ساماں
ضروریات کے اسباب جمع کرتے ہیں
پرائے بینکوں کے لاکروں میں، کھاتوں میں
امیدیں، حسرتیں اورخواب؛ جمع کرتے ہیں
کبھی خیال جو آجائے گھر، عزیزوں کا
تو یاد بھیجتی ہے ڈالروں کی سوغاتیں
وطن میں اپنے تنورِ شکم میں قید بزرگ
دعائیں دیتے ہیں، اور پڑھتے ہیں مناجاتیں
شکستہ رشتوں کی ہوتی ہیں یوں مداراتیں

کہا یہ کس نے کہ محور ہیں زندگی کے ہزار
تلاشِ رزق ہے لے دے کے زندگی کا مدار
یہاں ہم اپنے کئی محوروں کی گردش میں
سحر سے شام تلک ٹوٹتے ہیں لاکھوں بار
کبھی زبان کے مرنے کا خوف طوقِ گلو
کبھی یہ فکر کہ تہذیب پر نہ آئے زوال
تعصّبات کے آتش فشاں پہ بیٹھے ہیں

یہ آرزو ہے اسے مولدِ بہار کریں
محاذِ جہدِ بقا پہ یہ سوچتے ہیں کھڑے
اس اندھی جنگ کو ہم کیسے اختیار کریں
کہیں روایتیں زنجیرِ پا، رسوم کہیں
ہے دوزخِ ہوسِ اقتدار میں بھی یہ ضد
کہ دامنِ ہوس دل کو تار تار کریں
کہا یہ کس نے کہ بے محوری ہے آج حیات؟
جو محوروں کی کشاکش میں ٹوٹے اک محور
تو زندگی کئی محور تلاش کرتی ہے

(جنوری-فروری1980)

# شجرِ نور

وہ گیا جب
تو اُس کے نقوشِ کفِ پا بہت دوٗر تک
راستے میں دیوں کی قطاریں جلاتے گئے
میں اُسے ڈھونڈنے کو چلا
تو یہی جگمگاتے دیے دوٗر تک ساتھ آئے مرے
اور اُس موڑ پر
جس جگہ ایک رستے سے پھوٹے کئی راستے
رک کے دیکھا تو
ہر راستے پر اُسی کے نقوشِ کفِ پا کی شمعیں چمکنے لگیں
میں نے سوچا بہت
کون سے راستے پر چلوں
مجھ کو ہر راہ نے باہیں پھیلا کے آواز دی
جتنے بھی راستے جگمگاتے ہیں

وہ سب کے سب
اسی کے نقوشِ کفِ پا کی تحریر ہیں
روشنی کا جو رستہ بھی اپناؤ گے
اسی نور کے قدموں والے کی منزل کو تم پاؤ گے

(5 جنوری 1980)

# ایک تصویر

زندگی کی اُڑائی ہوئی گرد بالوں میں ہے
وقت کی دھوپ ماتھے پہ ہے
اپنے شعلوں سے اُڑتی ہوئی راکھ گالوں میں ہے
بار بار حملہ آور خزانوں سے پامال شادابیاں چشم میں
عکس دھندلائے خوابِ بہاراں کا نظروں کے پالوں میں ہے
حرفِ ناگفتہ اور ناشنیدہ سوالوں پہ ہے
ناموافق زمانوں کا گہرا اکیلا پن ہے
رقصِ بارشِ شعلگی کا خیالوں پہ ہے

امتدادِ زماں سب کی خاطر نہیں ایک سا
یہ کہیں تو گزرتا ہے بادِ صبا کی طرح
پھول آنکھوں جبینوں لبوں عارضوں کے کھلاتا ہوا
نرم تر نغمہ یا زندگی بخش حرفِ دعا کی طرح
پر یہاں سے یہ گزرا ہے موجِ بلا کی طرح
لمحے لمحے میں اک عمر کا کرب سمٹا ہوا

دھوپ اُتری تو چہرے ہی پر تھم گئی
برف باری کی رُت آ کے بالوں ہی میں جم گئی
وقت کا جزر و مدخوں میں طوفاں جگاتا رہا
دل تڑپتی اچھلتی ہوئی موجوں کے ناز اُٹھاتا رہا
دھڑکنیں درد کی دستکیں بن گئیں
خون کی سرکشی سے رگیں تن گئیں

اور اب چہرے پر صرف آنکھیں ہیں دو
یہ بھڑکتے دیے زورِ موجِ زماں سے نہیں بجھ سکے
عمر کی گرد، سیلابِ خوں اور بادِ فنا
سب آنکھوں کے صحرا کی وسعت میں گم ہو گئے
بال، چہرہ، جبیں پیش از وقت پیرانہ سالی کی زد میں سہی
آنکھیں عمرِ گریزاں کی اس تندگامی پہ ہیں خندہ زن
ان کی گہرائیوں میں زمانے کی لاانتہا وسعتیں خیمہ زن

برف بے رحم موسم کی گرتی رہے، گرد اُڑتی رہے
او پر اُٹھتے ہوئے خوں کی لہریں رگوں میں تڑپتی رہیں
آنکھوں کے دو چمکتے چراغوں تلے
دو اُپی تیغوں کی طرح لب ہیں بھنچے
دیکھتی ہے جو آنکھ
ہونٹ کرتے ہیں لفظوں میں اُس کو ادا

یا خدا
آنکھیں بینا رہیں، ہونٹ ناطق رہیں میری تصویر کے

(12 اپریل 1980)

# مکتوبِ زمستاں

لہو گرم رکھیں تو کیسے
فضا ہجر و دوری کی سنگلاخ دیوار ہے
ہوا سم چشیدہ یخ آلودہ تلوار ہے
ہر اک سمت سے سرد موسم کی یلغار ہے
ہر آتی ہوئی رات پہلے سے بھی کچھ سوا تیرہ و تار ہے
رگوں میں چھلکتا چھلکتا لہو جم نہ جائے
اچھلتی مچلتی ہوئی نبض بھی تھم نہ جائے

دسمبر کی راتیں
لحافوں میں دبکی دسمبر کی راتیں
سرِ شام سے نیم بے ہوش بستر گرفتار راتیں
یہی سرد بیمار راتیں
کبھی پہلے آتی تھیں کرنے کو باتیں

وہ بے معنی فقرے، وہ معصوم جملے
وہ بچے بڑوں کی حماقت کے قصے
بزرگوں عزیزوں کے بے ربط چرچے
اور ہر بات پر بے تحاشا ہنسی
آبشاروں کی مانند پیہم اُبلتی اُمڈتی ہنسی
لبوں کے کناروں پہ بے ساختہ بے سبب پھوٹتی اور مچلتی ہنسی
دسمبر کی راتیں بھی ہنستی تھیں پچھلے پہر تک
جواں گرم راتیں
سبک نرم راتیں
وہی راتیں اس سال آئی ہیں بیمار بن کر
سیہ بے سبب خامشی کی گرفتار بن کر
ابھی ڈوبتا بھی نہیں گوشۂ غرب میں مضمحل زرد سورج
ابھی کانپتا ہے افق پر تھکا سرد سورج
ابھی جانے پاتی نہیں چند پس ماندہ کاہل شعاعیں
کہ لمبی اندھیرے کی کالی رضائی میں آ جاتی ہیں لڑکھڑاتی خمیدہ کمر بوڑھی راتیں
اپنے قدموں کے کالے نشاں در پہ دہلیز پر چھوڑتی، ہانپتی
سارے کمروں کو اپنی اُداسی کی آغوش میں ڈھانپتی
در و دریچوں کو کرتی ہوئی بند، سر تا قدم کانپتی
لیٹ جاتی ہیں بستر پہ خاموش آنکھوں میں آنسو لیے
گُل بکف پیڑ رہ جاتے ہیں صحن میں منتظر اُڑتی خوشبو لیے
کس کے جوڑے میں چہرہ چھپا کر ہنسیں پھول
راتوں کے گیسو پریشان ہیں
کس کے عارض پہ بیٹھیں چہکتے ہوئے رنگوں کی تتلیاں

کہ راتوں کے رخسار ویران، لب منجمد اور حیران ہیں
برف کی پٹیوں میں بندھی انگلیاں گدگدائیں کسے
کہ یہ راتیں ہنستی نہیں، باتیں کرتی نہیں

تمھیں یاد ہوگا
کئی سال پہلے
زمستاں کی ایسی ہی راتوں میں لکھا تھا میں نے
''ہوائے زمستاں کی تیزی رگوں میں لہو منجمد کر رہی ہے
برودت فضا کی، بہت روز ہوتے ہیں، ضد کر رہی ہے
ملا لو آنکھیں جن کی قربت کی گرمی سے پگھلے یہ موسم
شمیم نفس سے فضا ہو معطر تو سنبھلے یہ موسم''
میں ان بیتی راتوں کی یادوں میں کھویا ہوا
ان کے بعد آنے والی وصال اور قربت کی راتوں کے گم قافلے کے
تعاقب میں نکلوں کہاں

مرے گرد راتوں کی یخ باہیں لپٹی ہوئی ہیں
مری انگلیوں میں قلم جم گیا ہے
رگوں میں لہو تھم گیا ہے

مرے سرد بستر پہ بیمار خاموش شب نیم بے ہوش لیٹی ہوئی ہے
مرے نام سے تم کو تنہائی خط لکھ رہی ہے

(8 دسمبر 1980)

# ماں

جب اُس سے میں رخصت ہوا
موت اُسے اپنی بانہوں میں جکڑے ہوئے تھی
وہ دنیا سے رخصت ہوئی ہے
تو اُس کے لبوں پر بھی اور موت کے ہونٹ پر بھی مرا نام تھا
اور میں دور انجانی بستی میں ہنستی مچلتی ہوئی زندگانی کے سیلاب کی
ایک بے نام موج
اپنی بے دست و پائی پہ حیران تھا
اور وہ جس نے دی تھی مجھے زندگی
موت کی خالی آغوش سے دے رہی تھی دعائیں مجھے
زندگی بد دعائے مسلسل تھی، ہے
مگر مرگ آشام ہونٹوں کو چھو کر دعا بن گئی
مجھ پر احساں کسی کا اگر ہے
تو صرف اُس دعا کا ہے جس نے مجھے زندگی دی ہے
اور زندگانی کے ہاتھوں میں سونپا مجھے

(جون 1982)

# شبِ برات

در و دیوار سے تا بام ہر گھر میں چراغاں ہے
کہیں شمعوں کے جھرمٹ ہیں، کہیں بجلی کا طوفاں ہے
کہیں محراب کے گھونگھٹ میں لَو دیپک کی لرزاں ہے
کہیں صرف ایک مدّھم سا دیا طاقِ غریبی میں
اُمڈتے نور کے سیلابِ رنگیں سے ہراساں ہے
اندھیروں کے نگر میں روشنی کا اہتمام اتنا
ہزاروں دیپکوں کا ایک ہی شب کیا ہے کام اتنا؟

سنا ہے آج روحیں رفتگاں کی آسمانوں سے
اُتر کر خاک کے پسماندگاں سے ملنے آئیں گی
اندھیرا ہو تو اپنے گھر کا وہ رستہ نہ پائیں گی
اور اپنی جنتوں یا دوزخوں کو لوٹ جائیں گی
اندھیرا ہے غریبی، کوئی زندہ ہو کہ مردہ ہو

اجالے ہی میں آتا ہے، اجالا ہی امیری ہے
کیوں پسماندگاں سے ڈھانپ لیں وہ اپنے چہروں کو
اجالوں کی نقابوں سے، کہ روحیں رفتگاں کی
چراغوں کو بنا کر ظلموں کا رخ نہ دیکھیں گی
وہ خوانِ نذر پر لوبان کی خوشبو میں اتریں گی
دعائے مغفرت اور فاتحہ ایصالِ نیکی ہے
انہی کی روشنی میں پھر عدم کی راہ وہ لیں گی

جلائی ہیں جو شمعیں تم نے، ہمدم دو نفس کی ہیں
لووں کے ساتھ لرزاں تیلیاں تن کے قفس کی ہیں
سنا ہے نیستی کا دشت بے آب و ہوا ہے
وہاں بوچھار کا خطرہ نہ ڈر طوفان کا ہے
ہم اپنی ساری شمعیں سونپ دیں بے جسم روحوں کو
وہ ان کی روشنی میں شاید اپنا راستہ پالیں
ہم اپنے جسم سے پھر سال بھر شمعیں نئی ڈھالیں
کہ قرضِ رفتگاں ہر سال قسطوں میں چکانا ہے
ہے جب تک سانس، روحوں کو حساب اپنا دکھانا ہے
نہ ٹوٹے جب تلک، زنجیرِ تن کا بار اٹھانا ہے

وہی اچھے ہیں جو زنجیرِ جسم و جاں اتارے
خاک سے منہ اپنا ڈھانپے سو رہے ہیں
خدا توفیق دے پسماندگاں کو صرف اتنی ہی
کہ اُن کی قبر پہ ہر سال جا کر شمعیں رکھ دیں

پھول کی چادر چڑھادیں، فاتحہ پڑھ لیں
تو ارواحِ گذشتہ ان کو جینے کی دعا دیں گی
وہ اور اِک حلقہ زنجیرِ تعلق میں بڑھادیں گی

ہوئی اِک عمر ہم نے توڑ دی تھیں ساری زنجیریں
کیا ماضی کو دفن اور رشتہ توڑا رفتگاں سے
کیا قطعِ تعلق حاضراں، آئندگاں سے
بس اک اپنا وجود انفاس کے دھاگوں سے باندھے
زندگی کے دشت میں تنہا بھٹکنے کے لیے نکلے
نہ چھت کا سر پہ احساں تھا نہ دیواروں کا سایہ
نہ سلکِ جسم و جاں سے پیرہن اپنا بنایا
گریزاں عمر کے لمحوں کے سیلِ بے پنہ میں
اتنی مہلت بھی نہ پائی مدفنِ ماضی کو دیکھیں
جلائیں گم شدہ قبروں پہ شمعیں، گل چڑھائیں
وہ قبریں فاتحے، گل، شمع سے مایوس ہو کر
خاک کی موجوں کی رو میں مٹ چکیں کب کی
بدن کی ٹوٹی زنجیریں زمیں میں گل چکیں کب کی
نہیں پسماندگاں سے اُن کا اب کوئی تعلق
ہوئے سب خواب خاک اور اُن کی تعبیریں نہیں باقی
مبارک ہیں وہ روحیں، جن کی زنجیریں نہیں باقی

وہ ہم ہیں توڑ کر زنجیریں نکلے تھے، مگر اب
دیکھتے ہیں جسم خود زنجیر ہے، انفاس زنجیریں

یہی زنجیریں دیواریں بھی ہیں اور سقف و در بھی
یہی زنجیریں حاضر بھی ہیں، آئندہ بھی، گھر بھی
یہی زنجیریں قرضِ رفتگاں کا بار بھی ہیں
یہی موجودگاں کی گردنوں کا ہار بھی ہیں
ہم اپنی روح کی اک روشنی سے، کس کے کس کے واسطے
شمعیں جلائیں، اندھیرے گھر میں اک تنہا دیا ہے
اور اس سے مانگتے ہیں قرض اپنا رفتگاں، موجودگاں، آئندگاں سب

ہماری ہر شب اس اک روشنی کو قطرہ قطرہ بانٹتی ہے
نہ یہ آسودہ ہوتا ہے نہ وہ سیراب ہوتا ہے
ہمارے بخل سے شاکی ہیں سارے رفتگاں، بھی حاضراں بھی
مگر اس شمع کو روشن ہماری روح کو بے خواب رکھتی ہے
یہ خواہش کہ ہم سے رفتگاں، موجودگاں کو ہو تشفی
بُرا کیا ہے— کہو ارواحِ رفتہ سے وہ آئیں
کہو موجودگاں سے ایک شب مانگیں نہ ہم سے قرض اپنا
کہو آئندگاں سے ہم عدم کے دشت سے واپس نہ آئیں گے
وہ اپنی شمعیں اپنے واسطے رکھیں منوّر
اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھیں

اگر دشتِ عدم سے بھی ہوائے سیرِ دنیا کے سلاسل
پھینک کر اپنی کمندیں ہم کو کھینچیں گے
تو ہم آئیں گے، لیکن اپنی شمعیں ساتھ لائیں گے
ہمارے دوزخ و جنت جو کچھ بھی ہیں، ہماری روح میں ہیں

ہم اپنی نیکیوں کی روشنی یا شر کے شعلے سے
عدم سے زندگی تک آنے والے راستے کے ذرّے ذرّے پر
نقوش پائے نور و خیر آئیں گے بچھاتے
ہماری اپنی زنجیروں کے ہر حلقے میں ہے اک شمع رکھی
انہی شمعوں کی لو اونچی رہے بجھنے نہ پائے
تو زنجیروں کے حلقے روشنی کے ہار بن کر
روح میں اور روح کے اطراف چمکیں گے
یہی جشن چراغاں ہے، نجات زندگی ہے

(31 جولائی 1982)

# دفینہ

اِک مکاں تھا یہاں، اب مکاں بھی نہیں
بجھتی شمعوں سے اُٹھتا دھواں بھی نہیں
کہنہ، چوبی، منقش در اور چھت نہیں
ان کے سایے میں پوشیدہ غربت نہیں
پچھلے سارے نشاں خاک افتادہ ہیں
آر۔سی۔ سی کی دیواریں اِستادہ ہیں
ہے وہی خاک، پر روپ ہے اجنبی
بلب نا آشنا، دھوپ ہے اجنبی
میرا بوسیدہ ماضی کہاں گم ہوا
گھر ہوا بے نشاں، خانداں گم ہوا
میری محبوب تاریکیاں گم ہوئیں
میرے پیاروں کی پرچھائیاں گم ہوئیں

وِڈیو اور کیسٹ کے نغمات میں
بے مشقت کی دولت کی برسات میں

نقرِ سادات کا ایک گوشہ ہے گُم
شاخِ زہرابِ غیرت کا خوشہ ہے گُم
مفلسی کی گھنی چھاؤں کے خواب گُم
چشمِ حسرت کے دُرہائے نایاب گُم
آسیائے مشقت کا نغمہ ہے گُم
نانِ جو میں بسی ماں کی ممتا ہے گُم
شب ڈھلے دستِ محنت کی چکی کی لَے
ڈھلتی تھی جو دعا و مناجات میں
وقت کے شور میں بھی کہیں زندہ ہے
شمع اُس کی ابھی دل میں تا بندہ ہے
اُس کے آٹے کی نانِ جویں گُم ہوئی
وہ پسینے سے روشن جبیں گُم ہوئی
جو شرافت تھی پردہ نشیں گُم ہوئی
خونِ محنت سے تر آستیں گُم ہوئی
فاطمہؑ کی کنیز اپنے غم، اپنے اشک
کربلا کی شہادت میں بھولی رہی
ورثہ دارِ مصائب ہوئے در بدر
آسیائے سحر خیز چُپ ہوگئی
وہ صدائے دعا ریز چُپ ہوگئی
اُس صدا، اُن دعاؤں کی بنیاد پر
جو سفالی مکاں تھا کھڑا، گر پڑا
دستِ دولت کی حرصِ زر اندوز نے
دفن ملبے میں کردی کہیں آسیا

کہتے ہیں شب کی ظلمت میں زیرِ زمیں
رقص کرتا ہے مدفون زر خاک میں
روز سُنتے ہیں سِکّوں کی جھنکار سب
اپنے گم گشتہ ماضی کے مدفن پہ میں
سُن رہا ہوں کھڑا آسیا کی صدا
اُن سحر خیز نغمات کی بازگشت
حمد و نعت و مناجات کی باز گشت
یہ خزانہ ہے مدفون زیرِ زمیں
ہے یہ آواز لبیک کی منتظر
دل کی دھڑکن میں کوئی چھپا لے اِسے
اِس کی آواز سے گھر بسا لے کوئی

(28نومبر1982)

# دشتِ سکوت

ہے کائنات سکوت، ایک بے کنار سکوت
سکوت، اتھاہ سکوت ، ایک بے قرار سکوت
کسی بھی در ،کسی دل پر بھی دیجیے دستک
جواب دینے کو آتا ہے بار بار سکوت
تھے کل تو نطق گیاہ و گل و در و دیوار
ہے آج ہر لب و چشم نگاہ دار سکوت
مکالمہ ہو تو کیسے کہ قطع ہوتی ہے بات
یہاں سوال ہزاروں، وہاں ہزار سکوت
ہزاروں میل کی دوری سمٹ بھی سکتی ہے
ہمارے گرد نہ کھینچے اگر حصار سکوت
یہ کائنات تو کل گفتگو سراپا تھی
ہر اک صدا پہ ہے کیوں آج خندہ بار سکوت
جو تم تھے ساتھ تو ہر لحہ تھا تکلمِ گل
جو تم نہیں تو ہے ہر سمت خار زار سکوت

تمہارے ہاتھوں کے پروردہ سبزۂ وگل و برگ
تمہاری آنکھوں سے روشن دریچۂ و در و بام
تمہارے طرزِ خرامِ سبک کا شیدا گھر
تمہارے قرب کے نشے سے آشنا مے و جام
تمہارے خندۂ رخشاں کے خانہ زاد گلاب
تمہارے نطقِ خموشی کے راز داں در و بام
جو تم تھے ساتھ تو سب مجھ سے بات کرتے تھے
جو تم نہیں ہو تو کرتے نہیں ہیں مجھ سے کلام

میں چُپ رہوں تو اداسی سکوت بنتی ہے
میں لب ہلاؤں تو کرتا ہوں بات وحشت سے
قلم اٹھاؤں تو تنہائی تھام لیتی ہے ہاتھ
کتاب کھولوں تو معنی ہیں گم عبارت سے
اگر ہے نبض رواں خوں تمہیں پکارتا ہے
اگر دھڑکتا ہے دل، فاصلوں کی ہیبت سے
ہزاروں میل کی دوری سے یوں نہ یاد آؤ
سمیٹو فاصلوں کو دوریوں کی قربت سے
کہو زمان و مکاں سے وہ مجھ سے بات کریں
کہو سکوت سے، کھولے زباں محبت سے
تمہارے نامۂ و پیغام مجھ تک آتے رہیں
سکوت ٹوٹے حدیثِ وفا کی قرأت سے
یہ کائنات تو کیا، لاکھوں کائناتوں کو
کبھی تو میری صدا کے جواب دینے ہیں

یہ چند لمحے تو کیا ہیں ازل ابد کو بھی
زمانِ ہجر کے سارے حساب دینے ہیں

پکارتا ہوں تمھیں میں، مجھے پکارو تم
سرِ سکوت تمہارا جواب تو چمکے
سکوتِ تیرگیِ شامِ ہجر ٹوٹے گا
تمہارے نطق سے مہکا گلاب تو چمکے
گرانیِ شبِ یلدا میں خواب چمکیں گے
افق پہ، دور سہی، ماہتاب تو چمکے

18 مئی 1983

# کل یوم عاشورہ کل ارض کربلا

(بیروت میں فلسطینی کیمپوں میں "فلانجسٹ قاتلوں" کی غارت گری پر)

کھڑی ہے پچھلے پہر ابر کی ردا میں رات
مرے دریچوں پہ دیتی ہے دستکیں برسات
ہوائیں آتی ہیں بھیگے بدن سے کمرے میں
لجاتی، شور مچاتی، بلا سبب ہنستی
جبیں سے گرتی ہوئی بوندیوں سے نم ہے پلک
کوئی جھٹکتی ہے زلفوں سے قطرہ قطرہ مہک
لباس تر ہیں گریباں سے لے کے پاؤں تلک
سکھاتی ہے کوئی پنکھے کے نیچے پیراہن
کوئی نچوڑتی ہے آنچل اور کوئی دامن
خمار خواب سے کم کم کھلی ہوئی آنکھیں
ہوا کی پریوں کے ہاتھوں کے لمس کا نشہ
تمام دن رہا وہ حبس، شام تھی بوجھل

کھڑے ہوئے تھے سرِ بام سوچتے بادل
نہ جانے شوخ ہواؤں نے کس طرح چھیڑا
ہر اک ابر نے اُلٹی بھری ہوئی چھاگل
لپٹتی پھرتی ہیں الھڑ کنواریوں کی طرح
ہوائیں کھڑکیوں، دروازوں اور پردوں سے
فضا کو دیکھتی ہیں نیند کے جھروکوں سے
ہم اپنے شہر کے محفوظ چُپ مکانوں میں
کبھی ہیں حبس و تمازت کے بازووں میں نڈھال
کبھی ہیں شوخیِ ابر و ہوا سے مست و نہال
یہ ابر و باد کا کھیل اور یہ نیم باز آنکھیں
گلہ تمازتِ آب و ہوا کا کرتی ہیں
تلونِ مزاجِ آب و گِل سے ڈرتی ہیں

ہمارے شہر سے دور اک دیارِ بے خوابی
تمام شوخیِ ابر و ہوا سے بے پرواہ
تلونِ مزاجِ آب و گِل سے خوار و تباہ
سکون ڈھونڈتا پھرتا ہے گھر کے گوشوں میں
تلاش کرتا ہے نیندیں کشودہ آنکھوں میں
لہولہان ہیں نیندیں، بدن دریدہ ہیں خواب
تعاقبِ تن و جاں میں ہے مرگ خانہ خراب
فلک سے گرتی ہے موت آ کے ہسپتالوں میں
میزائل آگ لگا دیتے ہیں خیالوں میں
ہوا کے دوش پہ بمبار آتشیں بادل

فضا کے سینے میں پیوست برچھیوں کے پھل
تفنگ و توپ کے غول اور ٹینکوں کے دَل
زمیں کے سینے کا ہر چاک مشہد و مقتل
دریدہ جسموں کی دیواریں، استخواں کے محل
شکستِ خواب کی فصلیں، مہاجرت کے پھول
تباہیوں کی حکومت، ستم کا دَل و مَل
مکان قبر ہیں آبادیاں ہیں قبرستان
ہیں سڑکیں بے کفن و گور لاشوں کے جنگل
ضعیف خاک بسر، نوجوان سینہ فگار
زنان برہنہ سر و بیوہ و پسر مُردہ
ہے شیر خواروں سے شیر و شکر فرشتۂ موت
مدارس و طلبہ لقمۂ دہانِ اجل

ستم گزیدۂ ماضی ہیں حال کے قاتل
اُٹھے ہیں گیس کے کرّوں سے موت کے ڈھانچے
بھرے ہیں خول میں آنکھوں کے سرد انگارے
قفس سے پسلیوں کے جھانکتا ہے اندھا خلا
ہے پھیپھڑوں کی جگہ سم چشیدہ موجِ ہوا
جفا رسیدوں کی نسلیں بنیں جفا پرور
ہیں خانہ زادِ ستم خود ستمگروں کے امیں
اُگی ہے خاکِ مقاتل سے قاتلوں کی فصل
کہ قتل قتل کو دیتا ہے جنم، ظلم کو ظلم
طلسمِ ساحرِ مغرب کا یہ کرشمہ ہے

ہیں اُس کے ظلم کے مقتول اُس کے آلۂ کار
جو نفرتیں ہوئیں ایذا کدوں میں پل کے جواں
گُل ان کے پک گئے اور خاردار شاخوں کی
قلم لگائی گئی لا کے ارضِ مشرق میں
کہ یہ بڑھے تو پھلے پھولے حرصِ صیہونی
ہر ایک شاخ سے پیدا ہوں غاصب اور خونی
رمائے بیٹھا رہے غرب امن کی دھونی

تمام ارضِ خدا ہے زمینِ بے وطناں
بسیں یہود نہ کیوں قلبِ شرقِ وسطیٰ میں
ہوں زادگانِ فلسطین در بدر تو ہوں
بسے بسائے ہوئے گھر اکھاڑ کر جڑ سے
تمام مشرقِ وسطیٰ میں یوں بکھیرے گئے
انھیں کوئی بھی زمیں آج تک نہ راس آئی
اُگے زمینِ وطن پہ غلامیوں کے درخت
مسافرت میں ہیں افلاک کج، زمینیں سخت
جو مہرباں ہو، وہ بربادیوں کو دعوت دے
جو میزبان بنے اپنے گھر میں آگ لگائے
مہاجرین کو حاصل ہے گھر نہ جائے اماں
ہیں خیریت سے عرب کے شیوخ اور شاہاں
بفضلِ زر ہیں مہیا سکون کے ساماں
ہے ریگ زاروں میں ایواں سے دور تابستاں
شرابِ عیش کی جُو سے ہیں سبز نخلستاں

حرم سراؤں میں ہیں شرق و غرب کی پریاں
عوام کے لیے نافذ حدودِ شرعِ متیں
ہے حاکموں کے لیے کوئی حد نہ کوئی دیں
فلک سے ہوتا ہے امریکی ڈالروں کا نزول
زمینِ گرم سے اگتے ہیں شہوتوں کے پھول
نہ کوئی حق نہ کتاب و خدا نہ پیغمبر
کہ رب و رازق و آمرزگار ہے ڈالر

ہیں رہن غیرت و جرات تعیشات کے ہاتھ
جہاد ہے یہی عشرت کدوں میں رقص رہے
ہے سامراج کی مرضی خودی کا استحکام
اگر ہو رحمتِ امریکیاں جہاں میں عام
ملے گا دیں کو بھی، ظلّ اللہ کو بھی دوام
زمیں کی دولتیں، خلدِ نعیم اور نعمات
قصور و حور و حکومت، شراب و قند و نبات
ملیں یہیں تو کرے کون کل کی فکرِ نجات
ہیں کل کے خرما فروش آج نفت کے تاجر
ملے ہیں خانہ بدوشوں کو پنج تارہ محل
ہے ناقہ بانوں کے ہاتھوں میں راکٹوں کی لگام
ہے گلہ بانوں کے زیرِ نگیں زمانہ تمام
اور ان کے سر پہ ہے امریکی سامراج کا تاج
زمین دیتی ہے ان کو سیہ طلا کا باج
مہاجروں کا ہے کوئی تو ایک ربّ انام

کوئی عطش کا ہے ساقی، نہ بھوک کا پرساں
مجاہدوں کے لیے زندگی ہے ریگستاں
مہاجروں کے لیے تنگ دہر کا داماں
کہاں ملے گی فلسطینیوں کو جائے اماں
کہو یہ اُن سے سفر ہے وطن بھی، منزل بھی
یہی سفینہ یہی موج بھی ہے ساحل بھی
کہو کہ عیش تمہارا ہے غسلِ خاک و خوں
تمہارا درد ہے سرمایہ اور زر ہے جنوں
تمھاری در بدری بے گھری شبستاں ہے
تمھارا قتل بھی جینے کا ایک عنواں ہے
تمھارے سامنے رقصاں قضا، غزل خواں ہم
تمھاری راہ کے ہیں سنگِ میل خوں کے نشاں

ہے غم ہی کس کو جو صیہونیت کے لشکر سے
ہوں پائمال زمینیں ز مصر تا لبنان
تمام ملکِ خدا ہے مہاجروں کا ملک
ہر ایک رُت میں اُگیں گے زمیں پہ قبرستاں

تمھارے واسطے ہر یوم روزِ عاشورہ
تمھارے واسطے ہر اِک زمیں ہے کرب و بلا
تمھارے سر پہ ہے چھائی ہوئی لہو کی گھٹا
تمھارے حُجلے میں عریاں ہیں موت کی پریاں

غمیں، حزیں بھی ہے، پر ہے ہمہ تبسم گل
وہ زندگی کہ تمہارے دلوں میں ہے رقصاں
تمھارے ہونٹوں سے ہے نغمہ خواں تمام جہاں
تمھارے قدموں سے وابستہ ہیں زمان و مکاں
تمھاری دہشتوں کا سارا غرب شکوہ کناں
حیات و مرگ کی سب شوخیاں تمھاری ہیں
قدم بڑھاؤ، سلاسل اگر چہ بھاری ہیں
نہیں ہے غم جو ہکا ایک یاسر عرفات
تمھارے ساتھ ہے لبنان اور عجم کی سپاہ
جلو میں جس کے سحر ہو، وہ رات بھی ہوگی
اسی سفر کے غبار رواں کے پردے میں
رکاب تھامے ہوئے کائنات بھی ہوگی

(8اگست 1983)

# آنکھ سو جا

خواب باف و خواب زاد و خواب پرور آنکھ، سو جا
دو پہر میں ڈھونڈتا ہے چرخ پر مہتاب کوئی
مانگتا ہے تشنۂ خوں خنجروں سے آب کوئی
جنبشِ مژگاں سے وا ہوتا نہیں ہے باب کوئی
حرف چیں ماشین سے بنتا نہیں ہے خواب کوئی
کیوں اگلتی ہے تو اپنے لعل و گوہر، آنکھ سو جا
خواب باف و خواب زاد و خواب پرور آنکھ، سو جا

☆☆☆

اجنبیت کے خیابانوں میں دست و پا نہ سوئیں
بھاگتے وحشت زدہ، مجنوں سوار و راہوار
ناشناسا نام، بے اسماء ہجوم بے کنار
شیر و نان و گوشت کی دوکان پر لمبی قطار
ہر نفس کارآمد و باطل شماروں کا شمار
احتیاجات اس جہاں میں اک گھڑی اصلاً نہ سوئیں
ہاں، خیالوں کے دھندلکوں سے منور آنکھ سو جا

اے نویسندۂ مشکیں دوزہ اے قلم خاموش ہو جا
منتشر افکار کے کج مج زباں میں ترجمے
بے زبانوں کی زباں کے کرتبوں پر تبصرے
لفظ ہیں زیر و زبر کی گرد میں گم متبصرے
مقبروں میں لفظ کے مدفون تازہ فلسفے
فکرِ معنی آفریں! قبروں سے ہم آغوش ہو جا
خشک ہیزم پر کھلیں گے کیا گلِ تر، آنکھ سو جا

☆☆☆

کاسۂ سر میں خلا بھر لے، خیالوں سے نکل
ہے کتب میں ہر خلا کا اک حوالہ، مانگ لے
علم سے بے معنی لفظوں کا رسالہ، مانگ لے
جہل کے دفتر سے جنت کا قبالہ، مانگ لے
شک اسیری کا بھی کچھ ہوگا ازالہ، مانگ لے
ڈھونڈ راہِ راست، پیچیدہ سوالوں سے نکل
شاخِ جرمِ شاعری کی زہر آور آنکھ سو جا

☆☆☆

ایک خارستاں سے نکلے تو ملا اک ریگ زار
گلستانِ سعدی و گل گشتِ حافظ ہیں گماں
بزمِ رومی، رزمِ فردوسی ہیں گم گشتہ جہاں
ذہنِ بستہ طے کرے گا کیا سخن کے ہفت خواں
ہر طرف ہیں حرف زن آموختہ خواں طوطیاں
واں مقدر تیغ تھی، یاں ہے خوشی کا حزار
واں تھے خوابیدہ، یہاں غائب ہیں منظر، آنکھ سو جا

(اکتوبر 1981)

# منظر خواب و شکستِ خواب کے

جہاں کو خواب کی آنکھوں سے دیکھیں
زندگی کو نشے کے عالم میں دیکھیں
یہ دستک دے رہا ہے کوئی در پر؟
یہ شیشوں پر دریچوں کی ہیں کن کی انگلیاں نغمہ طراز ندہ؟
یہ کن قدموں کی آہٹ سن رہی ہے زینہ در زینہ سماعت؟
غنودہ چشم کیا کیا دیکھتی ہے؟ خواب آسودہ سماعت سن رہی ہے کیا؟
چپک کر چشم و گوش اِک ساتھ کہتے ہیں
صبا کرتی ہے دق الباب، کھولو آنکھ، دیکھو، قاصدِ خوشبو شعار آیا ہے در پر
گُلِ خوبی نے چشم منتظر کی روشنائی سے لکھا ہے عشق کا نامہ
ہزاروں آرزوئیں ہر سطر میں غنچہ ساں گوندھی گئی ہیں
ہزاروں حسرتوں نے حاشیوں پر رنگ چھڑکے ہیں
غزلخواں اور رقاصہ امیدوں نے گُل اور بوٹے ہیں کاڑھے
لفافے پر محبت کے لبِ بوسہ طلب نے مُہر کی ہے

یہ دستک ہے صبا کی
یہ شیشوں پر دریچوں کے طیورِ حرفِ الفت کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ہے
یہ زینوں پر پیامِ نو بہاراں کے قدومِ موجۂ گل آفریں کی چاپ رقصاں ہے
خدا اس خواب کو قائم رکھے
ان چشم و گوشِ خواب زاد خواب زائیدہ کا ہر احساس سچا ہو
مگر دستک کی آوازوں سے شیشوں کے مسلسل رقص کرنے سے
قدم کی تیز تر ہوتی آہٹ سے آنکھیں کھل گئی ہیں
خواب ٹوٹا ہے تو اٹھ کر دیکھ لیں دستک ہے کیسی،
کون شیشوں کو بجاتا ہے؟
قدم نے کس کے زینے خواب کے روندے ہیں،
خوابِ نیم شب کو توڑ ڈالا ہے؟
کھلی آنکھوں نے دروازہ کیا ہے وا
کھڑا ہے در پہ پہرہ دار جبر آمریت
کوئی نامہ نہیں ہے مہر بر لب اس کے ہاتھوں میں
فقط دربار آمر کا ہے پروانہ
یہ پروانہ اذیت خانۂ ظلم و بلا کا داخلہ نامہ ہے یا زندانِ تیرہ کا ٹکٹ ہے
یہ آہٹ خواب میں جو موجۂ گل کی تھی آہٹ موت کے قدموں کی آہٹ ہے
یہ آہنی کارمندوں اور مزدورانِ ساواک وحشی کے آہنی جوتوں کی آہٹ ہے
غنودہ گوش جس کو طائرانِ عشق کی پرواز کا نغمہ سمجھ کر سن رہے تھے
رائفل کی گولیوں کی پھڑ پھڑاہٹ ہے
اُٹھیں اور خواب آلودہ ساعت اور غنودہ چشم کو تہہ کر کے رکھ دیں
خواب گہہ کے ایک گوشہ میں
چلیں پروانۂ دستِ قضا کو جاگتی آنکھوں سے پڑھ لیں

سماعت سے کہیں اب صرف فوجی آہنی جوتوں کا نغمہ جا گتا ہے
فقط بندوقوں، توپوں اور بمباروں کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں
یہ نغمہ کو بہ کو، خانہ بہ خانہ تخم ریزی کر رہا ہے
ہو میدانِ نمازِ جمعہ یا دانش کدے یا خواب گاہیں
اسی نغمے کے تخمِ نغمہ پرور منتجر ہیں
یہ نغمے نیند کے دشمن ہیں، خوابوں کے ہیں قاتل
اگر پھر آنکھ نے سوچا کہ کوئی خواب دیکھے
تو گھر کی چھت گرج کر برق آسا سر کو کچلے گی
اٹھیں، آنکھوں کے خوابوں سے تہی دو روزنوں سے چار سو دیکھیں

☆

وہ اطفال و زنان و پیر، وہ عشاق و معشوقاں
ہماری طرح جو اپنے شبستانوں میں خوابیدہ نگاہوں اور سماعت سے
بہاروں کے ہزاراں در ہزاراں خواب بنتے تھے
فضا کے دوش پر بمبار طیاروں کے بےچہ واقعہ گو نغمے سن کر جاگ اٹھتے ہیں
ہوا کی موج پر گُل آفرینی کرنے والے راکٹوں کے پاؤں کی آہٹ نے
اُن کے خواب روندے ہیں
وہ جاگے ہیں تو اُن کی خواب گوں آنکھیں پھٹی سی رہ گئی ہیں فرطِ حیرت سے
یہ اِک شہتیر اٹھا کر دیکھ لیجے، اِس کے نیچے دو کھلی آنکھیں دبی ہیں
ذرا اُن آگ سے جھلسی ہوئی اینٹوں کو الٹو
وہاں کچھ خواب گوں دیدے کشادہ ہیں
وہ کاسے جن کے اندر مردمِ دیدہ کے مامن تھے
اُدھر کچھ دوُر بدرو میں شکستہ کشتیوں کی طرح بہتی ہیں وہ آنکھیں
جو دریچوں کے درخشاں آئینوں میں آنے والی زندگی کے کارواں کو دیکھتی تھیں

وہ ریزہ ہو کے آئینوں کی کرچوں میں پڑی بیداریوں کا خوں بہا اور خواب کا قرضہ بیکانی ہیں
وہ آنکھیں جو نہیں تھیں راکنوں کی دسترس میں
وہ اپنی دوسری محبوب آنکھوں کے جنازوں پر لہو روتی کھڑی ہیں
وہ اپنی خواب گاہوں کے سیہ جھلسے ہوئے ملبے میں خوابوں کا اثاثہ ڈھونڈتی ہیں
کوئی ''ماں آنکھ'' اپنی کوکھ کی غنچہ صفت نیند پر آنسو بہاتی ہے
کوئی ''باپ آنکھ'' اپنے ''پارۂ دل آنکھ'' کی بیدار میت پر ہے گریاں
کوئی معصوم آنکھ اپنی یتیمی کے جنازوں پر ہے نوحہ خواں

☆

عجب بیدار منظر ہے
جواں آنکھیں، جہاں دیدہ ضعیف و ناتواں آنکھیں
ثمیں، معصوم، حیراں، گل نشاں آنکھیں
مناظر کے ہر اک چپے پہ بکھری ہیں، کھلی ہیں
یہی وہ عالمِ بیدار ہے، ہم خواب جس کا دیکھتے تھے
یہی وہ عالمِ بیدار ہے، جس کی بشارت سب صحیفے آسمانوں کے
زمیں کی سب کتابیں دے رہی تھیں
ملائک کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کہہ رہی تھی
زمیں کے آسماں پرواز ذہنوں کا تھا پیغامِ مسلسل: ''خواب سے جاگو''
ہم اِک تنہا کہا کرتے تھے: ''آنکھیں بند کرلو، خواب دیکھو''
ہمارے ایسے احمق اور بھی گذرے ہیں جو کہتے رہے ہیں:
''جہاں کو خواب کی آنکھوں سے دیکھو، زندگی کو نشے کے عالم میں برتو''
ہماری کون سنتا؟ آنکھ کو بیدار ہونے کی تمنا تھی
سماعت کو کھلے کانوں سے شورِ زندگی سننے کی خواہش تھی
سو آنکھیں جاگ اُٹھی ہیں اور سماعت گوش بر آوازِ پائے زندگی ہے

سو آنکھیں دیکھتی ہیں زندگی کے ان گنت چہروں کے پیچھے صرف اک چہرہ
یہ چہرہ ہے شکستہ، خون گشتہ آنکھ — مرگِ ناگہانی!
سماعت سن رہی ہے، زندگی کی سارے نغموں کے پسِ پردہ مسلسل ایک نغمہ
یہ نغمہ موت کے قدموں کا نغمہ ہے!

☆

عجب بیدار، وحشت ناک منظر ہے
ہم اپنے خواب کے منظر میں پھر واپس چلے جائیں
وہاں اب بھی ہے چہرہ زندگی کا، زندگی کا واقعی چہرہ
وہاں اب بھی ہے نغمہ زندگی کا، آنے والی زندگی کا سرمدی نغمہ
جہاں کو جاگتی آنکھوں سے مت دیکھو
جہانِ زندگی کو ہوش کے عالم میں مت برتو
جہاں کو خواب کی آنکھوں سے دیکھو
زندگی کو نشے کے عالم میں سمجھو

(تہران، یکم اپریل 1985)

# سخن، اے ہمدمِ دیرینہ

(راہ مضمونِ تازہ بند نہ ہو)

سخن! اے ہمدمِ دیرینہ، دم ساز!
شناسائے زبانِ دل، رفیق و محرمِ راز!
سخن! اے مونسِ خلوت، جلیسِ بزمِ تنہائی
خزینہ دارِ الہام و زباں دانِ اسیرِ خامہ فرسائی
ترے آتے ہوئے قدموں کی آہٹ دور سے پہچان جاتا ہوں
کسی عالم کسی حالت میں ہو ذہن
تیری دستک کے خاص انداز کو میں جان جاتا ہوں
تری نرم و سبک دستک کی آواز
ہزاروں چیختی آوازوں کے یلغار میں بھی
گوشِ جاں تک آ ہی جاتی ہے
شریر، آوارہ، برہم اور بے معنی صداؤں کا ہجوم
تری آمد سے ہو جاتا ہے خاموش

ترے لب کھولتے ہی شور کے لب بند ہو جاتے ہیں
مری روح پردہ دار و کم آمیز و محجوبہ
نقابیں اپنے چہرے سے ہٹا دیتی ہے
سب آلائشوں کو دور کر کے
تمام آوازوں پر در بند کر کے
تجھے سننے کو، تجھ سے بات کرنے کو
سماعت کے دریچے، نطق کے در باز کرتی ہے

زباں تو میری ہرجائی ہے
دنیا بھر کی آوازوں سے ملتی، بات کرتی اور ہنستی ہے
وہ شور و غل کا مفہوم اور نعروں کا بھی مطلب بھانپ لیتی ہے
کسی کو مسکرا کر دیکھتی ہے
کسی سے آگے بڑھ کر بات کرتی ہے
کسی کو دیکھ کر چیں بر چیں ہوتی ہے تلخی سے
کسی سے بے ملے کترا کے آگے کو نکل جاتی ہے تیزی سے
ہیں اس کو یاد رسمی لفظ، آداب و مراتب آشنا ہے
وہ بے معنی تکلم، بے سروپا گفتگو بھی جانتی ہے
بھرا ہے اس کا ترکش پھبتیوں، طعنوں، لطیفوں قہقہوں سے
اسے معلوم ہے کس طرح اوروں کی زباں کو
چست فقروں، نکتہ چینی، بذلہ سنجی سے کیا جاتا ہے خاموش
اسے زخموں کے لب سے، نشتروں کی تیز منقاروں سے باتیں کرنا آتا ہے
وہ کینہ دشمنی نفرت کے تیور
طنز اور دشنام کے حربے سمجھتی ہے

جواب ان کو اسی تیور، اسی حربے سے دیتی ہے
زباں خاموش، باتیں روح کی سنتی ہے
لیکن لاکھوں آوازوں کے نرغے میں جواب اکثر نہیں دیتی

مری دیر آشنا، کم گو، کم آمیز و فسردہ روح
زباں کی ہرزہ گوئی سے خفا ہو کر
چلی جاتی ہے خاموشی کے حجلے میں
خود اپنے اور میرے درمیاں پردے ہزاروں ڈال دیتی ہے
وہ سب کچھ دیکھتی ہے
وہ سب کچھ جانتی ہے
مگر اک حرف بھی آنے نہیں دیتی زباں تک
زباں اور روح کے اس فاصلے کی کشمکش میں
میں اپنے روح کی آواز سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہوں
سخن! اے ہمدم دیریں
دیارِ غیر کی بیگانہ دنیا میں
زباں بھی میری ساکت ہو گئی ہے
اُسے تھے یاد جتنے نطق کے حربے، ہوئے گم
زبانیں ہی زبانیں چار سو ہرزہ سرا ہیں، اور میں گم صم
مری روحِ سخن آگاہ پردے کھینچ کر خلوت گزیں ہے
سخن! اے محرمِ روحِ معانی
زباں نادم ہے اپنی سرکشی خیرہ سری پر
شغب و شور سے تنگ آ چکی ہے
اگر تو آ کے کر دے روح سے اس کی سفارش

تو شاید روح اس سے بات کر لے
خموشی ٹوٹ جائے
گفتگو کی راہ نکل آئے
زباں اور روح میں پھر دوستی ہو
شکستِ خاموشی ہو
سخن! اے ہم سفر، اے محرمِ دیریں
تو نازل ہو تو مجھ سے آشنا ساری صدائیں لوٹ آئیں گی
انیس و میر و غالب کی صدائیں
اور خام و پختہ آوازیں معاصر کی کریں گی مجھ سے باتیں
یہ آوازیں سمجھتی ہیں زبانِ حافظ و فردوسی و سعدی
یہ شعرِ نو کے مبہم رمز مجھ پر کھول دیں گی
زبانیں گفتگو کی مختلف ہیں، اجنبی، نا آشنا باہم دگر ہیں
صدائیں روح کی اک دوسرے سے آشنا ہیں
یہاں الفاظ کے مابین دیواریں نہیں ہیں
اسالیبِ سخن نا آشنائے مرز و ملت ہیں
سخن! تو روح کا محرم ہے
غرب و شرق کے سارے سخنور روح کی باتیں سمجھتے ہیں
تو اپنے اس شناسا قافلے
اس اُمّتِ روحانیاں کے ساتھ میری روح کی خلوت میں وارد ہو
تو میری روح تنہائی کا گوشہ ترک کر کے
زباں کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں اُتر آئے
سخن کا باب پھر اک بار کھل جائے

18 نومبر 1985

# تسخیرِ فطرت

دو شاخوں کی بغلگیری، ہم آغوشی کی گرمی بوسہ در بوسہ مہکتی ہے
ہوائیں گنگناتی ہیں، نشے میں سرشار ہو کر رقص کرتے کرتے کر لیتی ہے بند آنکھیں
محبت کی ردا سے ڈھانپ دیتی ہیں بدن ان کا فضا کی دردمند آنکھیں
ہم آغوشی کے منظر کی مہک دامن میں بھر کر
صبح دم اک اک شجر کو مژدۂ تخلیقِ نو دیتی ہیں آوارہ صبا کی ارجمند آنکھیں
شرابِ وصل سے سرشار شاخیں جب لجا کر دیکھتی ہیں چار سُو
نظر آتی ہیں اُن کو ہر طرف گلشن میں شیریں شیوہ گر آنکھیں
چھپائے دولتِ آبستنی اک شاخِ نازک بطن میں اپنے
عجب ناز حیا آلود سے ڈر ڈر کے چلتی
بارِ تخلیق کے سرشار رہتی ہے
پھر اک دن انگلیاں موجِ صبا کی گدگداتی ہیں
تو شاخ اپنے تنِ نازک سے اک کونپل اُگلتی ہے
ہوائیں پالتی ہیں، دھوپ اسے بانہوں میں لے کر چومتی ہے

فضا اپنی نمی سے روز اس کو غسل دیتی ہے
رگوں میں شاخِ نورس کے عسل اور شیر اترتا ہے
عناصر مہرباں فطرت کے برسوں چاکری کرتے ہیں پیہم
تب کہیں اک غنچۂ نو پھول بن کر مسکراتا ہے
چمن اشجار کی شاخوں کے لاکھوں ہاتھ اٹھا کر عرش کی جانب
شب و روز اپنے خالق سے دعائیں مانگتا ہے
کسی بھی شاخ کی کونپل نہ مُرجھائے سمومِ آتشیں سے
کسی بھی شاخ پر ہنستا ہوا غنچہ نہ ٹوٹے جورِ گلچیں سے

طلوعِ آفرینش کے ہزاروں در ہزاروں قرن گزرے
عملِ تخلیق کا اب تک ہے جاری شاخ در شاخ اور گُل در گُل
دعاؤں کے اُٹھے ہیں ہاتھ اب بھی روز و شب ہر وقت ہر جانب
گذشتہ کتنی صدیوں سے فضا کے لب نہ جانے کیوں سم افشاں ہیں
ہوائیں نشوِ گل کی آرزوؤں سے نہ جانے کیوں گریزاں ہیں
شگوفے مہر بر لب، خاک آلودہ ہیں شاخیں، سر بہ زانو نونہالاں ہیں
کہا تھا اُس نے
فطرت کو تمہیں تسخیر کرنا ہے
ہوائے تند کو زنجیر پہنانا ہے، سیلابوں کے بڑھتے پاؤں کو گل بستہ کرنا ہے
سنا ہم نے یہ فرماں
اور ہواؤں سے کہا شاخوں کو توڑو، پھول نوچو اور شگوفوں کو نہ کھلنے دو
کہا بادل سے وہ برسے نہ ارضِ رنج خواروں پر
کہا سورج سے وہ چمکے نہ کٹیاؤں پہ اور نہ خاکِ راہ پر
لگائی قید ہم نے روشنی پر، دھوپ پر، موجِ ہوا پر، ابرِ باراں پر

اگر پھر بھی پھلیں پھولیں کہیں شاخیں
تو ان کو یورشِ لشکر نے روندا، ہر روش پر سر بریدہ غنچگاں کو چمن کے مینارے اُٹھائے
چمن لوٹے، اجاڑے شہر، مٹی میں ملا دیں سینکڑوں برسوں کی تعمیریں
دعا کے ہاتھ کاٹے، گل زمینوں سے کہا اُگلیں وہ شمشیریں
جہاں پر برگ و بار و گل کا رے کر واسطہ شاخیں دعائیں مانگتی تھیں
زباں تیغوں کی، آتش بار لب توپ اور میزائل کے
سنائیں موت کا فرماں
کہو یہ باردار آسودہ شاخوں سے
وہ اپنے غنچہ و گل لشکروں کی تند خونیں موج کو سونپیں
یہی تخلیق سے سرشار رہنے والی شاخوں کا مقدر، منتہا ہے
کہ ہم نے آج فطرت کو مسخر کر لیا ہے

(تہران 14 جنوری 1986ء، 23 تیر 1365 ھ ش)

# مائیکل انجیلو کے ساتھ ایک دعا

اندھری رات کے پر ہول سناٹے سے
روشن دن کے ہیبت ناک شور وغل کی گہرائی میں سوتی خامشی کی بے کناری سے
کوئی آواز دیتا ہے
کوئی آواز میری روح کے خلوت کدے میں قطرہ قطرہ گر رہی ہے
زمستاں کے یخ آغشتہ دریچوں پر کسی کی انگلیوں کی گرم دستک پھر رہی ہے
پچاس ادوار پورے ہو چکے ہیں تین سو پینسٹھ دنوں کے
اور اتنے ہی بدلتے موسموں کے چاک کی گردش میں بس کر
جسم خستہ ہڈیاں کمزور اور عضلات ڈھیلے پڑ گئے ہیں
اور تار اعصاب کے برسوں تنے رہنے سے بس اب ٹوٹنے کو ہیں
ہمیشہ گھومتے محور کے اطراف ایک ہی سی گردشوں کے دائرے میں
تن کا حیواں تھک چکا ہے ہانپتا ہے
کوئی آواز ان سب گردشوں کے دائروں کی خامشی کے ماورا سے آ رہی ہے
وہ آواز آج بھی اتنی ہی روشن اور جواں ہے

جس قدر ان گردشوں کی ابتدا میں روح کو محسوس ہوتی تھی
وہی آواز
۔۔۔یہ فیضان ہے جس کا کہ خستہ، ہانپتے حیواں بدن میں قید
میری روح اب بھی نوجواں، معصوم ہے
پیری و کہنہ سالگی سے ناشنا سا ہے
یہی آواز نوے سال سے بوڑھے بدن میں قید روحِ نوجواں کی قوتِ تخلیق بن کر
بطونِ سنگ میں خوابیدہ دست و پاؤں سر کو اپنے تیشے سے جگاتی تھی
انھیں چشم و دماغ و گوش کی دولت عطا کرتی
تھکانے والے چاکِ وقت کی گردش سے دے کر حریت
اس اک زماں میں زندہ کرتی تھی
ازل سے تا ابد جو ایک ہے نا قابلِ تقسیم ہے
تخلیق در تخلیق در تخلیق......کلا انتہا اک سلسلہ ہے
یہی آواز اک چیپل کی چھت میں ہر کن کے اولین لمحے کی خلاقی کی شاہد تھی
طلوعِ آفتابِ آفرینش کے مناظر نقش کرتی تھی
اسی آواز کی انگلی پکڑ کر آدم و حوا کے جامد کالبد میں جان آئی تھی
اسی آواز کا تھا سرمدی نغمہ کہ جس کے سب سے اونچے سُر کے رنگوں سے
قیامت اور مابعدِ قیامت کے مناظر جاگ اُٹھے تھے
جہنم اور جنت کو اسی آواز کی آنکھوں سے خلاق آدمی کی آنکھ نے دیکھا، دکھایا تھا
اسی آواز نے اقلیدسی شکلوں، خطوں نقطوں کا ایسا جال پھیلایا
کہ وہ گنبد جسے عمریں گنوا کر بھی مہندس گنبدِ گردوں کے دامن میں نہ رکھ پائے
نو دسالہ لرزتی انگلیوں نے رکھ دیا دوشِ فضا پر
خدایا! آفرینندہ
ازل بھی آفریدہ ہے ترا ہی اور ابد بھی حکم سے تیرے ہے پائندہ

ترے ہی امرِ کُن کی ہے صدا، جو روح کے خلوت کدے میں گونجتی ہے
ترے ہی امرِ کن کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا جو نوے سال تک جاگا کسی کی انگلیوں میں
جو مرمر کی سلوں کو بخشتا تھا کالبد اور کالبد کو روحِ آسودہ
جو دیواروں چھتوں پر آفرینش کے مناظر کو جگاتا اور دکھاتا تھا
خدایا! آفریندہ
ترے ہی امرِ کن کی نغمگی سے روح ہے زندہ
خداوندا!
یہ آواز اُن لبوں کو کیوں نہیں چھوتی جو تیرا نام لے لے کر فضا کو شور سے آلودہ کرتے ہیں؟
یہ آواز آج کیوں محراب و منبر کی بلندی سے چہکتے طوطیوں کے لب پہ آ کر سونے لگتی ہے؟
یہ آوازوں کے بندے
حلق جن کے شور و شر کے کارخانے، موت کے پیغام بر اور قتل و غارت کے پیامی ہیں
کبھی ان پر بھی ہو تخلیق کا کربِ خموشی آشکارا
کبھی ان کے شکم آسودہ جسموں پر بھی نازل کر
وہ ہیبت ناک سناٹا
کہ جس کی ہولناکی میں نزولِ حکمِ ''اِقرأ'' ہو
خدایا! آفریندہ
یہ آخر کن گناہوں کی سزا میں
تو نے مجھ کو کاغذی لفظوں کی بے معنی صداؤں کے سلاسل میں کیا بستہ
مجھے اس شور کرتی، کھوکھلی آواز کے زنداں سے دے حکمِ رہائی
دہائی قوتِ تخلیقِ مطلق کی دہائی
ان آوازوں کی سنگیں، نعل بستہ ٹھوکروں سے کان تو کر ہو چکے ہیں
کہیں وہ روح بھی، جو ناشنیدہ نغمگی کی منتظر ہے کر نہ ہو جائے
مرے اطراف ہر سو حلقہ در حلقہ کڑکتی اور گرجتی یہ صدائیں

ہوں کیسے آشنا تخلیق کی رمزوں سے
کیسے جسم ان کے چیختے رہنے سے باز آئیں
انھیں تو جنگ کی بھٹی کو دہکاتا ہے اور شعلوں کے لب سے بات کرنا ہے
خدایا! خالقِ مطلق
بدن آشفتہ آوازوں کے تیرا نام اتنی بار اتنی زور سے دہراتے رہتے ہیں
کہ آوازوں کی تہہ در تہہ چھتوں میں قید روح و دل
خوشی کے قدم کی چاپ اور آہستہ دستک سن نہیں سکتے
عطا کر تو انھیں خاموش رہنے کی بھی توفیق اے خالق
کہ ان سے بھی کبھی کچھ کہہ سکے سرگوشیوں میں قوتِ تخلیق اے خالق!
خدایا! آفریندہ!
نکال اس بندۂ عاصی کو گردابِ مواعظ کی ہلاکت سے
عذابِ دوزخ و تحسین کے قصرِ مذلت سے
رہائی دے وصالِ حور کے وعدوں سے شہد و شیر کی نہروں کی کثرت سے
مجھے آزاد کر خوفِ جہنم، حرصِ جنت سے
خدایا! اے مجیبِ ہر دعائے اول و آخر
ہے تو ہی عارفِ ہر باطن و ظاہر
بس اتنی ہی دعا ہے
مجھے ان نوے سالہ انگلیوں کی قوتِ تخلیق کا رمز آشنا کر
وہ جن کی آخری جنبش میں بھی تخلیق کی حمد و ثنا تھی
کسی پتھر کو دل، دیوار کو جاں بخشنے کی التجا تھی
مجھے بھی آفرینش کے کرشموں کا ہو عرفاں
مرے لفظوں میں روحِ کن ہو پھر اک بار رقصاں

(تہران، 10 جولائی 1986)

# ساقی نامہ

محبسِ ذات میں ہوں بستۂ دنیا ساقی
نہ تو کھلتے ہیں دریچے، نہ ہے در وا ساقی
حبس سینے میں ہے، حالات میں محبوس خیال
دل ہے بے رنگی و یکسانی کا صحرا ساقی
پیڑ پتھر کی طرح چپ ہیں، ہوا ہے خاموش
کیا کھلیں پھول کہ ہلتا نہیں پتا ساقی
خلوتِ شب میں نہ چمکیں جو قبا کے مہتاب
چشمکیں کس سے کرے صبح کا تارا ساقی
کفِ سبزہ پہ نہ رکھے دُرِ شبنم شب اگر
چننے کو آئے شعاعوں کی نظر کیا ساقی
شب ہو بے کیفی و بے خوابی و تنہائی سے چور
تو کسے غسل دے انوار کا دریا ساقی
اُبھرے سورج تو ستاروں کی طرح دل ڈوبے
زرد مہتاب سا ہو روح کا چہرا ساقی

دن کے بے فیض تردد کا ہے آغاز سحر
وقت پیمائشِ بے حاصلِ صحرا ساقی
کارِ منصب ہے کہ اوروں کے خیالات کی قے
بانجھ ذہنوں میں نہیں پھوٹتا انکھوا ساقی
یا وہ اہلِ مناصب سے چھلک جاتے ہیں کان
ہرزۂ زعمِ خرد جہل کا پردا ساقی
چہروں پر صحت و سیرابی و سیری کی چمک
ذہنوں میں اترو تو پُر ہول اندھیرا ساقی
ہر طرف جرم و ہوس، ظلم و تشدد کی فضا
معصیت خیر ہے، شر عدل سراپا ساقی
سر پہ دستارِ فضیلت ہے، قبا پر اسناد
اور زبانیں ہیں کہ پولیس کا تھانا ساقی
علم کی بحث میں فحش اور مغلظ الفاظ
زورِ عضلات کو ہے عقل کا دعویٰ ساقی
ادب و فن ہیں غلامانِ زرِ نامحسوب
نظر و نقد پہ ہے حرص کا قبضہ ساقی
بے نیازی و توکل ہو اگر خانہ نشیں
خود پرستی کا ملے نام اسے یا ساقی
فقر کی نانِ جویں بھی نہ ملے چین کے ساتھ
ترکِ دنیا بھی گرفتاریِ دنیا ساقی
طنز و دشنامِ جہاں در پئے قتلِ کردار
ظلم ہے اوڑھے ہوئے چادرِ عقبیٰ ساقی
ماتھوں پر قشقوں کی مانند دہکتے سجدے

کذب اور ظلم کو بھی کرتے ہیں سجدہ ساقی
شام آئے تو چراغوں میں سلگتا ہے دل
ہونے لگتا ہے فزوں اور اندھیرا ساقی
وہ جسے مل نہ سکا مطلعِ خورشید سے نور
مقطعِ نور سے فیض اُس کو ملے کیا ساقی
شام ہے ایک سزا بے سبب و بے میعاد
رات ہے ہجر کی تنہائی کا صحرا ساقی
وہ جو مہتابِ سرِ شامِ غریبی ہوتا
مدتوں چمکا نہیں اُس کا بھی چہرا ساقی
خود فراموشی کو صہبا بھی سہارا کیا دے
وہ بھی بے کیف ہے، نشہ بھی ہے مہنگا ساقی
توڑ ہر نشے کا ہے نشۂ خود آگاہی
ہیں رفیقِ اہلِ دوَل کے مے و مینا ساقی
میں نے ہر زہر پیا، چکھا ہر اک نشے کو
کر سکا کوئی بھی غم کا نہ مداوا ساقی
یہ نہیں سچ کہ میں تیرا ہی سدا ہو کے رہا
کفر و تشکیک کی راہوں سے بھی گذرا ساقی
وہ بھی دن تھے کہ تیرا نام تھا حرزِ دل و جاں
وہ بھی دن آئے، رہا بادیہ پیما ساقی
دشتِ تشکیک میں دوڑا سر و پا برہنہ میں
گمرہی نے لیا لغزش کا سہارا ساقی
سبقِ عدل پڑھا جا کے ہر اِک مکتب میں
نظریوں سے سیا چاکِ نظر کا ساقی
کیا انکارِ خدایانِ جہاں، جسم جلا

دل جلا رو کیا جب تیرے خدا کا ساقی
آج پھر لوٹ کے آیا ہوں تیرے ہی در پر
کہ کہیں بھی نہ ملا غم کا مداوا ساقی
میرے اعمال کے دفتر میں معاصی ہیں بہت
بے نہایت ہے ترے عفو کا دریا ساقی
تونے تو جامِ کرم اپنے ہی قاتل کو دیا
میں گنہگار ہوں پر صرف ذرا سا ساقی
تونے تو اپنے حریفوں کو بھی جاں بخشی ہے
ہے تری تیغ عدالت کی مسیحا ساقی
میری تشکیک تھی اثباتِ صداقت کے لئے
کفر بھی تھا مرا ایماں کا تقاضا ساقی
میری بے سجدگیاں سجدۂ عاشور کا فیض
میری بے طاقتیاں تیرے عطایا ساقی
تو ہے شاہد، کیا انکارِ یزیدانِ زماں
اور قصیدہ ترے شبیرؑ کا لکھا ساقی
تو ہے شاہد کسی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں سر
کیا سجدہ تو کیا سجدۂ زہراؑ ساقی
تو ہے شاہد کہ ہوں گویا بزبانِ شہدا
لکھا ہے مرثیۂ زینبؑ کبریٰ ساقی
تو ہے شاہد کہ چلی جب بھی کہیں تیغِ جفا
رکھا پرچم ترے عباسؑ کا اونچا ساقی
تو ہے شاہد کہ جہاں دشتِ صدا تھا تاریک
ذکرِ لحنِ علی اکبرؑ سے اجالا ساقی
تو ہے شاہد کہ گلوئے علی اصغرؑ کے لئے

زہر پیکانِ ستمگر کا نچوڑا ساقی
تو ہے شاہد کہ ہوئی بیوہ جو اک شب کی دلھن
گوندھا قاسم کے لئے لفظوں سے سہرا ساقی
تو ہے شاہد کہ جو واماندہ شہادت میں رہے
انھیں شبیرؑ کی نصرت کو پکارا ساقی
تو ہے شاہد کہ ہوئے سیدِ سجادؑ جو قید
لکھا زندانوں کو آزادوں کی دنیا ساقی
میرا ایماں ہے فضائل ترے کرتا ہے بیاں
قلم اللہ کا اور خلقِ نبیؐ کا ساقی

## مطلعِ ثانی

بت شکن، قلعہ کشا، عقل پناہا ساقی
عشق سے عقل کو دے غسل، مسیحا، ساقی
دم گھٹے سینے میں یا جس میں ہو قید فضا
نام لیتے ہی ترا آتا ہے جھونکا ساقی
نبض چلتی ہے دھڑک اٹھتا ہے دل چلتی ہے سانس
ترے انفاس سے جی اُٹھتا ہے مردہ ساقی
عہد بھی میرا ہے بیمار، زمیں بھی بیمار
جینے دیتی ہے نہ مرنے مری دنیا ساقی
عشق ہے بوالہوسی، عقل زمانہ کوشی
بے ثمر یہ ہے، وہ جادو کا تماشا ساقی
امتیازات پہ قائم ہے معیشت کا نظام

تاجری دزدی و سرقہ کا ہے پردا ساقی
طرزِ جمہور ہو، شاہی ہو کہ ڈکٹیٹرشپ
چند افراد کے لفظوں کا ہے کھاتا ساقی
فلسفہ لفظوں کی بازی گری و تجزیہ
بحثیں عُمران کی اعداد کا خاکہ ساقی
قطعِ اجزائے حقیقت ہیں علومِ طبعی
آدمی صرف مشینوں کا ہے پُرزا ساقی
انتظامِ مدنی سینہ بہ سینہ تقسیم
نفیِ افراد ہوئی درجہ بدرجہ ساقی
خود فریبی کے ہیں عنواں کلمہ اور تکبیر
رب فریبی کا حسین نام ہے تقویٰ ساقی
طمعِ حور و ثمر، حرصِ شراب و غلماں
مدعا ساری عبادات کا اتنا ساقی
کثرتِ دولت و طاقت کے بھی باوصف امت
قلعۂ خیبرِ حاضر سے ہے پسپا ساقی
سامراجیت و صیہون کی سازش میں اسیر
کلمہ گویوں نے کی بیعتِ دنیا ساقی
پار خندق کے مبارز طلب اہلِ مغرب
اہلِ مشرق ہیں ادھر عجز سراپا ساقی
تیل کے ڈالروں کے نشے سے ایماں مخمور
عیش، آسائشیں اسلام کا کعبہ ساقی
مرمریں قصر ہوا بند، حرارت بستہ
خلدِ موعود کا ہے ریت پہ نقشہ ساقی

سازشِ غرب سے ہے لشکرِ حق بے ترتیب
نشۂ زر سے صفیں ہیں تہہ و بالا ساقی
نام لیوا ہیں ترے ظلم کے نرغے میں گھرے
بھائی بھائی کی مدد کو نہیں آتا ساقی
بوتراب! آج تری خاک لحد کا ہے یہ فیض
ریت ہے چشمۂ زر، خاک ہے سونا ساقی
کل تھے حجاج کی امداد کے محتاج شیوخ
نذروں پر پلتے رہے یثرب و بطحا ساقی
آج اُن خانہ بدوشوں کا مزاج ایسا ہے
ہیں محل غرب کے ایوانوں سے بالا ساقی
حوریاں خلد کی، مے خانے، ہوا بستہ مکاں
سارے اسبابِ تعیش ہیں مہیا ساقی
بے حسی، جہل، شقاوت، ستم و نقرۂ و زر
حافظِ حق کے ہیں اوصافِ حمیدہ ساقی
بند جزدانوں میں ہیں دین و احادیث و کتاب
غرب کے بینک میں محفوظ ہے دنیا ساقی
فقر آلودہ ممالک میں تلاشِ حوراں
عیش آسودہ دیاروں کا ہے سودا ساقی
کفر کعبے سے، مدینے سے اُٹھے زر کی گھٹا
خاک آغشتہ نجف کے ذر یکتا ساقی
خونِ عشاقِ حسینی سے رواں شطِّ عرب
پھر فرات آج عطش کا ہوا دریا ساقی
آندھیاں ڈھونڈتی ہیں حق کے صحیفے کے ورق
موجِ طوفاں میں ہے عترت کا سفینا ساقی

کب تلک لکھتے رہیں مرثیہ و عہد آشوب
کب تلک ذات و زمانہ کا ہو نوحا ساقی
اپنے رندوں کو ہوں کچھ جام یہاں بھی ارزاں
میں نے مانا کہ تو ہے کوثریوں کا ساقی
معرکہ سخت ہے دنیا سے، صلابت ہو عطا
رب نے مانا تری تلوار کا لوہا ساقی
تیری تیغ اُحدی، تیری لسانِ اُحدی
دیں ہمیں برّشِ حق گوئی کی صہبا ساقی
تشنگی جس کی ہے مے خانۂ حاضر کا ستم
کیوں لے احسان وہ پیرانِ مغاں کا ساقی
ہر ہوس تشنہ کو دعویٰ ہے کہ ساقی ہے وہی
کیسے میں مان لوں مُردوں کو مسیحا ساقی
اب بھی در پر ہے ترے بھیڑ بہت پیاسوں کی
اب بھی جاری ہے تیرے فیض کا دریا ساقی
تیرے خدّام کے آگے ہیں شہاں کاسہ بکف
تیرے بیمار ہیں جاں بخش مسیحا ساقی
ساقیِ نطقِ خدا ہیں تیری چوکھٹ پر خم
دمِ عیسیٰ، کفِ موسیٰ، یدِ بیضا ساقی
تری سرکار ازل سے ہے ابد تک پھیلی
تھا نبیوں کا مدد پر تری تکیا ساقی
صبرِ ایوب میں تو، گریۂ یعقوب میں تو
حسنِ یوسف ترے چہرے کا ہے پردا ساقی
تھا ترا شوقِ شہادت زکریا، یحییٰ
کشتیِ نوح کا تھا تو ہی کھویا ساقی

آبروئے سرِ تسلیم براہیم و ذبیح!
ترے بیٹے نے کیا وعدے کو ایفا ساقی
ہے ترا نام جدھر، حق بھی ادھر ہے واللہ
ہے یہی حکم حدیثِ نبوی کا ساقی
اولیا معرفتِ حق کے لیے تیرے گدا
معرفت تیری ہے عرفان کا جادا ساقی
ترے در پر جو گیا، اُس نے نبی کو پایا
تری چوکھٹ پہ ہے جبریل کا سایا ساقی
ہے تجھے علم ہوا کون سے لہجے میں خطاب
عرش پر کیا شب معراج ہوا تھا ساقی
تیرے خوابِ شبِ ہجرت کا بہا کیا ہوتا
مرضیِ رب نے ترا نفس خریدا ساقی
کس کی تلوار کے سایے میں خدا ملتا ہے
اپنی تلوار کے ہونٹوں سے یہ بتلا ساقی
ہوں ترے خواب کہ بیداریاں، خامہ ہو کہ تیغ
سب رضا حق کی ہیں، تو مرضیِ حق کا ساقی
کان ہوں تیرے کہ آنکھیں، ترا چہرا ہو کہ ہاتھ
تیرے اجزائے بدن حق کے ہیں اعضا ساقی
جو تجھے دیکھے اُسے اجر تلاوت کا ملے
تیرا چہرہ ہے کہ قرآن کا صفحا ساقی
تجھ کو پہچانا رسولؐ دوسرا یا رب نے
جاننے کی طرح تو نے انھیں جانا ساقی
منقبت کا حق ادا ہو جو ہو فیضانِ رسولؐ
نعت لکھوں تو ہو یہ نشہ دو بالا ساقی

## نعت

گلہ دنیا سے نہ غیروں سے ہے کینہ ساقی
دے مجھے جامِ تولائے مدینہ ساقی
جس کی کرنیں ہوں وحی، دھوپ ہو جس کی دانش
تو اُسی نور سے بھر دے مرا سینہ ساقی
عشق کے چاک پہ ڈھلوانے ہیں پیمانہ و خم
ہو عطا خاکِ درِ شاہِ مدینہ ساقی
گردِ اُس کوچے کی پھولوں سے ہے خوشبو میں سوا
جہاں ٹپکا ہے محمدؐ کا پسینہ ساقی
کہہ دے اُمّیؐ سے بھرے علم سے جھولی میری
تو ہے در علم کا اور وہ ہے مدینہ ساقی
عمر بھر چھو کے کفِ پائے نبیؐ ٹھہرا ہے
در ترا لولو و مرجاں کا خزینہ ساقی
بادباں جس کا کتاب اور ہے عترت رہبر
پہنچے گا تا لبِ کوثر وہ سفینہ ساقی
خاتمِ ختمِ رسالت کی ضیا ہے جس میں
کربلا میں ہے وہ نایاب نگینہ ساقی
کاظمین و نجف و سامرہ و مشہد و قم
شہر در شہر ہے احمدؐ کا مدینہ ساقی
ہے درِ فاطمہؑ معراج کا پہلا زینہ
سدرہ معراج کا ہے دوسرا زینہ ساقی
رہروِ جادۂ شکر اپنی حدوں سے نہ بڑھے

تو ہی مے نوشی کا سکھلادے قرینہ ساقی
ذہن بخشا ہے تو اسبابِ سکوں بھی ہوں عطا
دل نے سیکھا نہیں جینے کا قرینہ ساقی
دامنِ عفوِ محمدؐ جو ملے، نذر کرو
ہے وحید آنکھوں میں اشکوں کا دفینہ ساقی

## مطلعِ ثالث

درِ سرکارِ نبوت کو جو چوما ساقی
تیری مدحت کا قلم اور بھی چمکا ساقی
کتنے عنوانوں سے تیرا ہی وہاں ذکر سنا
ساغرِ نطقِ وحی جام ہے تیرا ساقی
دین و دنیا کا اخی تجھ کو رسالت نے کیا
جن کے مولا ہیں نبیؐ، اُن کا ہے مولا ساقی
تیری اک ضرب ہے ثقلین کی طاعت سے گراں
کُلِّ ایماں ہے تری تیغ کا سایا ساقی
نورِ اوّل کی رسالت میں ہے شامل ترا نور
عقلِ اوّل ہے ترا مبدء و منشا ساقی
تو امینِ دو جہاں کے دل و جاں کا ہے امیں
اپنی بضعت کو نبیؐ نے تجھے سونپا ساقی
سائلوں کو دیا وہ کچھ کہ ید اللہ بنا
وحیِ رب بھی ہے تری دست شناسا ساقی
سر پہ ہے تاج ترے نصرت و فتحِ رب کا

تیرے سینے پہ ہے تطہیر کا تمغا ساقی
سورۂ فتح قصیدہ تری تلوار کا ہے
شجرِ نور قلم نے ترے سینچا ساقی
نہرِ دریائے احادیث بلاغت تیری
موجِ قرآں ترا ہر نامہ و خطبہ ساقی
تیرے فرمان ہیں احکامِ خدا کی تفسیر
لفظ ہیں اسوۂ احمدؐ کا سراپا ساقی
ہیں فرامین ترے لائحۂ مستقبل
ترے اشعار ہیں تاریخ کا دھارا ساقی
طوبیٰ تیرا ہی علم، سدرہ ترا نقشِ قدم
حوضِ کوثر ہے ترے جود کا قطرہ ساقی
امتیازِ نسب و رنگ کی قاطع تری تیغ
تونے ہر قصرِ تفوق کا گرایا ساقی
دعوتِ اہلِ دُوَل کی نہ کبھی تونے قبول
ساتھ مسکینوں، فقیروں کو بٹھایا ساقی
توڑا ہر قلعۂ زر نانِ جویں سے تونے
خونِ مزدور میں تر لقمہ نہ توڑا ساقی
فکرِ مخلوقِ خدا میں تو رہا شب بیدار
ہے ترا دیدۂ وا صبح کا تارا ساقی
کس کو خود آکے نبوت نے لیا گودی میں
رحل میں جیسے ہو قرآن کا پارا ساقی
تیرے اوصاف و فضائل کا کہاں تک ہو بیاں
قلمِ رب نے قصیدہ ترا لکھا ساقی
کس کے پیراہنِ بوسیدہ نے یوں شاہی کی

کس کے فاقوں نے کیا ظلم کو پسپا ساقی
نیند میں تجھ کو ملا ہجرتِ ایماں کا ثواب
کس نے یہ طالعِ بیدار ہے پایا ساقی
نیند بھی تیری محمدؐ کی نگہبان رہی
کس نے یوں عہد رفاقت کا نباہا ساقی
تو زمیں پر تھا، نبیؐ عرش پہ سنتے تھے تجھے
کھلی آنکھیں تو ہٹا رات کا پردا ساقی
غلطی ہی سہی، کہتے ہیں نصیری تجھے رب
کچھ تو عیسیٰؑ سے ہے رتبہ ترا اعلیٰ ساقی
کس کی جراری کو آواز نبیؐ نے دی ہے؟
لشکر ایمان کا جب کفر سے ہارا ساقی
کس کے آشوبِ نگہ نے یہ بصارت پائی
وا کی جو چشم، درِ قلعہ ہوا وا ساقی
آسماں سمٹے براقِ نبوی کی زد میں
تیرے دُلدُل نے زمینوں کو سمیٹا ساقی
کس کی اک جست نے کی کفر کی ہر خندق پار
کس نے ہر قلعے کے دروازے کو توڑا ساقی
کیا زمیں تیرے لئے کھینچی زماں نے بھی طناب
ڈوب کر غرب سے سورج اُبھر آیا ساقی
کس کی شمشیر نے کاٹے ہیں زمیں کے طبقات
آج بھی ہے پرِ جبرئیل پہ لکھا ساقی
کس نے کی رہن زرہ ایسے کہ پہنی نہ کبھی
بن گئی کس کی زرہ مرضیِ مولا ساقی
آئیں مریمؑ تو درِ بیت مقدس نہ کھلا

کس کی ماں پر ہوئی دیوارِ حرم وا ساقی
سیر ہوتے رہے مسکین و یتیم اور اسیر
روزہ گھر نے تیرے اس طرح سے رکھا ساقی
تیرے ہاتھوں پہ نہیں داغِ زرِ بیت المال
تو نے محنت کے پسینے سے کمایا ساقی
عرقِ جہد سے روشن ہیں ترے گھر کے چراغ
خونِ دل سے ہے منوّر ترا خامہ ساقی
ہوسِ منصب و جاگیر کی شمعیں گُل کیں
صبر جاگیر، توکل ترا تکیہ ساقی
تخت اور تاج کی بھوکی تھی خلافت کی ہوس
تھی چٹائی تری ہر تخت سے اعلیٰ ساقی
ترے قدموں کے شرف سے ہوئے جب سے محروم
پست تر ہوتے گئے منبر و خطبہ ساقی
حمد اور نعت کا گلدستہ تھا منبر تیرا
بعد تیرے اُسے دشنام نے روندا ساقی
یہ خبر کور نگاہیِ ہوس کو نہ ہوئی
ترے منبر کو ملا عرش کا پایا ساقی
ابدی حق ہے تری نانِ جویں کی شاہی
تو ہے ہر حاضر و آئندہ کا شاہا ساقی
مملکت ظلم کی ہے کرب و بلا سے تا شام
سلطنت تیری ہے تا سدرہٗ و طوبیٰ ساقی
قتل ہے اپنے ہی مقتولوں کے خوں میں غرقاب
جبر خود اپنی ہی گردن کا ہے پھندہ ساقی
شوقِ سیرابیٔ دنیا ہے عطش کا سیلاب

ہوس آسودگیاں طوق کا حلقہ ساقی
نشۂ جامِ یزیدی ابدی پیاس کا نام
پیاس ہے تیرے جگر بند کی دریا ساقی
تو نے جس دہر کو، جس تخت کو ٹھکرایا ہے
ہے گراں اُس سے تری خاکِ کفِ پا ساقی
اُڑ گئیں سلطنتیں گرد کے ذرّوں کی طرح
قلعہ و قصر ہوئے خاک کا تودا ساقی
زعمِ شاہی و خدائی ہے حبابوں کی ہوا
نیل میں غرق ہے فرعون کی دنیا ساقی
رزق دیمک کا ہیں اورنگ و عصائے شاہی
لقمۂ خاک ہوئے قیصر و کسریٰ ساقی
بوڑھیاں کاٹنے کو رات تفنن کے لئے
کہتی ہیں قصۂ اسکندر و دارا ساقی
وقت کے سیلِ تہ کار ہیں تنکے کی طرح
بہہ گیا ہٹلر و چنگیز کا لاشا ساقی
یاد نام اُن کا کسی کو نہ رہے گا کل تک
آج جو خود کو سمجھ بیٹھے ہیں دیوتا ساقی
ثبت عالم کے جریدے پہ ہوا نام اُن کا
مل گیا جن کو ترا جامِ تولاّ ساقی
گھر سے تیرے نہیں جائے گی حکومت تا حشر
تیرے ہی ساتھ امانت ہوئی پیدا ساقی
تنہا دوزخ کی طرف جائیں گے تیرے اعدا
ہوگا اطراف ترے رندوں کا حلقہ ساقی

## مطلعِ چہارم

ہر نفس مصرع ہو، ہر لفظ کہے یا ساقی
عمر کٹ جائے، قصیدہ نہ ہو پورا ساقی
نام لکھ کر ترا قرطاس کے سجادے پہ
سرِ تسلیم قلم کرتا ہے سجدہ ساقی
بوالحسن! سیدۂ عالمیاں کے سرتاج
شیرِ بنتِ اسد و وارثِ زہراؑ ساقی
شاہدِ دینِ ابوطالبِ اسلام پناہ
متقیوں کا ہے تو قبلہ و کعبہ ساقی
میثم و بوذر و عمار ترے جام سے مست
تیری مے سے دلِ سلمان مصفا ساقی
جب تری صبر کی مسند نے حسنؑ کو پایا
قیصریت نے کیا تخت پہ قبضہ ساقی
سر ہوا صلحِ حدیبیہ سے جیسے مکہ
صلحِ شبرؑ سے امیہ ہوئے پسپا ساقی
مظہرِ صلحِ حسنؑ تیغِ دو دم کی تھی نیام
کربلا میں کیا اس تیغ نے جلوا ساقی
ذوالفقار آئی تری ہاتھ میں شبیرؑ کے جب
صبر کے واروں سے لشکر ہوا پسپا ساقی
تیرے رایت سے ہے عباسؑ کا قد دو بالا
لبِ زینبؑ تری جرأت سے ہے گویا ساقی
جب ترے نطق نے طوق اور سلاسل پہنے
لبِ سجادؑ ہوئے معرکہ آرا ساقی

جب ترا علم ہوا سینۂ باقرؑ پہ عیاں
عقل اور علم بنے دین سراپا ساقی
جب تفقہ سے ترے فیض ملا صادقؑ کو
فقہ کے عقدۂ دشوار ہوئے وا ساقی
رخِ کاظمؑ میں جو جھلکا ترے چہرے کا جلال
آ گیا قصرِ خلافت کو پسینا ساقی
تو نے رکھا جو رضاؑ بن کے خراساں میں قدم
طوس میں ایک نجف اور ابھر آیا ساقی
تیرا تقویٰ ہے تقیؑ، تیری ہدایت ہے نقیؑ
عسکریؑ تک رہا ظاہر ترا جلوا ساقی
بعد اُن کے ہے امامت تری پردے میں نہاں
حکمراں عدل ترا ہے پسِ پردہ ساقی
کب سے ہے منتظرِ مہدیؑ موعود جہاں
کہ ترا عدل ہو ظاہر میں بھی برپا ساقی
تیری تیغ و قلم و نطق کے ہیں بارہ نام
ہے امامت سے تری نام رُسل کا ساقی
منتظر تیرے بھلا غیروں کو کیا مانیں امام
منتظَر ہے جو امامت، ہو ہویدا ساقی
مضمحل وقت، زمیں سرد، جہاں ہے زخمی
تو اشارہ جو کرے، آئے مسیحا ساقی
منتظر ہے ترے فرماں کا نظامِ دو جہاں
قم با ذنی کہے تو، دہر کہے یا ساقی
ترے فیضاں کی ہیں موجیں قلم و نطقِ وحید

جو بھی پایا ہے تری مدح سے پایا ساقی
دل آسودہ، لب و خامۂ نا آلودہ
مدح نے تیری مجھے بخشا ہے کیا کیا ساقی
پڑھا حاکم کا قصیدہ، نہ امیروں سے جھکا
ہے مرا شعر تری تیغ کا سایا ساقی
تو ہی رکھ آبروئے نطق و قلم تا دم مرگ
تا نہ ہوں حشر کے میداں میں یہ رسوا ساقی
قبر میں عقدہ کشا ہو گا ترا حرف کرم
زندگی میں بھی ہو ہر عقدہ مرا وا ساقی
یہی لفظوں کے گل و دُر ہیں اثاثہ میرا
تیرے قدموں پہ ہے قرباں یہ اثاثہ ساقی
گر قبول ان کو کرے تو، مری دنیا بن جائے
اور سنور جائے گنہ گار کی عقبیٰ ساقی

(جولائی 1982، دوحاشیہ: مئی 1987)

# عبادت بے زباں ہے

ہمیں الفاظ پر قدرت کا دعویٰ عمر بھر سے ہے
مگر جب مالک و ربِّ حقیقی کے حضور اپنے اُٹھائے ہاتھ کچھ بھی مانگنے کو
زباں میں آ گئی لکنت اور الفاظ آ کے بھی نوکِ زباں تک لڑکھڑائے
مرادِ دل کو ہاتھ آئے نہ وہ الفاظ جو اُس کو بیاں کر دیں
کوئی چارہ نہ تھا جز اِس کے خاموشی کو اور عجز بیاں ہی کو زباں کر دیں
خدا کے سامنے جو بھی تمنا لے کے جاؤ
ورائے لفظ، مافوقِ بیاں ہوگی
خموشی ہی تمنا کی زباں ہوگی

تم انساں ہو ہماری ہی طرح سے
پرستش تو تمہاری کی ہے ہم نے،
پر تمہیں اپنا خدا مانا نہیں ہے
لڑے بھی تم سے ہم، شوخی بھی کی ہے اور ستایا بھی
اگر بگڑا مزاجِ دل کبھی تو پہروں تم کو ہے رُلایا بھی

مگر یہ بات کیا ہے جب ہزاروں میل کی دوری ہو حائل درمیاں میں
قلم کی نوک تک آکر پلٹ جاتے ہیں الفاظ، اُن کے معنی روٹھ جاتے ہیں
جو دل کا مدّعا ہے، اُس کو کہنے کا سلیقہ بھول جاتی ہے زبانِ خامۂ جولاں

ہزاروں کا بھی مجمع ہو، زباں مسحور کر سکتی ہے اُس کو
وہاں الفاظ ہی ہوتے ہیں اپنا مدعا بھی، منتہا بھی
مگر تم سے تمنا کہنا چاہے کچھ تو وہ بس سوچتی رہتی ہے الفاظ
زباں بے بس، نگاہیں عالمِ حیرت میں غلطاں
خموشی کو زباں اپنی بنا کر
تصور ہی میں تم سے بات کرتی ہے

وہ سب مکتوب جو ہم نے تمھیں لکھے ہیں برسوں
وہ سب تقریر کرتے، شعر کہتے، شوخ و رنگیں، دل گرفتہ
اور فسردہ لفظ و معنی کا ہیں جنگل
ہمارا مدعائے دل سرابِ حرف کی موجوں میں اب تک گم رہا ہے
ہر اک خط دفترِ بے مدّعا ہے
بدن کی پیاس، ذہن و روح کی تشنہ لبی کا منتہا ہے

محبت اور عقیدت ہو، پرستش ہو کہ جذباتی تعلق
زباں نے آج تک سیکھا نہیں اظہارِ مطلب کا طریقہ
خموشی ہی کو اظہارِ تمنا کا ہے شاید کچھ سلیقہ

(16 مئی 1988)

# نوحہ

(3 جولائی 1988 کو میری رفیق حیات، ماہ لقا قرائی، ایرانی ایر بس میں بندر عباس سے دبئی کے راستے دہلی کے لیے روانہ ہوئیں۔ چند دقیقوں بعد امریکی جہاز ونسنس نے دو میزائل مار کر جہاز کو گرا دیا۔ دوسرے تمام (290) مسافروں کے ساتھ وہ بھی شہید ہو گئیں، اور ہم اور ان کے بیٹے دہلی ایر پورٹ پر، ماں اور بہنیں اور دوسرے عزیز حیدرآباد میں اُن کا آج تک انتظار کر رہے ہیں۔)

دن نہیں نکلا کتنے دن سے، پھیلے ہوئے ہیں شام کے سایے، تم نہیں آئے
ہو کے پریشاں حال تمہارا پوچھنے آئے اپنے پرائے، تم نہیں آئے

منتظر آنکھ میں سورج ڈوبا، آئی خبر جب تیرے گھر اب صبح نہ ہوگی
تب سے اب تک سینکڑوں نامے، تار، اخبار، ٹیلکس تو آئے، تم نہیں آئے

تم نے جب بھی آنے کا جو وقت بتایا، اس وقت آئے، دیر نہیں کی
وقت وہ کب سے ٹھہرا ہوا ہے، ہم ہیں در پر آنکھ بچھائے، تم نہیں آئے

کون سا شہر تمہیں خوش آیا، کس پانی کی موج نے تم کو روک لیا ہے
کن شہروں میں، کن موجوں میں، وحشت تم کو ڈھونڈنے جائے، تم نہیں آئے

دوستوں، بیٹوں، شاگردوں نے گھر کو چمکا کر آئینہ بنا رکھا ہے
جاگ رہے ہیں سارے دریچے، سب در ہیں باہیں پھیلائے، تم نہیں آئے

باہر بیلا، رات کی رانی، اور گلاب اندر آنگن میں چُپ چُپ سے ہیں
کہو صبا سے اِن کو چھیڑے، اُن کو تمہارے لب سے ہنسائے، تم نہیں آئے

جاننے والے لوگ نہ جانے کیا کہتے ہیں کیا لکھتے ہیں، میں کیا جانوں
لوگ ہیں جھوٹے، تم سچے ہو، سچ اب مجھ کو کون سنائے، تم نہیں آئے

رات گئے تک اب بھی حسین آتا نہیں گھر، آوارہ پھرتا، گھبراتا ہے
پی ایم ٹی کے پرچے کیسے کیے محسن نے کون بتائے، تم نہیں آئے

بندر عباس اُڑ کے گئے تھے، ڈھونڈ کے تم کو لانے علی، لوٹ آئے ہیں
حسن کو ہے تہران میں وحشت، کوئی تو اُس کا جی بہلائے، تم نہیں آئے

تم کو خوشی تھی سوابہ کو بہو بنا کر گھر لانے کی، روتی ہے وہ
ہم نے تمہاری حسرت پوری کردی اُس کو بیاہ بھی لائے، تم نہیں آئے

امّی، بہنیں اور بہنوئی آئے تمہارے واسطے چندا، اب تو چمکو
گھر کی اندھیری لمبی رات میں کیسے کوئی شمع جلائے، تم نہیں آئے

اکثر ایسا بھی تو ہوا ہے، ہم سے لڑے تم روٹھ گئے تم، من گئے پھر خود
اب کے تو رنجش نہ گِلہ تھا، بات ہو کچھ تو کوئی منائے، تم نہیں آئے

تم بھی مغرور اور ضدی ہو، ہم بھی دیر پشیماں، ضدی اور خودسر تھے
آکر دیکھو ٹوٹ گئے ہم، ناز و ضد ہیں سر کو جھکائے، تم نہیں آئے

سر پہ میزائیل اور بم برسے، پیر جواں اطفال و زناں سب شہر سے بھاگے
ہم نے لکھا تھا، امن کی چھاؤں میں آجاؤ تم، تار بھجائے، تم نہیں آئے

مان لیا یہ، تم ہو جری، اولادِ رسولؐ و آلِ علیؑ ہو، تم ہو حسینی
شمر و یزید سے صلح کا اعلان کر بھی چکے شبیرؑ کے جائے، تم نہیں آئے

مردہ خانوں میں بھی دیکھا، کٹے پھٹے اعضا میں ڈھونڈے دست و پا
غوّاص آغوشِ دریا سے کتنے موتی چن کر لائے، تم نہیں آئے

تم تھے سراپا حسن و لطافت، گُل پیراہن عطر و نکہت، روحِ نظافت
گلتے برف زدہ جسموں میں کس کی تھی ہمت تمھیں بلائے، تم نہیں آئے

کرب و بلا کے عاشق تھے تم، کرب و بلا کے کشتے بھی آخر دفن ہوئے تھے
تم کو یہ بھی تھا نہ گوارہ کوئی کفن دے اور دفنائے، تم نہیں آئے

تم تھے پیکرِ عصمت و عفت، موجوں کی چادر سے خود کو، سر کو ڈھانپا
پہنچے نہ ہم تو تم نے نہ چاہا کوئی بھی تم کو ہاتھ لگائے، تم نہیں آئے

کیسے خلیجِ فارس سے پوچھیں کہاں ہمارا دُرِّ نجف ہے، گنجِ شرف ہے
کب سے سمندر کاسہ بکف ہے، جزر و مد کتنے ہی آئے، تم نہیں آئے

قبروں میں آرام سے سوئیں گے شہدا اب، جنگ کے اسیر آئیں گے وطن کو
لوٹ کر آلِ نبیؐ بھی اِک دن شہرِ مدینہ میں تھے آئے، تم نہیں آئے

لے کر نام ہمارا پورا، کون کہے گا خود کو سنبھالو، یوں تو نہ بھٹکو
کوئی نہیں جو وحید اختر کو لغزشِ غم سے آج بچائے، تم نہیں آئے

(تہران۔ کوچہ خسرو، بلاک 52، خیابانِ ویلا، 30 جولائی 1988)

# سمندر میرا رقیب

اَن گنت موجیں ہیں ہر موج میں لاکھوں چہرے
اس سمندر میں کہاں ڈھونڈنے جائیں گے تمہیں

سمندر سے مرا رشتہ نہیں تھا
کہ میں زائیدۂ و پروردۂ و آسودۂ خشکی
مری آنکھیں بھی کم ہی نم ہوئی ہیں
کہ اس صحرائے بے آب و گیہ میں بلا ہمیشہ ہی چلی ہے
اگر آنسو بھی ٹپکے ہیں تو یہ خونِ جگر کی گل فشانی تھی
مرے صحرا کے دامانِ تہی کی جمع پونجی کی نشانی تھی

سمندر کو کبھی دیکھا بھی ہے تو یوں
کسی وحشی کو مجذوبانہ رقص و جوش میں جولان دیکھوں
یہ دل، مضطرب، بے تاب، پُر شور اور مذبذب
کبھی ساکن، کبھی صامت، کبھی ناطق، کبھی جزر و مد میں مبتلا مجنوں

سمندر کے اُدھر بھی اور اِدھر بھی
اُس کے اوپر بھی اور اندر بھی
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
خلا ظلمات سے لبریز، اُبلتا
کوئی چہرا نہ کوئی گُل نہ کوئی نور کا شمہ
سمندر سے ہمیشہ ہی مجھے وحشت ہوئی ہے
سمندر مجرم و قاتل، سمندر خائن و غاصب
میں نے نیچ اور جو ہوسے دیکھا ہے سمندر کو سیہ راتوں میں تاریک
یہیں دیکھا ہے اُس کو روزِ روشن میں مچلتا، کف بہ لب پاگل
ہوا میں بو، نمک کی، سڑتی گلتی زندگی کی
فضا میں سایے ہی سایے خلا کے
زمیں محکم، زمیں محرم، زمیں ہے زندگی افروز و پرور
مرے محبوبِ گُل پیکر کے قدموں سے ہے گُل ریز و خوشبو بار یہ برسوں
اُنہی ہاتھوں نے اِس کے چپے چپے پر کھلائیں نکہت و رنگت کی دنیائیں
زمیں میری، مرے محبوبِ جاں کی محنتِ گُل آفریں کی کشتِ رنگیں
سمندر کو نہ اُن گُل ایسے قدموں نے چھوا ہے اور نہ اُن ہاتھوں نے اِس کو رنگ بخشے
سمندر غیر، پُر اسرار ہے اور اجنبی ہے
سمندر میں ہمارا مہ لقا گُل پیرہن اُترا تو اُس کے دست و پا، گیسو
ہوئے قزاق موجوں کی کشاکش میں پریشاں اور حیراں

سمندر کا مقدر ایک بار اُس وقت چمکا
جب مرے محبوبِ گُل پیکر کے گُل پیروں کو دریائے عُور کی موج نے چوما
اٹھا کر اپنی باہیں اُس کو اپنی گود میں آنے کی دعوت دی

وہ ہنستی کھلکھلاتی، مسکراتی، شوخ آنکھوں سے، کھِلے چہرے سے اُن موجوں سے لپٹی
ازل سے تا ابد شاید یہی اِک خوبصورت منظر اُس تاریک دریا کو ملا تھا
جب اُس پر مجھ کو پیار آیا
مگر دل نے کہا چپکے سے، غاصب اور خائن ہے سمندر

سمندر کا وہ لمسِ چند لمحاتی مری جانِ جہاں کو کر گیا شاداب و تازہ
سمندر نے مرے اُس سرسبد گُل کو بسایا دل میں ایسا، پھر نہیں بھولا
مرے اور اُس کے بیچ اِک، دو نہیں، کتنے سمندر حائل آئے
مجھے غافل، زمیں کے کاروبارِ زیاں میں پا کے، بہکایا سمندر نے مری جاں کو
خلیج فارس سے آواز دی، اِک دن بُلایا
وہ رستہ، آگ، خوں، ٹینک اور میزائیل،
بموں اور جنگ کی کشتی کا رستہ تھا
سیہ، بے تاب، آتش بار پانی میں گھرا تھا، وِنسینس، عفریتِ مرگ آسا
تڑپتی لہر، اٹھتی موج میں جوالامکھی ہر ہر قدم پر پھٹ رہے تھے
مرا معصوم گل پیکر ہمکتا، مسکراتا، زندگانی کی امنگوں سے چھلکتا
ہوائے دوش پر اڑکر سمندر کی طرف لپکا
وہ کتنی محترم پیاری مقدس خاک تھی
جس پر قدم نے اُس کے اپنے نقش سے گُل آخری کترے
وہ مٹی سجدہ گاہِ زندگی، خاکِ شفا تھی
وہاں سے اُڑ کے جب اُس نے سمندر کی طرف پرواز کی
ظالم سمندر نے چلائے ظلم کے تیر اُس کے مرکب پر
ستمگر، خائن و غاصب سیہ عفریت نے مارے میزائیل
مرا گُل پتی پتی ہو کے بکھرا

اُس کی خوشبو نے خلیج فارس کے آبِ نمک میں عطر گھولا
ہزاروں موجیں اٹھیں اُس کے اِک اِک برگ کو دامن میں بھرنے کو
ہزاروں شارک لپکے تشنۂ خوشبو
کہ اس گُل پیرہن کے پارہ پارہ جسم کو چکھ لیں
سمندر کی تہوں کی تیرگی نے اُس سے اپنے دل کی ظلمت کو ضیا بخشی
بہت غواص لولو اور مرجان و صدف کو ڈھونڈنے پانی میں اُترے
تہوں سے چُن کے لائے سیکڑوں گل
کئی سو کلو میٹر دور پر غنچے، رسیدہ گل، ثمر اور برگ دوبارا اُبھرے
مرا دُرِ نجف، گنجِ شرف، میرے گہر ہائے تمنا کا صدف باہر نہ آیا
کہیں کچھ راکھ سطحِ آب پر اُبھری
کہیں اِک ہاتھ شاخِ گُل بکف کی طرح چمکا
مگر وہ مسکراتا، کھل کھلاتا، زیست سے لبریز و شاداب
اور امواجِ سمندر سے الجھتا پیکرِ گُل آج تک واپس نہیں آیا
سمندر غاصب و خائن، سمندر مجرم و ظالم
اگر میں جانتا اُس کو سمندر کی طرف جانے نہ دیتا
خدا جانے سیہ دل، اندھے قاتل، بے حیا نے میرے گوہر کو
سیہ موجوں کی، کن تیرہ تہوں میں رکھ لیا ہے

سمندر! میں تجھے للکارنے آؤں گا اِک دن
مرا گُم گشتہ گوہر تو نہیں دیتا، نہ دے
آج آنکھیں میری، کل جو صحرا تھیں، سمندر ہیں
مرا دل کل تلک جو لاکی بستی تھی، تلاطم خیز دریا ہے
مرا گوہر مری آنکھوں، مرے دل میں پلٹ آیا ہے

تو اب بھی تہی ہے، تا ابد خالی رہے گا

وہ دریا و سمندر کیا، جو گوہر کو نگل لے، صدف کو پیس ڈالے
چُرا کر دولتیں جو دوسروں کی غصب کر لے
مری غوّاص نظریں تیری تہہ سے اپنا موتی ڈھونڈ لائی ہیں
مری آنکھوں کی پتلی میں اُسی کی جگمگاہٹ ہے
ہر اک اشکِ مژہ میں اُس کی صورت جھلملاتی ہے
چھپا کر بھی مرا گوہر سمندر ہے بگولوں کی طرح آوارہ و گرداں
گنوا کر بھی اُسے سرمایہ دارِ گوہرِ نایاب ہے ہر اک موجِ میری
مرے سینے کی ہر اک موج اُس کا گہوارہ
مرا دل یوسفِ گم گشتہ کے عکسوں کا رنگین آئینہ خانہ
زرِ گُل سے بھرا ہے میرا آنگن، روز تازہ پھول مہکیں گے
نئے مہتاب ہر شب جگمگائیں گے
سمندر توڑتا ہے، عکسِ مہ کو، گُل کو ریزہ ریزہ کرتا ہے
سلیقہ ہجر کا مہتاب سے صبحیں، گُلوں سے باغ اُگاتا ہے
سمندر کو رقابت کا عبث دعویٰ ہے مجھ سے
مرا محبوب پیکر میری روح و جسم میں، ہر سانس میں زندہ ہے، میرے ساتھ ہی زندہ رہے گا
خدا کی راہ میں جو قتل ہوتے ہیں، نہیں مرتے
محبت رزق دیتی ہے اُنھیں، آباد رکھتی ہے دلوں میں
سمندر شمر و ریگن ہے یزید و ہنسن ہے
مرا سینہ زمینِ کربلا ہے
مرا گم گشتہ گوہر سجدہ گاہِ دولتِ اہلِ وفا ہے

(ستمبر 1988)

# رفیقِ بیست و پنج و نیم سال

عروسِ نو سنبھل سنبھل کے پاؤں رکھ
کہ زندگی کی راہ سخت پُر خطر ہے
ہر قدم نشیب اور فراز ہیں
تو پھولوں سے لدی ہوئی
تو عطر میں بسی ہوئی
حیا کے بار سے نظر جھکی ہوئی
عروسِ نو سنبھل سنبھل کے راہ چل
یہ ساز، راگ، نوبت، اور سُر یہ شاہنائی کے
فغانِ درد اور صدا کے سیلِ تند رو میں ڈوب جائیں گے
عروسِ بیست و پنج و نیم سال
ہم تو اتنے لمبے فاصلے کے ہر نشیب اور فراز سے
گذر گئے تھے کامراں
صمیم و سرفراز و سرخرو

یہ کون سا فراز اور کون سا نشیب ہے
کہ جس میں آج گم ہے تو؟
یہ میں نے کب کہا تھا تجھ سے جانِ جاں
نشیب اور فراز زندگی کے آسماں سے ہیں سمندروں کی تہہ تلک؟
یہ تو نے کیا کیا؟
فرازِ زندگی کو آسمان سے ملا دیا
نشیب کو خلیج کے سیاہ پانیوں کی تہہ تلک بٹھا دیا
تو ہر فراز سے تو سرخرو گذر گئی
یہ کون سا نشیب ہے کہ اس طرح سے گم ہوئی
کہ اب کبھی سُراغ بھی ترا نہ پا سکے گا تیرا ہم سفر

(19 نومبر 1988)

# مقتل سے مقتل تک

(علی گڑھ سے حیدرآباد تک)

"سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے" (آتش)

"مجھے یقین ہے اتنا سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں" (احمد ندیم قاسمی)

یہ کس زمانے کی، کس آدمی کی باتیں ہیں؟
سفر وسیلۂ ظفر کا ہے، کون کہتا ہے؟
ہزار ہا تو بہت ہے، ملا نہ اک شجرِ سایہ دار بھی رہ میں
پرائے شہر میں کیا، اپنے شہر میں رہ کر
خود اپنے گھر میں بھی انساں غریبِ شہر ہے آج

ہم اپنے گھر کی کسی کنجِ عافیت میں پڑے
صحائف و کتبِ دانیا، ادیبوں سے
سکوتِ شب میں خموشی سے گفتگو کر لیں
تمام رفتہ و موجود شاعرانِ کرام
ہمارے کلبۂ احزاں میں میہماں ہو لیں
یہ ایک خواب تھا، تعبیر جس کی ہے ناپید
ہم آج اپنے ہی گھر میں ہیں اپنے خواب کے صید
اٹھا پڑوس سے شور اور محلّے سے نعرے
سکوت ٹوٹ گیا، عافیت ہوئی برباد
صحائف و کتب و شعر و فلسفہ کے حلیف
ہمارے کلبۂ احزاں ہی بھاگے ہو کے خفیف
یہ شور خوف کا ہے، موت کا ہے نفرت کا
یہ نعرے نام پہ مذہب کے ہیں پیامِ مرگ
ہے اِن کے لب پہ فقط خونِ آدمیت کا
تمازت اتنی بڑھی کربلا بنی بستی
ہر ایک روز تھا عاشورہ قتل و غارت کا
ہر ایک شب میں غریبوں کی شام کے آثار
بس ایک شامِ غریباں نہیں، بہت [illegible]
ہر ایک شام گھروں سے دھواں نکلتا ہے
قناتیں جلتی ہیں، اسبابِ جاں کے لٹتے ہیں
خیامِ گُل سے نکلتی ہیں سوختہ لاشیں
چلے کہاں جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
ہر ایک قافلۂ نو بہار کی منزل

لہو میں غرق ہے اور نذرِ شعلہ ہائے جہنم
غریبِ شہر سفر پر چلا کہ سایہ کہیں
کسی شجر کے تلے تو ملے گا رستے میں
مگر شجر کوئی آسودہ، سایہ دار نہ تھا
فضا، ہوا میں بھی جینے کا اعتبار نہ تھا
سمندروں میں تھے عفریتِ مرگ شعلہ فشاں
بطونِ ابر میں رقصاں تھیں برق ہائے تپاں
فشار اتنا ہواؤں میں تھا، ہوا پیا
ہوا و برق کی سازش سے پاش پاش ہوا
جو زندگی تھا سراپا، وہ ایک لاش ہوا
سُراغ اُس کا ہوا نے دیا نہ پانی نے
نشاں مٹا دیا جس کا جہانِ فانی نے

یہ اِک شہیدِ سفر کی تھی داستانِ جہاد
ہمارے شہر میں ہوتا ہے صبح و شام فساد
ہر ایک شاخ ہے گلچیں، ہر اک شجر صیاد
ہر ایک کوچہ میں پہرے پہ پھرتے ہیں جلّاد
ہر اک مکان ہے لاشوں کے ڈھیر سے آباد
چلو سفر پہ چلیں اپنے شہر کو چھوڑیں
''کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا''
کسی جگہ تو دلِ بے قرار ٹھہرے گا
مگر کہیں جرسِ غنچہ کی صدا نہ نسیم
کہیں روش پہ گُلوں کے خیام ہیں نہ شمیم

ٹرین چیختی ہے، پہیے گڑگڑاتے ہیں
مشیں کے بوجھ تلے جادہ ہائے فولادی
تڑپتے، کانپتے ہیں اور تلملاتے
ہراسِ قتل و تشدد فضا پہ طاری ہے
کہ پیر و طفل و جواں خود میں سمٹے جاتے ہیں
کل اک ٹرین کو روکا تھا دھرم بھگتوں نے
مسافروں کی جگہ اُن کی لاشیں اُتری تھیں
اور ایک روز خضوع و خشوعِ مذہب نے
کسی غریب کے کم عمر بیٹوں بیٹیوں کو
اُٹھا کے پھینکا تھا چلتی ٹرین سے باہر
کہ یوں ہی رکھنی تھی بنیاد اُن کو معبد کی
یہی تو بو ہے اعدائے دیں کے مرقد کی

ٹرین چیختی ہے، پہیے گڑگڑاتے ہیں
مشیں کے بوجھ تلے جادہ ہائے فولادی
تڑپتے کانپتے ہیں اور تلملاتے ہیں
یہ ہم سفر ہے ہماری بغل میں بیٹھا ہے
کسی بھی لمحے نہ پہلو میں مار دے خنجر
کسی بھی وقت نہ تیزاب پھینک دے منہ پر
یہ جو محافظِ امن و اماں ہے پہرے پر
ہمارے سینے پہ خالی نہ رائفل کر دے
عجیب یہ شجر سایہ دار راہ میں ہیں
نہ ان سے گھر میں اماں تھی، نہ ہے سفر میں اماں

## غریبِ ملک و وطن جائے بھی تو جائے کہاں

خدا کا شکر ہے کہ پہونچے تو ایک منزل پر
نہ جسم پر ہے جراحت، نہ زخم ہے دل پر
سفینۂ سفر آ کر رُکا ہے ساحل پر
یہ شہرِ امن و اماں ہے محبتوں کا مکاں
سدا سے شیر و شکر یاں ہیں کفر اور ایماں
اُٹھاؤ اپنا اثاثہ چلو عزیزوں میں
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں
ہم اپنے مولد و مامن کی اب پناہ میں ہیں
یہ شہر وہ ہے جہاں ہم غریبِ شہر نہیں
لہو کی موج نہیں یاں ستم کا قہر نہیں
مگر یہ کیا کہ ہزاروں سواریاں ہیں کھڑی
ہمیں بٹھانے پہ آمادہ ایک بھی تو نہیں
ہر ایک کہتا ہے جاں کا زیاں نہیں منظور
جہاں پہ جانا ہے تم کو وہاں ہے شورِ نشور
ہے اک مہینے سے واں آدم آدمی سے نفور
وہاں تو شام سے کرفیو ہے شہر کا دستور
شبیں سُلگتی ہیں نیندیں مچلتی رہتی ہیں
سحر تک آنکھوں کی شمعیں پگھلتی رہتی ہیں
مکانوں میں نہ اماں ہے نہ کوچوں میں ہے پناہ
سکون و امن کو رخصت ہوئے ہوا اک ماہ
گھروں میں سوئے ہوئے لوگ قتل ہوتے ہیں

عدو لگاتے ہیں نعرے، عزیز روتے ہیں
کچھ ایسا پیچ پڑا مذہب و سیاست میں
کر آ گیا ہے خلل روحِ آدمیت میں
سفر پہ نکلے ہو کیا سوچ کر کہاں کے لیے؟
عبث ہے آج ہر اک جستجو اماں کے لیے
نہیں ہے اک شجرِ سایہ دار بھی رہ میں
جہاں بھی جاؤ گے تم ہو غریبِ شہر وہاں

(8 جنوری 1991)

# کال بیل

میں اپنی خلوت گوشہ نشیں میں
گئے بیتے ادیبوں، فلسفیوں، شاعروں کو پڑھ رہا ہوں
وہ میرے ساتھ بیٹھے مجھ سے محوِ گفتگو ہیں
دسمبر جنوری کی سرد راتوں اور دنوں میں
لحاف اوڑھے میں بستر میں ہوں لیٹا
نہ اُٹھنے بات کرنے کی ہے فرصت، نے دماغِ صحبتِ ناجنس کی ہمت
مگر در پر لگی گھنٹی کی آواز آ رہی ہے
کوئی ہم جنس یا ناجنس آیا ہے
اُٹھو دیکھو، لحاف اپنا ہٹا کر در پہ جاؤ
عجب یہ ایک آفت ہے
یہ اُس کی یاد کی خلوت میں غیروں کی خیانت ہے
کہ خلوت گھنٹیوں سے گونجتی تنہائی کی لذت کو یوں مجروح کرتی ہے
"جناب آپ اپنا اسمِ پاک کہیے

کس لیے تشریف لائے ہیں"
"حضور ہم کام سے آئے ہیں، تھوڑی بات کرنی ہے"
"مگر کیا کام کا میں آدمی ہوں؟
میں تو ہوں گوشہ نشیں گھر میں
نہ ادبی محفلوں سے واسطہ ہے اور نہ بزم شعر و موسیقی سے رشتہ ہے
فقط یہ کہ مرے ذمّے خداوند اپنی کتب نے
کیے ہیں چند عہد، جن کو میں اُن کی حماقت جانتا ہوں"
"حضور ایسے ہی اک دو مسئلوں پر بات کرنا ہے"
"سر و چشم آیئے تشریف رکھیے"
مری خلوت بکھر جاتی ہے، لمحہ ٹوٹ جاتا، فکر و فن سب مرنے لگتے ہیں
یہ کیسی دوسری گھنٹی بجی؟
کیا ٹیلی فون آیا؟
عجب! لیکن کہا اُس نے غلط نمبر ملایا تھا
یہ سارے رابطے کے سلسلے مربوط ہیں..... وابستگی سے
جو تم کو اپنے خود سے قطع کرتے ہیں
لیکن اب عمرِ گریزاں چلتے چلتے کہہ رہی ہے
کسی گوشہ میں نامعلوم سی کٹیا بنالوں
سب در و دیوار کردوں بند
.....خاموش کردوں
کتابوں کے حصار اپنا..... تعمیر کردوں
شاید اس طرح سے خود کو پالوں
اور فکر و فن میں اپنے آپ کو ڈھونڈوں

(8 مارچ 1992)

# غزلیں

**(1)**

اے روشنیِ ماہ اگر تو اُدھر بھی جا  
دامن میں لے کے روشنیِ چشمِ تر بھی جا

یا اُس کو بھول جا کہ بہت غم ہیں دہر میں  
یا ضبطِ جاں گداز کی حد سے گذر بھی جا

کُچھ خار و خس بھی منتظرِ التفات ہیں  
اے شعلۂ بہارِ گریزاں ٹھہر بھی جا

اس دھوپ میں ہوں آبلہ پاؤ برہنہ سر  
اے زلفِ یار چہرۂ خور پر بکھر بھی جا

بازو و دست شانہ کشی میں ہوئے ہیں شل  
اے گیسوئے حیاتِ پریشاں سنور بھی جا

اے شبنمِ تصورِ جاں بخش ایک بار  
پژمُردہ برگِ گل کے سبو میں اُتر بھی جا

اے بادِ برشگال جو اُس دیس کی طرف  
جانا ہی ہو تو لے کے ہماری خبر بھی جا

اے صبح جب بھی کوچۂ جاناں میں ہو طلوع  
تو ساتھ لے کے میری شعاعِ نظر بھی جا

تیرا وحید شمعِ سرِ راہ اب بھی ہے  
موجِ ہوا کی طرح اِدھر سے گذر بھی جا

**(2)**

تم گئے ساتھ اُجالوں کا بھی جھوٹا ٹھیرا  
روز و شب اپنا مقدر ہی اندھیرا ٹھیرا

یاد کرتے نہیں اتنا تو دلِ خانہ خراب  
بھولا بھٹکا کوئی دو روز اگر آ ٹھیرا

کوئی الزام نسیمِ سحری پر نہ گیا  
پھول ہنسنے پہ خطادار اکیلا ٹھیرا

پتیاں رہ گئیں، بلا لے اڑی آوارہ صبا  
قافلہ موجِ بہاراں کا بس اتنا ٹھیرا

روز نظروں سے گذرتے ہیں ہزاروں چہرے  
سامنے دل کے مگر ایک ہی چہرا ٹھیرا

وقت بھی سعیِ مداوائے الم کر نہ سکا  
جب سے تم بچھڑے ہو، خود وقت ہے ٹھیرا ٹھیرا

دل ہے وہ موم ملا ہے جسے شمعوں کا گداز　　اب کوئی دیکھے نہ دیکھے، یونہی جلنا ٹھیرا
تم نے جو شمع جلائی تھی، نہ بجھنے پائے　　اب تو لے دے کے یہی کام ہمارا ٹھیرا

گنگنا لیں گے غزل آج وحیدؔ اختر کی
نام لینا ہی جو در پردہ تمہارا ٹھیرا

(3)

دل کے مکیں نے اہلِ شہر سے روٹھ کے اپنا وطن چھوڑا
مُشک نے نافہ، نافے نے آہو، آہو نے دشتِ ختن چھوڑا

نقب لگی دیوارِ چمن میں، ہو گئے برہم رنگ و بو
باندھا رختِ سفر خوشبو نے، گُل نے صحنِ چمن چھوڑا

لوٹی دُزدِ شب نے کرنوں کی چاندی، گُل کا زیور
میرے ماہِ نیمۂ شب نے ہو کے خفا آنگن چھوڑا

پھول سے روٹھی بادِ صبا، غنچے ہیں چُپ، دونوں سے خفا
اُس نے جب سے ہمیں چھوڑا، لگتا ہے روح نے تن چھوڑا

فکرِ معاش میں اہلِ سخن نے لکھنؤ، دہلی چھوڑے تھے
ہم نے اسی کاوش میں سوئے شمال آنے کو دکن چھوڑا

نامۂ خوشبوئے شیراز آیا ہے عجم کی ہواؤں سے
دل پہلو سے اُڑا جاتا ہے ہم نے بھی سمجھو وطن چھوڑا

جب سے ہوا عرفاں، لحد ہے دائمی گھر، ملبوس کفن
شوقِ تخلیق و نغمہ و ذوقِ لباسِ تن چھوڑا

خلوت میں قرطاس و قلم کی صرف کتابیں مونسِ غم
فن نا فہموں، نا اہلوں کی خاطر کارِ فن چھوڑا

جن کی نظروں میں تھے گراں، ہم جن کی دکانیں بے رونق تھیں
کاروبار چلے اب اُنہی کا، ہم نے تو شغل تھا چھوڑا

(جولائی 1983)

(آخری 3 شعر نومبر 1994 کے بعد کہے گئے)

# فینٹیسیا اور اس کی شکست

(سعدی کی نذر جن کی ایک غزل کی بحر نے اسی بحر میں غزل کی تحریک دی)

صبحِ گل گشت کو نکلی تو یہ تھا حال صبا کا
الٹی اس پر اُسے چھیڑا، اِسے گھورا اُسے تاکا

شاخ و سبزہ کو جھنجھوڑا، اور ہر خواب کو توڑا
سالم اک پردہ نہ چھوڑا کسی آرام سرا کا

ہے ہر اک رنگ پریدہ، ہے نظر سب سے کشیدہ
جیب و دامن ہے دریدہ گلِ رنگین قبا کا

ہر غنچہ ہے شکستہ، ہے ہر اک برگ گسستہ
کوئی تکمہ نہیں بستہ کسی زرتار عبا کا

کھل گئے کلبۂ احزاں، ہوئے وا حجلۂ خوباں
بے حجاب آئے نگاراں، نہ رہا عذر حیا کا

کرمِ حسن ہے ارزاں، نگہِ ناز ہے رقصاں
کرو نذر اپنے دل و جاں، یہی سکہ ہے وفا کا

تنِ نازک پہ گرانی کرے پوشاک شبانی
جو بھی آگے ہے کہانی، ہے وہ حقِ حسنِ ادا کا

ہے عجب عالمِ رؤیا نہیں اک نقش بھی دھندلا
ہے تخیل کا کرشمہ کہ یہ جادو ہے فضا کا

سرِ منظر ہے زمستاں، یخ و پائیز بداماں
پسِ منظر ہے بہاراں، یہ ہے اعجاز خدا کا

اُتری کب گُل کی سواری، چلی کیا بادِ بہاری — تھی لگی آنکھ تمہاری وہ تو جھونکا تھا ہوا کا
ہے برہنہ ابھی منظر، دوا سے برف کی چادر — نہ صبا ہے نہ گُلِ تر، نہ چھناکا نہ دھماکا
جسے کہتے ہو گلستاں گُلِ کاغذ کی ہے دکاں — جسے سمجھے تھے بہاراں، وہ تبسم تھا فنا کا
چادریں خواب کی تانے ہیں گم اپنے میں دوانے
دیکھ لیں خواب سہانے، ہے یہی توڑ قضا کا

تہران کی برف باری کے تجربے کے بعد

(11 جنوری 1986)

(5)

جس کو مانا تھا خدا، خاک کا پیکر نکلا — ہاتھ آیا جو یقیں وہم سراسر نکلا
اِک سفر دشتِ خرابی سے سرابوں تک ہے — آنکھ کھولی تو جہاں خواب کا منظر نکلا
کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں — نم ہوئی ہے تو اُسی خاک سے لشکر نکلا
تھی تہی دست ہر اک شاخ خزاں تھی جب تک — فصلِ گل آئی تو ہر شاخ سے خنجر نکلا
خشک آنکھوں سے اُٹھی موج تو دنیا ڈوبی — ہم جسے سمجھے تھے صحرا وہ سمندر نکلا
دشتِ بے حاصلیِ عمرِ تمنا کفِ خاک — بحرِ وحشت کے لیے بوند سے کم تر نکلا
دوریاں سنگ کو بھی شمع بنا دیتی ہیں — چھو کے دیکھا تو جو دل موم تھا پتھر نکلا
زیرِ پا اب نہ زمیں ہے، نہ فلک ہے سر پر — سیلِ تخلیق بھی گرداب کا منظر نکلا
گم ہیں جبریل و نبی، گم ہیں کتاب و ایماں — آسماں خود بھی خلاؤں کا سمندر نکلا
غمِ انساں کی رسالت پہ ہوئے ہم فائز — اپنی ہی شاخِ سخن پر یہ گُلِ تر نکلا
عرش پر آج اُترتی ہے زمینوں کی وحی — کرۂ خاک ستاروں سے منور نکلا
ہر پیمبر سے صحیفے کا تقاضہ نہ ہوا — حق کا یہ قرض بھی نکلا تو ہمیں پر نکلا
گونج اٹھا نغمۂ کُن دشتِ تمنا میں وحید
پائے وحشت حدِ امکاں سے جو باہر نکلا

(12 مارچ 1972)

(6)

(بنام ناصر کاظمی)

خوابِ شب زندہ داراں میں بیداریوں کا نگر ہے کھلا
منتظر شمع کی چشمِ کشتہ میں بابِ سحر ہے کھلا

جن کی آنکھوں میں ہر شب کٹی اُن کے نغموں ہی سے پو پھٹی
رات بھر جاگنے والی نیندوں میں صبحوں کا در ہے کھلا

صبح چوکھٹ پہ جب آ گئی بے حسی آنکھ ملتی اٹھی
تھک کے سوئے وہ غم جن کے نالوں سے بابِ اثر ہے کھلا

ہے سکوتِ لبِ نغمگی پردۂ سازِ تابندگی
بند آنکھوں میں بھی مطلعِ روشنیِ نظر ہے کھلا

ہم جو لفظوں کو چھو لیں تو کھل جائے سِرِ حیات و ممات
ہم ہیں خاموش اگر ہم نفس دفترِ شعرِ تر ہے کھلا

کذب کے کربلا ہیں ہے اک آیتِ ناطقِ حق سخن
ہر لبِ مصلحت بند ہے اک لبِ نغمہ گر ہے کھلا

(مارچ 1972)

(7)

(نذرِ غالب......غالب کی زمین میں)

دل وہ شعلہ ہے جو بجھ بجھ کے بھی ٹھنڈا نہ ہوا      منجمد آگ کا بہتا ہوا دریا نہ ہوا
حسرت و خواب و تمنا کا وہ ہنگامہ رہا      مدّتیں گزریں کہ خود اپنے سے ملنا نہ ہوا

آرزو اب کسی چہرے کو نہ پہچانے گی
روبرو ایک زمانے سے وہ چہرا نہ ہوا

جنتِ بے خبراں میں جو رہا، شاد رہا
جو رہا ہوش میں آخر کو وہ دیوانہ ہوا

عمر بھر کے لیے بن باس ملا ہے ہم کو
سرو اک پل کو بھی احساس کا صحرا نہ ہوا

کیا تمنائیں ہیں کیا لوگ جو آسودہ ہیں
خواب میں بھی ہمیں دیدارِ تمنا نہ ہوا

نارسائی بھی ہے سرمایۂ جاں تشنہ لبو
کیوں کریں رنج کہ جو سوچا جو چاہا نہ ہوا

عہدِ حاضر کے سرابوں سے گزر کر ڈھونڈیں
ایک ایسا بھی جہاں جو ابھی پیدا نہ ہوا

دشتِ امکاں کے اندھیروں میں جلائے تو چراغ
نہ سہی میں جو خرابِ غمِ عقبیٰ نہ ہوا

جس پہ چمکا نہیں تیرے کفِ پا کا سورج
آج تک نیند سے بیدار وہ جادا نہ ہوا

یہی لمحہ ہے ازل اور یہی لمحہ ہے ابد
دوش و فردا نہیں کچھ حال گر اپنا نہ ہوا

(1969)

**(8)**

زبانِ خلق پہ آیا تو اک فسانہ ہوا
وہ لفظ صوت و صدا سے جو آشنا نہ ہوا

بلائے جاں بھی ہے، جاں بخش بھی ہے عشقِ بتاں
اجل کو عذر ملا، زیست کو بہانہ ہوا

تری نگاہ کرن تھی تو میرا دل شبنم
تری نگہ سے بھی دل کا معاملہ نہ ہوا

بصد خلوص رہا ساتھ زندگی بھر کا
مقابلہ بھی زمانے سے دوستانہ ہوا

سُنا ہے بزم میں تیری ہے تذکرہ میرا
تری وفا کا تعارف بھی غائبانہ ہوا

ہم ایسے کھو گئے آغاز میں، خبر ہی نہیں
کہ بزم اُٹھ گئی کب، ختم کب فسانہ ہوا

ہر ایک لمحہ کیا قرضِ زندگی کا ادا
کچھ اپنا حق بھی تھا ہم پر، وہی ادا نہ ہوا

(اگست 1974)

(9)

ہنستی ہوئی محفل میں کل دل اُمڈ آیا تھا — دیکھ آئیں، کن آنکھوں میں اس راز کا سایا تھا
تم آئے تو دنیا تھی، دم ساز تھے، دشمن تھے — پھر کوئی زمانے میں اپنا نہ پرایا تھا
بے مہریِ دوراں سے پھر آج چمک اُٹھا — کل مصلحتِ غم نے جو داغ مٹایا تھا
انبوہ میں یادوں کے اِک تم ہی نہ تھے شامل — شب آئینۂ دل پر ہر نقش اُبھر آیا تھا
اندازِ رمِ نکہت رفتار میں تم سا ہی — پچھلے پہر اک جھونکا ہنستا ہوا آیا تھا
ہم بے خبرِ دوراں تم تک نہ پہنچ پائے — سنتے ہیں وہاں سارا عالم اُمڈ آیا تھا
گم کردۂ خوشبو ہیں سرشارِ صبا اب تک — یوں بیٹھے ہیں جیسے کچھ کھویا ہے نہ پایا تھا
آشفتہ سری اپنی اُلجھی تھی سرابوں سے — جب ساقی نے پیاسوں میں میخانہ لٹایا تھا
اب سوچ رہے ہیں تو آتا نہیں یاد اتنا — کیا سوچ کے رو رو کر کل تم کو بھلایا تھا

اے موجِ نسیم اتنا ہم سے نہ گریزاں ہو
اُن ہاتھوں کو ہم نے بھی آنکھوں سے لگایا تھا

(10)

یہ آج لے کے ہمیں آ گئی کہاں تنہا — وہ جستجو کہ ہے اُمیدِ دو جہاں تنہا
وہ زندگی سے بھی دنیا میں کر رہے ہیں نباہ — ہمیں تھا وہم، ہمیں ہیں مزاج داں تنہا
ہیں ایسے گل بھی نہیں مل سکے گا جن کا دماغ — صبا، نہ جائیو تو سوئے گلستاں تنہا
کٹے تو کیسے کٹے مرحلہ، نہ راہ نہ چھاؤں — یہ زندگانی کا صحرائے بے کراں تنہا
وہ ہم سفر ہو کسی کا بُرا نہ مان وفا — یہ دشتِ تیرۂ ہجراں، وہ جانِ جاں تنہا
وہ لوگ بھی ہیں جو پھولوں سے بھی گذر نہ سکے — وہ لوگ بھی ہیں جو کانٹوں کے درمیاں تنہا
جو آج مُہر بہ لب ہیں کبھی تو بولیں گے — کہ پتھروں میں بھی کھلتی نہیں زباں تنہا
خیالِ خاطرِ اغیار سے ہم اُٹھ آئے — تمھیں نہ ہو خلشِ پاسِ دشمناں تنہا
ابھی تو اور ہیں رندانِ حوصلہ پیما — ہمارا جام نہیں شکوۂ مغاں تنہا

ہیں ساتھ اور بھی آوارگان و دل زدگاں
وحید تم ہی نہیں اہلِ تشنہ جاں تنہا

## (11)

گلے بہت تھے، مگر وہ ملا تو کچھ نہ کہا — وہ پوچھتا بھی رہا مدّعا تو کچھ نہ کہا
میں سنگسار ہوا جب، تھا وہ بھی سنگ بہ کف — جو اُس سے پوچھا کہ میری خطا؟ تو کچھ نہ کہا
خدا سے کہتا تھا احوال اس کی دنیا کا — وہ خود ہی حشر میں حیران تھا تو کچھ نہ کہا
وہ مجھ سے کرتا رہا اک جہان کا شکوہ — کیا خود اُس سے اُسی کا گلا تو کچھ نہ کہا
خزاں کو کہتا رہا دُزدِ رنگ و بوئے گل چیں — جو اُتری حجلۂ گل میں صبا تو کچھ نہ کہا
کیا تھا شیخ نے بابِ نجات مجھ پہ بند — درِ حرم مری خاطر کھلا تو کچھ نہ کہا
اُسے تھی ضد کہ وحید اپنا درد خود ہی کہے
غزل کے پردے میں سب کہہ دیا تو کچھ نہ کہا

(31 مارچ 1978ء)

## (12)

گئی سر سے ہوائے جنون و ہوس، مرے دل سے طلب کا خمار گیا
اُسے دیجے دعائیں جو جاتے ہوئے مرے سر سے یہ بار اُتار گیا

ہے اب ایسے مقام پہ عمر رواں، نہ ہے عیش سبک، نہ ہے رنج گراں
کہ بگولے امیدوں کے بیٹھ گئے، غمِ یاس کا دل سے غبار گیا

جو ہے نغموں میں میرے نشاط کی لے، ہمہ شہد و شکر، ہمہ نقشِ مے
مرے جام میں تلخیاں گھول گیا، مرے سینے میں زہر اُتار گیا

مری روح میں رنگ نچوڑ گیا، مرے صحن میں نکہتیں چھوڑ گیا
وہ جو آیا تھا ہمرہِ موجِ صبا، وہ جو ہمرہِ فصلِ بہار گیا

تمھیں خواب ہیں اپنے عزیز اگر، لگے آنکھ نہ رات کے پچھلے پہر
کہ سحر بھی ہے دشمنِ دیدہ تر، سرِ شام ہی کوئی پکار گیا

یہ تھا خوف کہ اُس سے جُدا ہوکر، مجھے آئے گا راس نہ گھر نہ سفر
کیا کارِ حیات نے سحر ایسا، نہ سکون گیا نہ قرار گیا

اُسے کام وزیر و امیر سے کیا، غرض اس کو کُلاہ و سریر سے کیا
جو طلسم کدے میں حروف ہی کے، ملی جتنی بھی عمر گذار گیا

ہو ہجوم کی داد کہ بارشِ زر، نہ ہے اِس کا نہ اُس کا فقیر ہُنر
گیا چھوڑ کے گوشہ کسی در پر تو یہ سمجھو ہنر کا وقار گیا

ہے متاعِ حیاتِ وحید ہی کیا، یہی حرفِ غزل، یہی شعرِ نوا
کئی ذہن ملے تھے گنوا دیے سب، رہا ایک ہی دل سو وہ ہار گیا

(27مارچ1978)

## (13)

عدم بھی ڈھونڈتا ہے دامنِ غبارِ وجود — قضا بھی ہوتی ہے آکر شریکِ کارِ وجود
حیات جبر سہی، جبر اختیار کریں — سکونِ مرگ میں ہے مرگِ اختیارِ وجود
ہے جہدِ ترکِ طلب بھی طلب کا دوسرا نام — ہر ایک رنگ میں جاری ہے کاروبارِ وجود

ہزار خیر طلب ہوں، ہزار غم کے شریک کوئی اٹھاتا نہیں ہے کسی کا بارِ وجود
کھلے ہیں ذات سے تا ذات راستے لاکھوں جو حوصلہ ہو تو ہے کُل جہاں حصارِ وجود
عدم ہے خواب گہہِ اختیار و خلاّقی زماں مکاں سے ورا بھی ہے کاروبارِ وجود
کوئی ملے بھی کسی سے تو کیسے کھل کے ملے ہر ایک فرد ہے زندانیِ حصارِ وجود
کسی کے در پہ جو پہنچے تو کچھ قرار آئے تمام عمر بھٹکتا رہا غبارِ وجود
کسی کو چاہ کے ہم پر کھلا یہ راز وحید
کہ آج بھی ہے محبت سے اعتبارِ وجود

(20اپریل1973)

## (14)

ہے زمانہ نگہِ حُسن کی تحریر کا نام حلقۂ شام و سحر زلفِ گرہ گیر کا نام
دستکیں دیتا ہے پیہم درِ دل پر اک درد زندگی رکھ لو اسی درد کی زنجیر کا نام
میں نے لکھ لکھ کے مٹایا ہے جسے عمر تمام دے دیا ہے اسے نافہموں نے تقدیر کا نام
دشتِ بے حاصلیِ عمر میں بوئے تھے جو خواب وا ہوئی چشم تو ناپید ہے تعبیر کا نام
قتل کرتا ہے جو ہر سانس پہ، وہ ہم ہی میں ہے مفت بدنام ہے تیغ و تبر و تیر کا نام
آرزو، خواب، صنم، حُسن، وفا یا کہ خدا کچھ نہ کچھ رکھنا ہے خود ساختہ تصویر کا نام
انگلیاں اُٹھیں جو ہم بزم سے اُس کی نہ اُٹھے
نہ لیا ایک نے بھی چشمِ عناں گیر کا نام

(9اپریل1976)

## (15)

سفر ہی بعدِ سفر ہے تو کیوں نہ گھر جاؤں ملیں جو گم شدہ راہیں تو لوٹ کر جاؤں
مسلسل ایک سی گردش سے ہے قیام اچھا زمین ٹھہرے تو میں بھی کہیں ٹھہر جاؤں
سمیٹوں خود کو تو دنیا کو ہاتھ سے چھوڑوں اثاثہ جمع کروں میں تو خود بکھر جاؤں
ہے خیر خواہوں کی تلقینِ مصلحت بھی عجیب کہ زندہ رہنے کو میں جیتے جی ہی مر جاؤں

صبا کے ساتھ ملا مجھ کو حکم در بہ دری     گلوں کی ضد ہے، مزاج ان کا پوچھ کر جاؤں
مری اُڑان اگر مجھ کو نیچے آنے دے     تو آسمان کی گہرائی میں اُتر جاؤں
ملی ہیں دشمنیاں میرے چہرے اپنا کر     کہ اپنے آپ کو گر دیکھ لوں تو ڈر جاؤں
وہ کہہ گیا ہے کروں انتظار عمر تمام     میں اُس کو ڈھونڈنے نکلوں، نہ اپنے گھر جاؤں
کہاں اُٹھائے پھروں بوجھ اپنے سر کا وحید
یہ جس کا قرض ہے، اُسی کے ہی در پہ دھر جاؤں

## (16)

اے موسمِ خزاں! میں تیرا نورِ دیدہ ہوں     یلغار سے بہار کی دامن دریدہ ہوں
ہے کس کا انتظار جو سب سے رمیدہ ہوں     سر تا قدم، میں حسرتِ خوابِ نادیدہ ہوں
یوں تو ہوں اپنے نغموں کا میں آفرید گار     پر سچ یہ ہے کہ نغموں کا میں آفریدہ ہوں
ہوں سنگ و خشت گوش بر آواز بھی تو کیا     میں گنبدِ صدا میں غمِ ناشنیدہ ہوں
مل جائیں بال و پر جو اُٹھا لے کوئی شعاع     شبنم کی طرح برگِ نوا پر دمیدہ ہوں
کس کو خبر نصیب میں ہے کس کے معرفت     سب ہیں خدا رسیدہ، میں انساں رسیدہ ہوں
کل قتل کرنے آئے تھے جو تیغ کھینچ کر     اب پوچھتے ہیں، کس لیے اُن سے کشیدہ ہوں
جو طرّۂ بہار تھے وہ گل بکھر گئے     بکھرا نہ میں کہ دستِ خزانی کا چیدہ ہوں
جس پر ہے داستانِ چمن درج حرف حرف     آنکھوں پہ رکھ خزاں کہ میں وہ برگِ چیدہ ہوں
جس کو اُٹھائے پھرتے ہیں پلکوں پہ آفتاب     میں دیدۂ زمیں کا وہ اشکِ چکیدہ ہوں
نومید آدمی سے نہ مایوس رب سے ہوں
وحشت گزیدگی میں بھی میں خوش عقیدہ ہوں

(یکم فروری 1983)

## (17)

فرصت ابھی کہاں ہے کہ بیتی رقم کریں     ہم دیکھیں حال کو کہ گذشتہ کا غم کریں

تھیں عمرِ مختصر میں بھی کتنی طوالتیں اپنے گذشتہ آپوں کو کیوں کر بہم کریں
سب سے بلند کا ہے یہ فرماں، نہ خم ہو سر ہر آستاں کا حکم یہیں سر کو خم کریں
آدھی صدی گذار کے دریا میں فکر ہے ثبت اپنا نام کون سی موجوں پہ ہم کریں
جامِ جہاں نما پہ تو صدیوں کی گرد ہے اب ساغرِ سفال ہی کو جامِ جم کریں
کج مج حروف سے ہے ورقِ دل کا پُر تمام ڈھل جائے آنسوؤں سے تو پھر کچھ رقم کریں
ہو کوئی روشنائی اُبھرتے نہیں حروف
بہتر ہے، خوں سے خامۂ مژگاں کو نم کریں

**(18)**

جاگے ہیں بہت، جی میں ہے کچھ دیر کو سولیں یہ گردِ سفر، دن کی تھکن، نیند سے دھولیں
دے اذنِ خموشی تو گرہ درد کی کھولیں دے بے ہنری جاں کی اماں ہم کو تو بولیں
آنکھوں کے بیابان میں لو چلتی ہے کب سے مل جائے جو اشکوں کا خریدار تو رولیں
لگتی ہے سدا مفت سبیل اپنے سخن کی یہ دولتِ بیدار ہے اُن کے لیے، جو لیں
یہ تو نہ گلہ ہوگا کہ پارکھ نہیں کوئی بہتر ہے جواہر کی دکاں دشت میں کھولیں
دیتی ہے اگر زہر ہمیں تلخیِ دوراں قندِ لبِ جاناں میں بھی لب اپنے ڈبولیں
ہیں پنکھڑیاں لب کی مے ناب کے ساغر اس چشمۂ حیواں پہ ذرا ہونٹ بھگولیں
آ گئے تو ہمیں ہوش کے صحرا میں ہے جلنا پڑتا ہے جو رستے میں تو میخانے بھی ہولیں
آنکھوں میں ہیں محفوظ ستاروں کے دفینے مل جائیں جو زرخیز زمینیں انھیں بولیں
گر جائے گی نظروں سے، اُتر جائے گی دل سے اِک اشک سے گر دولتِ کونین کو تولیں
غیرت کے لیے ننگ ہے اتنا سا بھی احساں پیاسے کہیں دامن ہی نہ دریا میں بھگولیں
اشکوں سے وحید آگ کا طوفاں نہ بجھے گا
اِن بوندوں میں ہم سات سمندر بھی سمولیں

(19 مارچ 1974)

(19)

تم گئے سارے موسم گئے روٹھ کر، ایک بے موسمی ہے جو ٹلتی نہیں
صبح ہوتی نہیں، دن نکلتا نہیں،شام آتی نہیں، رات ڈھلتی نہیں

ابر اُمڈ کر برستے ہیں شام و سحر، چلتی ہیں مست پروائیاں جھوم کر
آنکھ کے دشت سے دل کے صحرا تلک، حبس اور لو کی رُت ہے بدلتی نہیں

کتنے دن گذرے سورج بھی چمکا نہیں، چاند بادل کی چلمن سے جھانکا نہیں
پلکوں کی موتیوں کو ہٹا کر نظر اپنی چوکھٹ سے باہر نکلتی نہیں

وقت کی ندی تیزی سے بہتی ہوئی،زندگی ایک لمحے پہ ٹھہری ہوئی
بادباں کھول دیتی ہے سرکش ہوا، موجیں اُٹھتی ہیں پرناؤ چلتی نہیں

میکدے بند ہیں، جام ہیں سرنگوں، بن کے سنجیدہ بیٹھا ہے گھر میں جنوں
رقص کرتی نہیں ہے نشے کی پری، بوتلوں سے شرابیں اچھلتی نہیں
آشنا ذائقوں کو ترستی زباں، جانی پہچانی خوشبو کی پیاسی ہے جاں
چولھوں کی آنچ کے رخ پہ رونق نہیں، برتنوں سے شعاعیں ابلتی نہیں

بند دروازے باہیں سمیٹے ہوئے، کھڑکیاں پردوں سے منہ لپیٹے ہوئے
ہونٹ دیواروں کے مسکراتے نہیں، جاگ کر آنکھیں تصویریں ملتی نہیں

کونپلیں شاخ پر گنگناتی نہیں، پھول گملوں دریچوں میں جتے نہیں
فرش و بستر پہ کلیاں چٹکتی نہیں، روشنی بام و در سے نکلتی نہیں

شورشیں دن کی مجھ کو بلاتی نہیں، محفلیں شام گھر میں سجاتی نہیں
رات کی خامشی بات کرتی نہیں، صبح پلکوں پہ کرنیں مچلتی نہیں

لمسِ لب ہائے جاں بخش بھولے ہوئے، ہونٹ گم گشتہ لذت میں کھوئے ہوئے
صورتِ دل نشیں سے تہی پتلیاں، نیند خوابوں کی راہوں پہ چلتی نہیں

ق

لمحۂ انتظار اس قدر بے کراں، دن بہ دن ماہ در ماہ پھیلا ہوا
عمرِ شمعِ شبِ انتظارِ ابد جلتی ہے، ختم ہوتی پگھلتی نہیں

تم گئے شورشِ جاں گئی دل گیا، خون کے جزر و مد کو سکوں مل گیا
آ بھی جاؤ کہ لوٹ آئیں بے تابیاں، دل دھڑکتا نہیں، نبض چلتی نہیں

میری وحشت کے جنگل کو گھر بخش دو، میرے گھر کے گلابوں کو زر بخش دو
ہجر کو شاعری کا ہنر بخش دو، دل کی آواز نغموں میں ڈھلتی نہیں

قرب کے فاصلے ہی تھے دل پر گراں، کیسے طے ہوں مسافت کی یہ دوریاں
میں پکاروں تم آواز دو جانِ جاں مجھ سے تنہا یہ دوری سنبھلتی نہیں

کوئی دو دن کو بچھڑے تو اس کو وحید اس طرح یاد کرتے بلاتے ہو کیوں
ہم نہ کہتے تھے ہے سرگرانی عبث، خوئے دل رنجشوں سے بدلتی نہیں

(6 اور 7 اگست 1977 کی درمیانی رات)

**(20)**

اپنا سرمایہ جز احساسِ زیاں کچھ بھی نہیں　　حلقۂ دامِ ہوس ہے یہ جہاں کچھ بھی نہیں
ہم اگر ہیں تو ہے یک لمحۂ و یک ذرّہ بہت　　ہم نہیں ہیں تو زماں اور مکاں کچھ بھی نہیں
آمد و رفتِ نفس کیا ہے بجز جہدِ شکم　　دین و دنیا ہیں عبث سود و زیاں کچھ بھی نہیں
خوں بہائے نظر و فکر پشیمانی ہے　　ملبۂ دیدۂ و دل قیمتِ جاں کچھ بھی نہیں
کیوں کہیں درد کسی سے کہ ہیں محتاج سبھی　　حاصلِ ذلتِ فریاد و فغاں کچھ بھی نہیں
کچھ جہاں اور ہیں کہتے ہیں مگر وہ معدوم　　ہے یہی اپنا جہاں اور یہ جہاں کچھ بھی نہیں
ادب و فلسفہ و علم تلاشِ موہوم　　ہیں سب اندازِ بیاں اور بیاں کچھ بھی نہیں
فاصلہ خواب و حقیقت کا بس اک طرزِ نظر　　چشمِ خوابیدہ و چشمِ نگراں کچھ بھی نہیں
گردشِ دہر ہے اپنی ہی نظر کی گردش　　ہے وجود اپنا زماں، ورنہ زماں کچھ بھی نہیں
ہم نہیں رکھتے ہیں وہ لوٹے جو تو اے دنیا　　تیرا یہ لاف وگزاف اے مری جاں کچھ بھی نہیں
قیمتِ تشنہ لبی کوئی نہیں دے سکتا　　ظلم و انصافِ امیرانِ مُغاں کچھ بھی نہیں

زندگی کوئی صحیفہ نہیں، جب چاہو پڑھو!
چوکے اِک پل تو یہ تحریرِ رواں کچھ بھی نہیں

(8 نومبر 1971)

**(21)**

خوابِ صحراؤں سرابوں میں پھرائیں گے تمھیں　　سایۂ گُل میں بھی شعلے نظر آئیں گے تمھیں
ہم ہی شرمائیں گے کوئی بھی خطا تم سے کرے　　تم کسی سے بھی لڑو، ہم ہی منائیں گے تمھیں
مسندِ پیرِ مُغاں چھوڑ کے جب اُٹھو گے　　پھر کوئی اور نہیں، یاد ہم آئیں گے تمھیں
ان گنت موجیں ہیں، ہر موج میں لاکھوں چہرے　　اس سمندر میں کہاں ڈھونڈنے جائیں گے تمھیں
ہم خلش بن کے بہت روز رہیں گے دل میں　　خوابِ نادیدہ ہیں، صورت نہ دکھائیں گے تمھیں
نہ کرو بات بڑی، وقت بدل دے گا تمھیں　　ہم سے بچھڑے تو بہت لوگ خوش آئیں گے تمھیں

عہد و پیمانِ وفا راس نہ آئیں گے تمھیں — اچھوں اچھوں کو نبھانا ہی پڑا دنیا سے
شعر ایسے بھی نہ پھر لوگ سنائیں گے تمھیں — اہل دل! سُن لو کہ ہم ہیں سخن ناگفتہ

لوگ ہوتے نہیں کیا اپنے سے بیگانہ وحید
ہم ہی جب ہم نہ رہیں، بھول بھی جائیں گے تمھیں

(23 اکتوبر 1974)

## (22)

صبح کو دیر بڑی ہے، سوجاؤ — رات ابھی پوری پڑی ہے، سوجاؤ
کیوں گنہگار ہوں چشم ولب و گوش — نفسی نفسی کی گھڑی ہے، سوجاؤ
نیند کو سونپ دو سب زخم اپنے — پھانس نس نس میں گڑی ہے، سوجاؤ
جاگتے عمر کٹے گی کیسے — نیند پلکوں پہ کھڑی ہے، سوجاؤ
رات بھاری ہے تو وحشت کیوں ہے — عمرِ غم شب سے بڑی ہے، سوجاؤ
وہ لڑا تم سے، خفا نیند سے تم — شب منانے کو کھڑی ہے، سوجاؤ
خواب کے شہر کے اک محلے میں — اُس کی تصویر جڑی ہے، سوجاؤ
اپنے انفاس سے کیوں اُلجھے ہو — سانس سینے میں اڑی ہے، سوجاؤ
درد کو نالوں میں رُسوا نہ کرو — اس سے امید بڑی ہے، سوجاؤ
آگے اس رہ میں ہیں اشکوں کے سراب — منزلِ ضبط کڑی ہے، سوجاؤ
گھر سے نکلے بھی تو پاؤ گے کسے — آج ساون کی جھڑی ہے، سوجاؤ
بحرِ ظلمات میں آنسو نہ گراؤ — یہ بھی موتی کی لڑی ہے، سوجاؤ
صبح کے خوابوں سے آنکھیں بھر لو — سب پہ یہ رات کڑی ہے، سوجاؤ

جسے آنا ہے، خود آئے گا وحید
آنکھ کیوں در سے لڑی ہے، سوجاؤ

(19 مارچ 1974)

**(23)**

تمھاری آنکھیں چمکتی ہیں دیکھ کر جو مجھے　　اسے کچھ اور کہو نامِ آشنائی نہ دو
تم اپنی بزم میں جو چاہو میرے حق میں کہو　　خدا کے واسطے الزامِ بے وفائی نہ دو
کہاں سے سیکھی ہے تم نے ادا یہ چھپنے کی　　ہمیشہ آنکھ میں بستے رہو، دکھائی نہ دو
تمہاری آنکھوں کے گوشوں میں جو تبسم ہے　　غضب ہے اس کو اگر رنگِ آشنائی نہ دو
خرد کا نشہ جو اترا، خمارِ وحشت ہے　　کہیں جنوں کو بھی تم نامِ خود نمائی نہ دو

یہ مان لو کہ دھڑکتے ہو تم بھی لفظوں میں
گلہ نہ ہوگا جو دادِ غزل سرائی نہ دو

(6 جون 1983)

**(24)**

خموشیوں کا اندھیرا ہے خیمہ زن ہر سُو　　کہ گفتگو بھی ہے خود پردۂ سخن ہر سُو
حصارِ ذات سے نکلو تو انجمن ہر سُو　　چھٹے وطن تو سفر میں بھی ہے وطن ہر سُو
خود اپنا چاکِ قبا سی رہے ہیں چارہ گراں　　پڑے ہیں زخموں کے روندے ہوئے بدن ہر سُو
جہاں کو بانٹنے بیٹھے ہیں علم فربہ عقل　　کھلے ہوئے ہیں شکم در شکم دہن ہر سُو
بہت مٹایا ہے دستِ ہوس نے حُسنِ زمیں　　بگاڑ پر بھی سنورنے کے ہیں جتن ہر سُو
صدا بھی ہونٹوں کے صحرا میں بن گئی ہے سراب　　کوئی تو بولے کہ ہیں گفتنی سخن ہر سُو
نہیں اندھیروں پہ تسخیرِ شش جہت آساں　　مچل رہی ہے تمنا کی اک کرن ہر سُو
نکل سکے جو نظر آنسوؤں کی چلمن سے　　کھلے ہوئے ہیں تبسم کے سو چمن ہر سُو
اُسی غزالِ رمیدہ کی جستجو ہے عبث　　غزال چشم بہت ہیں، بہت ختن ہر سُو
جو توڑ دے کوئی آئینہ ہائے خود بینی　　سجی ہوئی ہے نگاہوں کی انجمن ہر سُو

بہت گراں ہے تو زنجیرِ ذات بھی توڑو
اِسی کے سلسلے ہیں طوق اور رسن ہر سو

(3 ستمبر 1973)

**(25)**

خوشی سے اب نہ خوشی ہے، نہ غم سے غم ہم کو　　ہیں ایک ہی سے جہاں کے کرم ستم ہم کو
ہو لاکھ دھوپ، یہ ابر اب کہیں نہ برسیں گے　　وہ دن گئے کہ میسّر تھی چشمِ نم ہم کو
یہ ایک حرف بھی لُٹ جائے تو رہے گا نہ کچھ　　اے حرفِ عشق! ہے رکھنا ترا بھرم ہم کو
ہمارا کفر ہی شاید نجاتِ ایماں ہے　　بلا رہا ہے بہت جادۂ حرم ہم کو
ہمارا ہونا، نہ ہونا، ہے عکس کے مانند　　وجود بھی ہے اک آئینۂ عدم ہم کو
جو کل تھی پاؤں کی دھول، آج سر پہ چڑھتی ہے　　اس اک عذاب سے ہر اک سزا ہے کم ہم کو
یہی بہت ہے جو دنیائے کم عطا سے وحید
ملا ہے دل کا ورق، خون کا قلم ہم کو

(21 اپریل 1974)

**(26)**

پاؤں اُٹھتے ہیں تو زنجیر کی جھنکار کے ساتھ　　لوگ کرتے ہیں سفر بھی در و دیوار کے ساتھ
ایسے بیمار کا دنیا میں پنپنا ہے مُحال　　ہو غمِ دل بھی جسے دہر کے آزار کے ساتھ
مرحلہ جان نثاری کا کچھ آساں ہو جائے　　داد دیتا رہے قاتل ہی جو ہر وار کے ساتھ
روبرو واہمہ ہے یا ہیں کھلی آنکھوں میں خواب　　خود نظر پردہ ہے اک، پردۂ اسرار کے ساتھ
شبنم اک شوخیِ چشمِ سحری سہہ نہ سکی　　ہم نے تو عمر بسر کی نگہِ یار کے ساتھ
جشنِ خورشید میں شامل نہیں وہ شب بیدار　　لَو لگائے رہے جو صبح کے آثار کے ساتھ
مدتیں گزریں، نہ دل اُمڈا نہ آنکھیں برسیں
گئے برساتوں کے یہ لطف بھی دل دار کے ساتھ

(29 دسمبر 1979)

## (27)

(بہ طرزِ مولانا روم)

کوئی نہ ہو، غم نہیں کچھ، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ      آئینۂ جم نہیں کچھ، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ
خوش قدمی، گُل پیرہنی، سوسنی و نسترنی      روحِ چمن، جانِ منی، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ
صبح کے ہاتھوں میں مہر، روز ہے سر تا پا قہر      شام کے ہونٹوں پہ زہر، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ
بام نہیں، در نہیں، بالش و بستر نہیں      پردہ و چادر نہیں، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ
وا ہے شب و روز در، آتے ہیں جن و بشر      گھر کو کہیں کیسے گھر، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ
خوش نظری ہو گئی گم، دیدہ وری ہو گئی گم
خود نگری ہو گئی گم، تو جو نہیں ہم نہیں کچھ

(26 مئی 1987)

## (28)

(بیادِ اریب)

(یہ غزل اریب کی زمین میں ہے۔ اس کا مقطع دو لفظوں
کی معمولی سی تحریف کے ساتھ اریب ہی کا ہے)

کچھ پتا اُن کا بتا مُجھ کو چراغِ سحری      کیا ہوئے میرے رفیقِ شب آشفتہ سری
کو بہ کو جستجوئے روئے شناسا رُسوا      گم شدہ یاروں کو پائے گی کہاں در بہ دری
صبح وہ صبح نہیں، رات بھی وہ رات نہیں      وہ پرستارِ سحر ہیں نہ وہ شب کے سفری
یادوں کے ہاتھوں میں ٹوٹے ہوئے آئینے ہیں      دیکھتی پھرتی ہے ہر چہرہ پریشاں نظری
عشق بھی بھول گیا پاسِ گریباں کا سبق      اب جنوں کو بھی نہیں حوصلۂ جامہ دری
جام لبریز ہیں، پر دل تہی، آنکھیں خالی      کیوں اُترتی نہیں پیمانوں میں شیشے کی پری
کیا ہوئی رونقِ مے خانہ و سرمستیٔ غم      مے میسّر ہے، مگر چھن گئی شوریدہ سری
ایک کو بھی نہیں اب اِک کی خبر محفل میں      ہائے اک رندِ خوش اوقات کی محفل نگری

میری آنکھیں ہیں کہ صحراؤں کے سوکھے دریا　　دل کو سیراب بھی کرتی نہیں اشکوں کی تری
اب بھی آتا ہے مرے واسطے پیغامِ صبا　　پر نہ خوش بوئے رفاقت ہے نہ وہ خوش نظری
تو نے کس دل سے شبِ غم کی سحر کی ہے ادیب
یاد آئے گی زمانے کو تری بے جگری

(25 ستمبر 1970)

(29)

سخن کے مطلعِ رنگیں پہ جو تنویر اُترے گی　　زمیں کے دل میں بن کر نور کی تحریر اُترے گی
چلا سورج کا رتھ، رنگوں کی گرد اُڑنے لگی ہر سُو　　شفق کے آئینوں میں صبح کی تصویر اُترے گی
سنہرے نقرئی تیروں کی بارش ہے اندھیروں پر　　شعاعوں کی عماری سے ابھی تنویر اُترے گی
زمیں کو دیکھتے ہیں لوگ خواب آلودہ آنکھوں سے　　کہ جیسے آسماں سے خواب کی تعبیر اُترے گی
بہت دلکش ہیں دنیا کی گرفتاری کے ساماں بھی　　ہر اک شاخِ و شجر سے پھول کی زنجیر اُترے گی
وہ گذریں گے جدھر سے، بوئے آوارہ پتا دے گی　　وہ ٹھیریں گے جہاں، ہر سنگ پر تصویر اُترے گی
تمھارے خوں میں بُرِش ہے نہ ہے تاثیر نظروں میں　　تمھارے واسطے کیوں عرش سے شمشیر اُترے گی
دعائے زود اثر کی راہ میں کیوں ہاتھ حائل ہیں　　ابھی بجلی کی صورت کوند کر تاثیر اُترے گی
انھی اشکوں میں غرق آنکھوں کو چھولیں گی اگر کرنیں　　انھی آنکھوں میں اے قاتل تری تصویر اترے گی
امیں ہیں حسن کے پارہ ہائے قلب و برگ ہائے گل　　دلوں پر سنگ کے اس راز کی تفسیر اُترے گی
وحید انسان کو جو قتل کر دیتے ہیں ہنس ہنس کر
غزل سی شے دلوں میں اُن کے بن کر تیر اُترے گی

(6 اکتوبر 1973)

(30)

تیز کرنوں کی سنانوں سے چھدی رات ملی　　صبح بھی آئی تو آغشتۂ ظلمات ملی

تھا زمانے پہ گماں یہ کہ سب اس کے ہیں اسیر　　خود ہی زنجیر بہ پا گردشِ حالات ملی
رشتہ رکھتے ہیں تجارت کا خدا سے بھی لوگ　　غرض آلودہ ہر اک حمد و مناجات ملی
راز کی طرح رکھا سینے میں جس کو تا عُمر　　سنگِ دشنام کے ہونٹوں پہ وہی بات ملی
ظلم کا جس سے گلہ تھا جو ملا وہ سرِ رہ　　اُس کی نظروں میں بھی اک فردِ شکایات ملی
کس سے نومیدیِ جاوید کا شکوہ کیجے　　موردِ شکوہ ہمیں اپنی ہی اک ذات ملی
اپنے شعلوں سے اُگائی ہے ستاروں کی فصل　　زخم در زخم چراغاں ہمیں ہر رات ملی
ہجر ہے تشنگیِ ذات کا تنہا رستہ　　فاصلہ رکھ کے بہت صبحِ ملاقات ملی
آنسوؤں سے کبھی امید کی کرنیں پھوٹیں　　قہقہوں میں بھی کبھی غم کی مدارات ملی
ہم جہاں بھی گئے، سنگ اُٹھے قدم بوسی کو　　ارمغاں درد کا اور زخم کی سوغات ملی

ہر سخنور کو یہ اعزاز کہاں ملتا ہے
جُرمِ اظہار کی ہم ہی کو مکافات ملی

(13 اگست 1973)

## (31)

نہ سحرِ نغمہ، نہ شیرینیِ دہاں کو مِلی　　جو طرزِ خارا شگافی مری زباں کو مِلی
نواگرانِ سیاست کو جس کا دعویٰ تھا　　وہ انقلاب کی لَے بھی مری فغاں کو مِلی
بنا کے کاہکشاں تاج سج لیا اپنا　　جنوں کی خاکِ کفِ پا جو آسماں کو مِلی
تھا جس کا منتظر اک عمر زُہدِ شب بیدار　　وہ دولت اُتری تو ہم ایسے خُفتگاں کو مِلی
خدا کے بندوں کا گھر ہے نہ ملک ہے کوئی　　زمیں تمام شیوخ و برہمناں کو مِلی
متاعِ جاں، زر و اموال لے گئے قاتل　　بچی تھی خاک کی چادر تو کشتگاں کو مِلی
ہوس کے حکم سے ہیں سنگسار اہلِ وفا　　سزائے دار و رسن زلف بستگاں کو مِلی
جو ہے اُمڈتی ندی، مضطرب بگولوں میں　　وہ کرب روح کو، شورش وہ میری جاں کو مِلی
گئے نہ محفلِ جاہ و حشم میں اہلِ نظر　　کبھی ملی بھی یہ عزّت تو دلبراں کو مِلی

وحید بزمِ ہنر میں بھی فن ہے خاک نشیں
ہمیشہ صدر میں جا یاں بھی این و آں کو ملی

(18 مارچ 1979)

(32)

صبا! سنبھال کے رکھ نسخۂ خزانی بھی
اسی میں رکھتے ہیں اوراقِ شادمانی بھی
جلے دماغ تو لو دیتے ہیں معانی بھی
کھلا یہ طرزِ سخن شمع کی زبانی بھی
ہوں غم گسار ہزاروں، ہے پھر بھی غم تنہا
یہ داستان نئی بھی ہے اور پرانی بھی
مری تباہی میں شامل ہے جورِ دہر کے ساتھ
گلوں کا لطف بھی، خوباں کی مہربانی بھی
کہیں یہ ترکِ تعلق کی ابتدا تو نہیں
بہت دنوں سے نہیں اُن سے سرگرانی بھی
ہیں عرضِ حال میں اخفائے حال کے پہلو
شریکِ بزمِ سخن میں ہے بے زبانی بھی
میں اپنی پلکوں سے چُن لوں ہر آنکھ کے موتی
سحر کو سونپنی ہے شب کی یہ نشانی بھی
مزاجِ داریِ طوفاں بھی فرض ہے مجھ پر
مجھی کو کرنی ہے شمعوں کی پاسبانی بھی
میں جن کی بزم سے اُٹھا ہوں تشنگی لے کر
گراں ہے اُن پہ مری طبع کی روانی بھی
خدا کرے وہ رہیں ساتھ میرے شب بیدار
خدا کرے کہ نہ ہو ختم یہ کہانی بھی
اگر نہ توڑو گے زنجیرِ قیدِ ذات وحید
بنے گی پاؤں کی زنجیر زندگانی بھی

(12 اکتوبر 1974)

(33)

دشتِ خاموش بھی ہے دشتِ نوا سے آگے
بے ندا کوہ بھی ہیں کوہِ ندا سے آگے
کربلا پر ہی نہیں ختم شہادت کا سفر
کوفہ و شام ہیں گنجِ شہدا سے آگے
چیختے لفظوں سے دامن کو بچا فکرِ سخن!
باغِ معنی ہے بیابانِ صدا سے آگے
کئی برسوں سے نہ دل مہکا نہ غنچے ہی کھلے
پہنچی ہر بار خزاں بادِ صبا سے آگے
دل کی آبادی کا عنوان ہے کونین میں کیا
اک خلا اور ہے ہر ایک خلا سے آگے

قسمتِ عشق سدا بادیہ پیمائی ہے — ہجر کا دشت بھی ہے دشتِ وفا سے آگے
یہیں بیٹھے رہیں، مل جائے گی خود ہی منزل — راہ گُم ہے ترے نقشِ کفِ پا سے آگے
جستجو ختم نہ ہو کون و مکاں کی حد تک — ہوگی آزاد فضا بند فضا سے آگے

نونہالانِ نوا سے نہ ہو مایوس وحید
جائے گی اِن کی نوا تیری نوا سے آگے

**(34)**

جاگتے زیست کٹے گی، کوئی ایسا نہ بنے — خوابِ نادیدہ نگاہوں کی تمنا نہ بنے
ہم کہے دیتے ہیں وہ شخص مسیحا نہ بنے — زندگی دے کے جو بیمار کو اُس کا نہ بنے
جنتِ چشم میں آئینے جڑے ہیں ایسے — یہ مکاں ایک ہی صورت سے پری خانہ بنے
شہرِ جاناں سے بھی ہم لائے محبت کا خراج — کیا ضروری ہے کہ یاں وضعِ گدایانہ بنے
وحشت آمادۂ رسوائی ہے بے خوفِ جہاں — ضبط کا ہے یہ تقاضہ کہ تماشا نہ بنے
اجنبی لگتے ہیں ہم اپنی نظر کو خود ہی — آپ اپنے سے نہ اتنا کوئی بیگانہ بنے
ہم پہ اک عمر سے طاری ہے خموشی ایسی — ایک نقطے پہ سمٹ جائے تو افسانہ بنے

زندگی کرنے کے انداز تو بھولو نہ وحید
تم نے کیا سیکھا اگر عشق سلیقہ نہ بنے

**(35)**

آنکھ جو نم ہو، وہی دیدۂ تر میرا ہے — موجِ غم اُٹھے کہیں، اس کا گُہر میرا ہے
دیکھ لوں میں تو ستارے ہیں، نہ دیکھوں تو دھواں — کیا رسا اتنا کفِ دستِ نظر میرا ہے
ثمر و گُل ہیں گلستاں فروشوں کے لیے — آبیاری کے لیے خونِ جگر میرا ہے
پھر بھی گزرے گا ہر اک سیلِ خرابی یاں سے — گو بہت دوُر ہر اک راہ سے گھر میرا ہے
قصر ہو یا کہ لحد دونوں کرایے کے مکاں — روز کہتا ہے کوئی آکے، یہ گھر میرا ہے

دشت کی اُڑتی ہوئی ریت پہ لکھ دیتے ہیں لوگ یہ زمیں میری، یہ دیوار، یہ در میرا ہے
اس شرآبادِ خرابے میں کہاں حُسن و جمال حُسن جتنا بھی ہے سب حُسنِ نظر میرا ہے
موت ہے جرأتِ اظہار کی پژ مردہ لبی ساز تخلیق لب عرضِ ہنر میرا ہے
وہ خدا ہو تو ہو، میں ڈھونڈنے کیوں جاؤں اُسے خود ہی اپنا لے مجھے بڑھ کے، وہ گر میرا ہے
کٹ کے سر پڑھتے ہیں نیزوں پہ بھی قرآن وحید
مجو وتن رہ کے بھی چپ کس لیے سر میرا ہے

(14 اکتوبر 1980)

## (36)

گمان و شک کے تلاطم! اُتار پار مجھے نہیں کنارا تو گرداب میں اُتار مجھے
جو گُل تھے زینتِ دستارِ شہسوارِ بہار ملے ہیں بن کے غبارِ پسِ بہار مجھے
صلیبِ معرفتِ ذات کائنات ہے آج وہ دن گئے کہ خوش آتی تھی کوئے یار مجھے
مجھے خبر ہے، تری آستیں میں خنجر ہے جو وار کرنا ہے نظریں ملا کے مار مجھے
تمام رات کا جاگا ہوا تھا، سویا ہوں ٹھہر کے در پہ مرے اے سحر پکار مجھے
اگر ہے نور کا سائل ہوا کرے خورشید خود اپنی آگ کی تابش ہے سازگار مجھے
رضائے مسند و کرسی کے تھے کبھی خواہاں عزیز خاک نشینوں کا تھا وقار مجھے
خدا کو پا کے زمانہ پرست کھو بیٹھے
انا پرستی میں ہاتھ آیا کردگار مجھے

(12 نومبر 1976)

## (37)

خوشبو ہے کبھی، گُل ہے کبھی شمع کبھی ہے وہ آتشِ سیال جو سینے میں بھری ہے
بادہ طلبی شوق کی دریوزہ گری ہے صد شکر کہ تقدیر ہی یاں تشنہ لبی ہے
غنچوں کے چٹکنے کا سماں دل میں ابھی ہے ملنے میں جو اُٹھ اُٹھ کے نظر اُن کی جھکی ہے
اب ضبط سے کہہ دے کہ یہ رخصت کی گھڑی ہے اے وحشتِ غم دیر سے کیا سوچ رہی ہے

معصوم ہے یاد اُن کی بھٹک جائے نہ رستہ     خوں گشتہ تمناؤں کی کیوں بھیڑ لگی ہے
یادوں سے کہو سولہ سنگار آج کر آئیں     آئینہ بکف حسرتِ دیدار کھڑی ہے
ہر رنگ سے، ہر رُخ سے جسے دل میں اتارا     وہ شکل بھی اب خوابِ فراموش ہوئی ہے
لب سی لیے اندیشۂ دشنامِ جہاں سے     اب اپنی خموشی ہی اک افسانہ بنی ہے
ٹھہری ہے تو اک چہرے پہ ٹھہری رہی برسوں
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی رہی ہے

(38)

اک غزل آج بہ اندازِ قصیدہ لکھیے     ظلم اور کذب کے اوصافِ حمیدہ لکھیے
کیجیے اُن کی ثنا جتنے ہیں قشقہ بہ جبیں     جتنے ہیں اہلِ ریا، سب کا قصیدہ لکھیے
مصلحت ہے یہی مقتول کو ظالم کہیے     قاتلوں کو ستم و درد گزیدہ لکھیے
خاک میں رُلتے ہیں انمول جواہر تو رُلیں     ریگ کے ذرّوں کو افلاک رسیدہ لکھیے
قاہرِ قوم کے ہفوات کی تحسیں کیجیے     ہرزے کو حاکموں کے گوہرِ چیدہ لکھیے
دیجیے جابروں کو داد بخونِ دل و لب     تیغ کی مدح بہ انگشتِ بُریدہ لکھیے
دشمنِ جاں کو دل آرام و مسیحا کہیے     بے بصر ہیں جو اُنھیں مرژم دیدہ لکھیے
افترا باندھیے، دشنام کے لکھیے دفتر     پر حقائق کبھی دیدہ نہ شنیدہ لکھیے
گھر جلائیں وہ کریں قتل، کرم ہے ان کا     اُن کے اس لطف و عنایت کا جریدہ لکھیے
طبعِ نازک پہ گزرتا ہے گراں ذکرِ جنوں
اپنے دامن کو نہ دامانِ دریدہ لکھیے

(8 ستمبر 1980)

(39)

چراغِ عیش بجھیں تو مزاج داں کہیے     مژہ پہ اشک جو چمکے، بگلہ کناں کہیے
خیالِ بے حسیِ بزم مانعِ اظہار     سکوت کا یہ تقاضا کہ داستاں کہیے

(ق)

جنوں پہ اہلِ خرد کی ہے یہ بھی پابندی　　کہ زہر پی کے حدیثِ نشاطِ جاں کہیے
نہ لب پہ لائیے حق، حرفِ مصلحت آمیز　　بہ پاسِ خاطرِ احبابِ شادماں کہیے
ہوا ہے ٹوٹ کے نازک تر آبگینۂ دل　　ہجومِ شیشہ گراں میں یہ غم کہاں کہیے
بچا کے آنکھ دبے پاؤں غم بھی آتے ہیں　　ہزار آپ خوشی کی کہانیاں کہیے
جو دل پہ چوٹ لگائے کھٹک ہی جاتی ہے　　وہ بات کتنے ہی پردوں کے درمیاں کہیے

جسے زمانہ سمجھتا ہے، پر نہیں کہتا
وحید آپ ہی تنہا وہ داستاں کہیے

# مرثیے

# چادرِ تطہیر

(در حالِ سیدۃ النساء العالمین حضرت فاطمہ زہراؑ)

مریمؑ سے بھی سوا ہے فضیلت بتولؑ کی — بضعت رسولؐ کی ہے ریاضت بتولؑ کی
اجرِ پیمبری ہے مودّت بتولؑ کی — ایماں کا جز ہے عفت و عصمت بتول کی
آیاتِ نطق رب میں ہے تلمیحِ فاطمہؑ
تکمیل ہے نماز کی تسبیحِ فاطمہؑ

کس کا پدر ہے باعثِ تخلیقِ آسماں — شوہر ہے کس کا مرضیِ خلاقِ دو جہاں
کس کے پسر ہیں سیدِ جنت، نبیؐ کی جاں — کلثومؑ و زینبؑ ایسی ملیں کس کو بیٹیاں
مرکز بتولؑ دائرۂ پنجتن کی ہیں
ماں ہادیوں کی، مصدر امام زمن کی ہیں

کس کی ثنا میں آیۂ تطہیر آئی ہے — رحمت کا ابر بن کے ردا کس کی چھائی ہے
کس کی نقاب نور کی جلوہ نمائی ہے — فتحِ مباہلہ نے قسم کس کی کھائی ہے
کس کے قدم سے صنفِ نساء با شرف ہوئی
دہلیز کس کی معدنِ دُرِّ نجف ہوئی

پیوند ہیں ردا کے شرافت کے آفتاب    غربت کے یہ نشان ہیں غیرت کے آفتاب
ان پر ہیں ثبت مُہرِ نبوّت کے آفتاب    بخیوں سے ان کے اُبھرے امامت کے آفتاب

رہن اِس ردا کے ساتھ خود ایمان ہو گیا
جس گھر میں پہنچی مطلعِ ایمان ہو گیا

چادر ہے ابرِ کوثر و تسنیم کے لیے    افلاک در پہ جھکتے ہیں تکریم کے لیے
جبریلؑ ادب سے آتے ہیں تسلیم کے لیے    اُٹھتے ہیں خود رسولؐ بھی تعظیم کے لیے

ذکر اس کی عظمتوں کا حدیثِ کسا میں ہے
انوارِ حق کا مجمع اِسی اِک ردا میں ہے

تہہ ہو تو اِس ردا کو کہیں ہفت آسماں    پھیلے تو اس کے گوشے میں سمٹیں زماں مکاں
گرد اس کی ہیں ثوابت و سیّار و کہکشاں    سر پر ہو فاطمہؑ کے تو ہے عرش آستاں

دھو کر نچوڑیں وہ تو فرشتے وضو کریں
بوندوں سے اس کی کوثر و زمزم سبو بھریں

چادر یہ بوترابؑ کی غربت کی ہے گواہ    شاہِ نجف کے فقر و دیانت کی ہے گواہ
فاقوں کی لاج محنت و عظمت کی ہے گواہ    یہ چکّی پیسنے کی ریاضت کی ہے گواہ

خیبر شکن کی بے زرہی کی زرہ ہے یہ
عقدہ کشا کے رشتۂ حق کی گرہ ہے یہ

ہے یہ جہیزِ قُرۃ العین شہِ رُسل    شاخِ نہالِ مالِ خدیجہؑ کا برگِ گل
چادر ہے یا کہ لختِ دلِ فخرِ جزو و کل    ہے بادبانِ کشتیِ اُمت، ارم کا پُل

قرطاسِ صلحِ حضرتِ شبّرؑ ہے یہ ردا
شبّرؑ کے شہیدوں کا محضر ہے یہ ردا

سائے میں اس کے بخشش و رحمت کے قافلے    لپٹے ہیں اس سے اہلِ شفاعت کے قافلے
پیوندوں میں ہیں اس کی نجابت کے قافلے    تاروں اس کے کربلا کی شہادت کے قافلے

بانوؑ کے سر پہ تاج کا سایہ یہی ردا
زینبؑ کی بے ردائی کا پردہ یہی ردا

عاشور کی شعاعوں کی چادر یہی ردا    تا عصر تھی شہیدوں کے سر پر یہی ردا
تھی نعش پوشِ قاسمؑ و اکبرؑ یہی ردا    آئے تھے رن میں اوڑھ کے اصغرؑ یہی ردا
اک پل جدا ہوئی نہ تنِ پاش پاش سے
لپٹی رہی حسینؑ کی پامال لاش سے

آئیں گی روزِ حشر یوں شہزادیٔ جہاں    پیشِ خدائے عادل و قہار نوحہ خواں
چہرے پہ ہو گا خونِ جگر بند ضوفشاں    چادر پہ ہوں گے زخموں کے بکھرے ہوئے نشاں
اصغرؑ کی لاش، بازوئے عباسؑ کی قسم
دیں گی خدا کے عدل کو یہ پیاس کی قسم

ہر ظلم، ہر ستم کی شہادت ہے یہ ردا    فریادِ حشر، صورِ قیامت ہے یہ ردا
بے آسروں پہ سایۂ رحمت ہے یہ ردا    فاقہ کشوں، غریبوں کی دولت ہے یہ ردا
تاریخ و ارتقا کا تسلسل ہے یہ ردا
موجِ جفا میں صاعقۂ گل ہے یہ ردا

ہے اس ردا کا نور رُخِ آفتاب میں    پرتو ہے اِس کا آئینۂ ماہتاب میں
ٹھنڈک اسی کے سائے کی چترِ سحاب میں    ہیں رنگ ونکہت اِس سے ہی پیدا گلاب میں
دریوزہ گر اسی کے ہیں خیر و جما ل بھی
وابستہ ہیں اِسی سے فنون و کمال بھی

اے رحمتِ دوعالم و اے چادرِ بتولؑ    سرکارِ عالیہ سے ملے دولتِ قبول
دامانِ شعر کو ہوں عطا رنگ رنگ پھول    سائے میں آپ کے ہو شگفتہ دلِ ملول
یہ تو ہوس نہیں ہے کہ جنت مجھے ملے
اک گوشۂ ردائے محبت مجھے ملے

کیا آپ کی ردا سے جدا بھی ہیں جنتیں؟    کیا آپ کی دعا سے الگ ہیں محبتیں؟
کیا آپ کے کرم سے گراں تر ہیں دولتیں؟    کیا آپ کے قدم سے ہیں بڑھ کر حکومتیں؟
جنت ہیں وہ قدوم ہی کونین کے لیے
جن کے نقوش شمع تھے حسنینؑ کے لیے

تھے یہ قدم زینتِ آغوشِ مصطفیٰؐ　　یہ تھے شریک و ہم سفرِ جہدِ مرتضیٰؑ
چمکی ہے ان کے نقش سے چشمِ مباہلہ　　ان سے ملا بقیع کو جنت کا مرتبہ
یہ آبلہ بکف سفرِ کربلا میں تھے
یہ ہم قدم اسیریِ آلِ عبا میں تھے

تقویٰ کے معنی پوچھیے ربِّ علیم سے　　اخلاق کیا ہے پوچھیے خُلقِ عظیم سے
غربت کی قدر پوچھیے دُرِّ یتیم سے　　یا آسیائے دستِ نبیؐ کریم سے
مفلس کے لال پلتے ہیں کیسے علیؑ سے پوچھ
یا چکّی پیستی ہوئی بنتِ نبیؐ سے پوچھ

اے شوقِ زر ہوائے حکومت ہوا ہے تو　　اے خواہشِ وجاہت و طاقت خطا ہے تو
اے نازِ اقتدار، رہینِ جفا ہے تو　　اے ظلم و غصبِ مال بھٹکتی صدا ہے تو
افلاسِ مصطفیٰؐ کا ہے سرمایہ دارِ دیں
فقرِ علیؑ و فاطمہؑ ہے اعتبارِ دیں

سرمایہ کوشی دشت نوردی ہوس کی ہے　　طاقت کا خوف بندگی خار اور خس کی ہے
ایوانِ عیش قیدِ دوامی قفس کی ہے　　عمر اقتدار و جاہ کی بس اک نفس کی ہے
عزت ازل ابد کی ہے محنت کے ہاتھ میں
سورج ہیں قید جہد و مشقت کے ہاتھ میں

چکّی ہے فاطمہؑ کی کہ ہے گردشِ زماں　　ہے اس کا ایک پاٹ زمیں، ایک آسماں
ہیں اس کے ساتھ رقص میں مہر و ستارگاں　　آٹا ہے اس کا نور تو دانہ ہے کہکشاں
پاٹوں سے اس کے نور کے دھارے نکلتے ہیں
پچھلے پہر اندھیرے میں تارے نکلتے ہیں

چکّی کے ساتھ چلتا ہے دنیا کا انتظام　　بچّوں کو دودھ ملتا ہے، مسکینوں کو طعام
ایماں کو زور ملتا ہے، اسلام کو قیام　　چلتا ہے اس سے دین کے میخانے کا نظام
اس کا فشردہ ساقیِ کوثر کا جام ہے
اس کے لبوں پہ ختمِ رُسُل کا پیام ہے

شمعیں نہیں تو دل میں ہیں آیاتِ ضوفگن      نوری لبوں سے ہوتی ہیں ظلمات ضوفگن
کلمے رضا کے، صبر کے نغمات ضوفگن      لب پر ہے گیت بن کے مناجات ضوفگن
یا رب! ریاضِ بنتِ نبیؐ رائیگاں نہ ہو
محروم نورِ حق سے کبھی یہ جہاں نہ ہو

گٹھے ہیں انگلیوں پہ، کفِ دست پر نشاں      دریائے نور ہوتا ہے ظلمات میں رواں
خم ہے کمر میں، شانوں میں ہے دردِ نغمہ خواں      پلتی ہیں شاخِ درد کے سائے میں سیّداں
ہے دستِ فاطمہؑ کی یہ تعمیر، ڈھ نہ جائے
دودھ ان مشقتوں کا لہو بن کے بہہ نہ جائے

چکّی کے ساتھ ذرّوں کے لب پر درود ہے      بیدار خواب گاہِ جہاں میں وجود ہے
مست اس صدا سے انجمنِ ہست و بود ہے      روح الامیں کا بیتِ وحی میں ورود ہے
گردن جھکے تو سجدے میں جھکتے ہیں آسماں
دم لیں تو سانس لینے کو رُکتے ہیں آسماں

زلفیں اڑیں جو چہرے پہ گھبراتی ہے ہوا      قطرے گریں جبیں سے تو شرماتی ہے ہوا
گردش میں آئے ہاتھ تو لہراتی ہے ہوا      پونچھیں پسینہ یہ تو ٹھہر جاتی ہے ہوا
بھر دیتا ہے پسینہ ہواؤں کی جھولیاں
پاتی ہیں رنگ و نور فضاؤں کی جھولیاں

موجِ صبا کے ہاتھ میں ہے دستِ آسیا      چکّی کے پاٹ کھینچتی ہے خوشبوئے حنا
تحریر برگِ گل پہ قصیدہ ہے جہد کا      انگشت ہائے نور پہ محنت کے نقشِ پا
نور و گل و حنا و صبا مل کے چلتے ہیں
تب پتھروں سے دودھ کے چشمے اُبلتے ہیں

زہراؑ جو ہاتھ روک لیں بے نم ہو زمیں      آغشتہ تیرگی میں ہو افلاک کی جبیں
ہوں خشک بحر، ہو تہی ندیوں کی آستیں      دولت کے سامنے ہو نگوں نازِ فقرِ دیں
پاٹوں میں اس کے سلطنتیں پس کے رہ گئیں
خاشاک بن کے دولتیں شاہوں کی بہہ گئیں

عزمِ جہاد، نورِ یقیں ہے اسی کا فیض  معراجِ خاک، عرشِ بریں ہے اسی کا فیض
خونِ حسینؑ و فتحِ مبیں ہے اسی کا فیض  شیرِ خدا کی نانِ جویں ہے اسی کا فیض
دنیا میں سر فرازیِ غربت اسی سے ہے
حیدرؑ کی ذوالفقار کی طاقت اسی سے ہے

ہے آسیائے فاطمہؑ افلاس کا غرور  محنت کشوں کے دستِ جہاں آفریں کا نور
مستضعفینِ دہر کو رکھتی ہے یہ غیور  متکبرینِ وقت کے کرتی ہے خواب چور
فاقوں کا زور تشنہ لبوں کی تری ہے یہ
انکارِ طاقت و حشم و زرگری ہے یہ

چکی چلی تو نسل و نسب ہو گئے زبوں  ظلم و تشدد و زر و طاقت ہوئے نگوں
گردش سے اس کی صاحبِ جرأت ہوا جنوں  اس کے عرق سے دیں کی رگوں میں بنا ہے خوں
گردش نے اس کی وقت کا دھارا بدل دیا
ہر دور کے یزیدوں کے سر کو کچل دیا

نغمہ ہے آسیا کا صدا انقلاب کی  تفسیر ہے یہ رحمتِ عالم کے خواب کی
ہے گونج ضربِ تیغِ شہِ بو ترابؑ کی  دھڑکن ہے قلبِ سبطِ رسالت مآبؐ کی
سیراب اس کے دھارے سے کرب و بلا رہا
اصغرؑ کا خشک ہونٹ گلِ تر بنا رہا

آوازِ آسیا میں ہے ناطقِ وحی کا باب  زہّاد اور ملائکہ کے سجدوں کا جواب
لوری سے اس کی رہتے ہیں حسنینؑ محوِ خواب  نغمے سے اس کے ہوتے ہیں بیدار بوترابؑ
اس کی صدا ہے گوہرِ گوشِ محمّدی
گُل اس صدا کے زینتِ دوشِ محمّدی

قربان دستِ محنتِ زہراؑ پہ جنتیں  قدموں پہ ہیں نثار زمانے کی دولتیں
صدقہ ہیں ان کا مملکتیں اور حکومتیں  آنکھیں انھیں جو چوم لیں پائیں بصیرتیں
ان کا نیاز مند ہے جو، بے نیاز ہے
پوجا بھی ایسے قدموں کی جزوِ نماز ہے

لختِ دلِ رسولؐ دو عالم ہیں فاطمہؑ     ناز آفرینِ جنتِ آدم ہیں فاطمہؑ
فخرِ خدیجہؑ، نازشِ مریمؑ ہیں فاطمہؑ     مولائے کائنات کی ہمدم ہیں فاطمہؑ
بیت الشرف رسولؐ کا روشن انہی سے ہے
بیتِ علیؑ اماموں کا مامن انہی سے ہے

فاقے کیے تو شکر خدا کا ادا کیا     افطار تین روزوں کا سائل کو دے دیا
چاک لباس کیا، لب شکوہ بھی ہے سیا     اشکوں کے ساتھ زہر مصائب بھی پی لیا
نانِ جویں میں ساتھ خدا کے ولی کا ہے
صبرِ جمیل حوصلہ صبرِ علیؑ کا ہے

خلوت میں فقر و صبر کی گوشہ گزیں رہیں     کارِ امورِ خانہ میں عزلت نشیں رہیں
غربت میں شاد، خوفِ خدا سے حزیں رہیں     بار اپنی زندگی میں کسی پر نہیں رہیں
عمر اہلِ خاندان کی خدمات میں کٹی
بچوں کی تربیت میں، عبادات میں کٹی

گھر میں نہ ہونے دی کبھی تفریقِ خاص و عام     خود ایک روز کرتی تھیں، اک دن کنیز کام
آرام ایک دن نہ لیا صبح تا بہ شام     دعوت کو اہلِ زر کی سمجھتی رہیں حرام
مسند نشینِ صبر کا تکیہ خدا پہ ہے
عزلت گزینِ فقر کا بستر رضا پہ ہے

چہرے پہ نور، آنکھوں میں ہے ایسی روشنی     دیکھے جو ایک بار منور ہو زندگی
حسنینؑ ہوں کہ زینبؑ و کلثومؑ یا علیؑ     قائم اس آفتاب سے ہے سب کی تازگی
یہ ذاتِ مصطفیٰؐ کے دلوں کا سرور ہے
شب ہائے مرتضیٰؑ کے اندھیروں کا نور ہے

بوسیدہ پیرہن میں ہے شانِ قبائے گل     پیوند ہیں ردا میں کہ ہیں برگ ہائے گل
ہیں عارض و جبین کے قطرے بہائے گل     لب گل ہیں، نرم باتیں خرامِ ہوائے گل
تنہا اس ایک گل سے پیمبرؐ ہیں باغ باغ
حسنینؑ شاد، حیدرؑ صفدر ہیں باغ باغ

یہ روشنی کا پھول ہے سر تا قدم بہار   خیرِ بشر کا نورِ نظر، قلب کا قرار
انفاس عطر، خاکِ قدم نور کا غبار   اس گل کے زر سے دامنِ ایماں ہے مال دار
پروانہ نورِ اوّل اسی روشنی کا ہے
یہ نورپارہ نورِ چراغِ نبیؐ کا ہے
یہ گل ہے پرتوِ لب و رخسارِ مصطفےٰؐ   یہ گل ہے نورِ طرّۂ دستارِ مصطفےٰؐ
یہ گل ہے اجر و ماحصلِ کارِ مصطفےٰؐ   یہ گل ہے دلبر و دل و دلدارِ مصطفےٰؐ
گردش میں ہے فلک اسی خورشید کے لیے
آتے ہیں بار بار نبیؐ دید کے لیے
زہراؑ گھر اپنا چھوڑ کے جاتیں نہیں کہیں   پھرتا ہے جابجا کبھی قطبِ زمیں کہیں
پردے سے باہر آتا ہے نورِ یقیں کہیں   ہٹتا ہے جا سے قبلۂ ایماں و دیں کہیں
دھرتی پہ آسمان اترتا نہیں کبھی
راتوں میں آفتاب ابھرتا نہیں کبھی
ہے ضد یہ اک یہودی کی، زہراؑ ہوں میہماں   شب کا تقاضا ہے کہ ہو سورج کی میزباں
مقصد ہے لینا فقرِ محمدؐ کا امتحاں   ناموسِ دین و غیرتِ حیدرؑ ہے درمیاں
شادی کے گھر میں جانا ہے زیور نہیں کوئی
کہنہ ردا ہے، دوسری چادر نہیں کوئی
جائیں ضرور مشورہ یہ مرتضےٰؑ کا ہے   منشاجو مرتضاؑ کا ہے، وہ مصطفےٰؐ کا ہے
منشا جو مصطفےٰؐ کا ہے، وحیِ خدا کا ہے   منشا وحی کا، حکم لبِ کبریا کا ہے
ان سب کی جو رضا ہے وہی فاطمہؑ کی ہے
خواہش ہے فاطمہؑ کی وہی، جو خدا کی ہے
ہے فکر کیسے خلعتِ نو کا ہو انتظام   عقدہ کشا سے ہو گا نہ زیور کا انصرام
آرائشِ جمال کا ہو کیسے اہتمام   کہتے ہیں بوتراب کہ ہے جمعِ زر حرام
جھرمٹ نہیں کنیزوں کا ہمراہی کے لیے
دنیا ہے تنگ دیں کی شہنشاہی کے لیے

دیکھا جو مصطفیٰؐ نے، ہے بیٹی کو پیش و پس　　فرمایا زیب و زینتِ دنیا ہے خار و خس
ہے طُرۂ حباب تماشائے یک نفس　　دولت ہے خاک اور ہوا ہے فقط ہوس
محتاجِ خلعت و زر و زیور ہیں تیرہ رو
چلتے ہیں جھرمٹوں میں کنیزوں کے خیرہ رو

زینت تمھارا حسن ہے، زیور تمھارا فقر　　سجدہ تمھارا تاج ہے، چادر تمھاری صبر
عصمت کنیز، آیۂ تطہیر روحِ عطر　　ہے نورِ ماہ فرش براہ، آسمان چتر
تارے فلک بچھائے گا رستے میں، گل زمیں
حاجب کل آسمان ہیں، خادم ہے کل زمیں

حلقے میں اپنے لیں گی تمھیں حوریانِ خلد　　گائیں گے شعر مدح و ثنا طوطیانِ خلد
محمل کے گرد ہوگی صفِ قدسیانِ خلد　　چرچا رہے گا حشر تلک درمیانِ خلد
اک شب خرامِ نور سے وہ کہکشاں بنی
زہراؑ کے پاؤں چھو کے زمیں آسماں بنی

صادقؑ کی باتیں سنتی تھی ہو ہو کے خوش زمیں　　تھے خرمنِ وحی کے خود افلاک خوشہ چیں
مستانہ دارِ خلد سے حوریں اتر پڑیں　　حیدرؑ کے ساتھ فاطمہؑ زہرا بھی یوں ہنسیں
گل ہائے لب کھلے، دُرِ دنداں چمک گئے
پرتو سے ان ذروں کے ستارے دمک گئے

فرمایا، لے گا صدق کا کذب امتحان کیا　　کھولے گا حق کے سامنے باطل زبان کیا
سورج کے آگے دیپکوں کی آن بان کیا　　نورِ خدا کے سامنے زر میری جان کیا
اہلِ نیاز کے لیے دنیا ہے نازمند
ہوتی ہے بے نیازوں کی یہ خود نیاز مند

جاؤ اسی لباس و ردائے کہن کے ساتھ　　ملتا ہے فقر شاہوں سے بھی بانکپن کے ساتھ
ہے عہدِ عزتِ ابدی پنجتنؑ کے ساتھ　　چلتی ہیں خود بہار کی موجیں چمن کے ساتھ
ذلت خدا کے ہاتھ ہے عزت خدا کے ہاتھ
ہے آبروئے فقر نبیؐ فاطمہؑ کے ہاتھ

نکلیں جو گھر سے، حوروں نے حلقے میں لے لیا　　آئیں جلو میں مریمؑ و حوّاؑ و آسیہؑ
چھڑکاؤ راستے میں ملائک نے یوں کیا　　ہر ہر قدم پہ کوثر و زمزم بہا دیا
رکھے جہاں بھی پاؤں، ستاروں نے سر رکھے
قدموں پہ جنتوں کی بہاروں نے سر رکھے
سورج نے چاہا لثم جہاں میں خلل پڑے　　تاجِ بتولؑ بننے کو شب میں نکل پڑے
ابرو پہ نورِ حق کے تکلف سے بل پڑے　　زلفوں سے روشنی کے سمندر اُبل پڑے
سورج کا چہرہ شرم سے خود آب آب تھا
چاہا قدم کو چوم لے، واں ماہتاب تھا
تھا اپنی بے سوادی پہ سورج کو اضطراب　　اترا رہا تھا قدموں سے وابستہ ماہتاب
جاگے تھے آج طالعِ بیدار یا تھا خواب　　ہوتا ہے کون خدمتِ زہراؑ میں بار یاب
اس رات مہر بھی گروِ ماہ ہوگیا
وہ داغ لے گیا، یہ شہنشاہ ہوگیا
خدمت ہے ان کی دہر کی خدمات سے گراں　　تسبیحِ فاطمہؑ ہے مناجات سے گراں
ضربِ علیؑ ہے جیسے عبادات سے گراں　　پابوسیِ بتولؑ ہے طاعات سے گراں
جو ذرّہ آیا پاؤں تلے، ماہ ہوگیا
پابوس جو نہ ہوسکا، گمراہ ہوگیا
شادی کے گھر پہ ٹھہرا جلوسِ فلک صفات　　اک نقطے پہ ٹھہر گئی رخشندہ کائنات
سمٹے تھے اک وجود میں انوارِ شش جہات　　آنکھیں جھپکتی رہ گئی خیرہ نظر برات
عصمت نقیب بن کے پکاری، نظر جھکے
طغیانِ نور دیکھ کے سجدوں میں سر جھکے
پیوند دیکھتی نگہِ عیب جو کدھر　　بے زیوریِ نور پہ کیا جچتے کم نظر
بارش تھی سورجوں کی فلک سے زمین پر　　ہر تار تھا شعاعوں کا تاروں کی رہ گذر
نوری قدم کے نقش زمیں پر نہیں ملے
ڈھونڈا تو یہ نشاں سرِ عرشِ بریں ملے

پہنچیں دُلہن کے حجلے میں اس شان سے بتولؑ    حوریں نثار کرتی تھیں باغِ جناں کے پھول
سمجھیں یہ اہلِ خانہ، ہوا عرش کا نزول    تھا سیلِ نور، نورِ جگر گوشۂ رسولؐ
مہلت نہ دی نفس نے جو رخ پر نظر گئی
غش آ یا، روح جسم سے پرواز کر گئی

ماتم کدہ نشاط کا کاشانہ بن گیا    تن جاں سے، دل دھڑکنے سے بیگانہ بن گیا
بجھ بجھ کے ہر چراغ اک افسانہ بن گیا    حجلہ عروسِ نو کا سیہ خانہ بن گیا
قصدِ دُعا کیا گلِ شاخِ رسولؐ نے
پردے ہٹا دیے درِ حُسنِ قبول نے

ہاتھ اٹھے بھی نہ تھے کہ ہوئی کارگر دعا    لب وا نہ ہونے پائے تھے بابِ اثر کھلا
لوٹ آئی ہاتھ باندھے ہوئے راہ سے قضا    رب نے کہا، مشیتِ حق ہے تری رضا
تیری نگاہ موت بھی ہے زندگی بھی ہے
تو تیغِ مرتضیٰ بھی ہے، عفوِ نبیؐ بھی ہے

یہ مسکرائیں، پڑ گئی مردہ بدن میں جاں    دل دھڑکا، سانس آئی، ہوئی نبض پھر رواں
کروٹ بدل کے خواب سے چونکی عروس یاں    تسلیمِ فاطمہؑ کو جھکی زندگی وہاں
اب دیکھا روئے پاک تو کلمہ زباں پہ تھا
پہلے جہاں تھا کفر، اب ایماں وہاں پہ تھا

حائل میانِ ماضی و حال ایک لمحہ تھا    وقفہ تھا موت کا کہ تھا عرفانِ فاطمہؑ
یوں چمکا کب نصیب کسی نو عروس کا    پائی حیاتِ تازہ بھی، ایماں بھی مل گیا
کیا کہیے اس کو عالمِ بالا سے کیا ملا
نور اُس کو فاطمہؑ کا وہاں، یاں پتہ ملا

پروانہ وار اُٹھ کے ہوئی شمع پر نثار    عصمت کا کلمہ پڑھ کے ہوئی حق کی حلقہ دار
چادر ہے فاطمہؑ کی کہ ایمان کا حصار    نظریں بھی اِس سے مس ہوں تو ملتا ہے اعتبار
اُمِّ حبیبہ ہوگئی مشہور شہر میں
پایا شرف کنیزیِ زہراؑ کا دہر میں

چوکھٹ پہ فاطمہؑ کی رہی برسوں باریاب　　اب بھی، تھی کنیزیِ زر خدمتِ سراب
رشکِ صد آفتاب ہے یاں گوشۂ نقاب　　اِس در سے ملتی ہے جو، وہ دولت ہے بے حساب

زہراؑ کی باندیوں کو بھی کیا کیا نہیں ملا
عرفانِ پنجتنؑ ملا، نورِ یقیں ملا

ناراضگی ہو جس کی قضا، اور خوشی حیات　　جس کے غضب سے درہم و برہم ہوں شش جہات
جس کی دعا سے پار لگے کشتیِ نجات　　تکلیف سے ہوں جس کی غمیں فخرِ کائنات

بعدِ نبیؐ وہ حلقۂ جور و جفا میں ہے
جانِ رسولؐ کش مکش و ابتلا میں ہے

اُلٹا جہانِ کج رو و کج بیں نے وہ ورق　　ہے نفس کے جہاد پہ ماسورِ نفسِ حق
لیتا ہے ذوالفقار سے صبر آن کر سبق　　گرتا ہے آسمان نہ ہوتی ہے ارض شق

آنسو چمک رہے ہیں ردائے بتولؑ پر
ہے زلزلے میں عرش عزائے بتولؑ پر

کہتی ہیں بعد آپ کے یا شاہِ انبیاءؐ　　دیکھے ہیں وہ مصائب و آلام برملا
دن دیکھتا تو اوڑھتا شب کی سیہ عبا　　ہو جاتا ٹکڑے ٹکڑے پہاڑوں کا سلسلہ

پابندیاں فغاں پہ ہیں، قدغن ہے آہ پر
چلمن ہے آنسوؤں کی ہمیشہ نگاہ پر

اے رحمتِ دوعالم و محبوبِ کبریا　　دنیا کو بیٹی آپ کی دے کیسے بد دعا
کل تک جو زندگی تھی کنیز، آج ہے خفا　　روٹھی ہوئی ہے سیدۂ دہر سے قضا

بعد آپ کے نظر میں زمانہ سیاہ ہے
مالِ نبیؐ پہ صاحبِ دیں کی نگاہ ہے

حق کا غرور خدمتِ خیر الوریٰؐ میں تھا　　غربت کا عیش دیدِ حبیبِ خدا میں تھا
فتحِ مبیں کا وعدہ نبیؐ کی دعا میں تھا　　لطفِ جہاد زندگیِ مصطفےٰؐ میں تھا

ہر جنگ اب تو مالِ غنیمت کی جنگ ہے
طاقت کی، اقتدار کی، دولت کی جنگ ہے

قرآں میں گوشہ گیر ہے علمِ نبیؐ کا باب　　دُر دیدۂ مباہلہ کے غم سے ہیں خراب
تطہیر کی ردا ہے کہ برسات کا سحاب　　رُوپوش آنسوؤں میں ہے عصمت کا آفتاب
دیوارِ گریہ در ہے رسالت مآبؐ کا
ہے کشتِ اشکِ فاطمہؑ گھر بو تراب کا

دن بھر جنابِ فاطمہؑ جاں اپنی کھوتی ہیں　　باغِ بقیع میں دُرِ غم جا کے بوتی ہیں
راتوں کو خود کو روک کے گھٹ گھٹ کے روتی ہیں　　پر آس پاس نیندیں پریشان ہوتی ہیں
کہتے ہیں امتی کہ نبیؐ کو نہ روئیے
اے شاہزادی اتنا کسی کو نہ روئیے

ہم سایگاں کے شکوے پہ زہراؑ نے یہ کہا　　کہہ دیجیے اہلِ شہر سے اے شاہِ لافتا
اک دو دن اور امتی سُن لیں مری بُکا　　رُو رُو کے پھر نہ لے گا کوئی نامِ مصطفیٰؐ
بابا سے چھٹ کے ڈھائی مہینے گذر گئے
سینے میں دم اُلجھتا ہے ہم کیوں نہ مر گئے

دنیائے بے حیا کی تو ہے زندگی طویل　　حساس دل کی فرصتِ گریہ بھی ہے قلیل
گل اختصارِ عمرِ لطافت کی ہے دلیل　　خوشبو و رنگ و نور ہیں آوازۂ رحیل
ہے ہے خدا نہ کردہ سکوں میں خلل پڑے
سب سوئیں چین سے کہ ہم اب گھر سے چل پڑے

اک روز آ کے دیکھتے ہیں گھر میں مرتضیٰؑ　　مصروف کام میں ہیں بہت بنتِ مصطفیٰؐ
رکھا ہے ایک سمت کو کھانا پکا ہوا　　بچّوں کے کپڑے دھونے کو پانی بھی ہے بھرا
اطفال کے نہانے کا بھی اہتمام ہے
رخسارِ زرد فاطمہؑ کا لالہ فام ہے

پوچھا، یہ اہتمام ہے کیا دخترِ رسولؐ　　مدّت کے بعد سرخ و شگفتہ ہے رخ کا پھول
پھر میرے خاکداں پہ ہے نعمات کا نزول　　گویا ہوئیں علیؑ کی طرف دیکھ کر بتولؑ
آج آخری یہ دن مرا دنیا کے گھر میں ہے
اے بوالحسنؑ! بتولؑ کا دل اب سفر میں ہے

ہے فکر میرے بعد نہ بچے پھریں تباہ　　یہ اہتمام ہے اسی اندیشے کا گواہ
بنتِ عمیس رکھے گی اطفال پر نگاہ　　مشکل کشا سے لطف کی خواہاں ہے عذرخواہ
بچوں سے میں بچھڑتی ہوں اس کا ملال ہے
بار آپ پر پڑے گا بہت، یہ خیال ہے

ایسا نہ ہو کہ دیدۂ حسنینؑ نم رہے　　زینبؑ نہ میرے واسطے وقفِ الم رہے
کلثومِ خوردسال پہ چشمِ کرم رہے　　دیجے وہ پیار، بچوں کو ماں کا نہ غم رہے
میری طرح یہ بچے بھی عاشق ہیں باپ کے
میں ان کو چھوڑتی ہوں بھروسے پہ آپ کے

دل شیرِ حق کا پھٹنے لگا، کٹ گیا جگر　　اشکوں کو روک کر یہ کہا دل کو تھام کر
کیوں ایسی باتیں کرتی ہو زہرائے خوش سیر　　مانا تمھاری شان کے شایاں نہیں یہ گھر
جیسے بھی گزرے ساتھ ہمارے بسر کرو
معصوم ہو، اکیلے نہ لمبا سفر کرو

یہ سچ ہے بعدِ خیرِ بشر زندگی ہے عار　　پر کیا کریں کہ ہے یہی مرضیِ کردگار
اٹھارہ سال کا بھی ہے جینے میں کچھ شمار　　دیکھی نہ تم نے عمر کی انیسویں بہار
بچوں کے ساتھ رہ کے سبک ہو لو فرض سے
پھر ایک ساتھ نپٹیں گے جینے کے قرض سے

تم سے ہے میرا خانۂ افلاس مال دار　　تم سے خزاں میں بھی ہے چمن میرا پُر بہار
تم سے ہے رنگ و بو مرے پھولوں کا مستعار　　تم یورشِ جفا میں وفا کا ہو اعتبار
خوشبو و رنگ چھوڑتے ہیں جب خیامِ گل
رہ جاتی ہیں دریدہ قبائیں بنامِ گل

جینا ہے صرف اپنی خوشی کے لیے فضول　　وابستہ تم سے کنبے کی خوشیاں ہیں اے بتول
تم خوش نہیں حیات سے، دنیا سے ہو ملول　　سکھلاؤ جی کے بیٹیوں کو صبر کے اصول
گھر میں غریب کے کوئی راحت نہیں تمھیں
پر ایسے روٹھنے کی اجازت نہیں تمھیں

رو رو کے سیّدہؑ نے کہا، اے ابوالحسنؑ     میں اور روٹھوں آپ سے، کیوں ہے یہ سوئے ظن
غربت میں آپ کی ہے امیری کا بانکپن     ساتھ آپ کا ہے شاہیِ عالم شہِ زمن
بابا سے فخرِ فقر کا میں تاج لائی تھی
خود اختیار کرنے کو میں صبر آئی تھی

خود اختیار سے ہو غریبی تو راج ہے     مستغنی ہوں جہاں سے، یہی تخت و تاج ہے
حاجت روائی خلق کی حق کا مزاج ہے     اس سلطنت کا مرضیِ خالق خراج ہے
ہم راہی آپ کی تھی نہ شاہنشہی سے کم
ہر دولتِ زمانہ ہے اس ہمرہی سے کم

بچّوں کا میرے بعد ہے خالق نگاہ باں     بعدِ خدا ہیں آپ یتیموں کے حرزِ جاں
حسنینؑ پل کے آپ کے سائے میں ہوں جواں     ہوں مستفیض تربیتِ حق سے بیٹیاں
میری حیات کے بھی کریں قرض آپ ادا
میری طرف سے کیجیے گا سب فرض آپ ادا

اچھے گھروں میں لاڈلیوں کی ہوں شادیاں     سکھلا چکی ہے صبر کے انداز اُن کو ماں
حسنینؑ لائیں بیاہ کے گھر شاہزادیاں     سائے میں آپ کے رہے یہ کشت شادماں
سیدانیوں کے باغ گلوں سے بھرے رہیں
میرے لہو کے پودے ابد تک ہرے رہیں

ہم کو عطا ہوئی تھی یہی عمرِ مختصر     اس عمر ہی میں دیکھ لیے سارے خشک و تر
شاخِ مراد بھی ہوئی بچّوں سے بارور     لایا نہالِ دل بھی مصائب کے برگ و بر
صدموں کے ساتھ صبر بھی ہم کو عطا ہوا
حق شکرِ فضلِ رب کا نہ ہم سے ادا ہوا

جاتی میں کاش یاں سے سبکبار یا علیؑ     بچّوں میں رہتا دل نہ گرفتار یا علیؑ
رہیے ان الفتوں کے نگہدار یا علیؑ     لطف و کرم ہے بچّوں کو درکار یا علیؑ
گریہ گر اِن کا صبر و رضا کے خلاف ہو
نادان ہیں، خطائے یتیماں معاف ہو

کچھ روز ماں کو روئیں گے اطفالِ خردسال اُن کی طرف سے دل میں نہ آئے کبھی ملال
نانا کے لطف سے بھی ہیں محروم نونہال ان کی جگہ بھی آپ ہیں اے شیرِ ذوالجلال
زینبؑ کو دیکھتی ہوں تو دل کانپ جاتا ہے
نامِ حسینؑ لیتے ہی دل امڈا آتا ہے
میرا حسینؑ دشتِ بلا میں جو جائے گا پیاسا رہے گا زخموں پہ وہ زخم کھائے گا
عباسؑ کے فراق سے تن تھرتھرائے گا اکبرؑ کے غم سے ضعفِ بصارت میں آئے گا
زینبؑ اکیلی تھامے گی کس طرح بھائی کو
آپ آیئے گا بیٹے کی مشکل کشائی کو
میں تو رہوں گی ساتھ ہی چھوڑے گا جب وہ گھر ہر زخم دل میں رکھوں گی اس کا بچشمِ تر
آئے گا جب فرس سے زمیں پر مرا پسر گودی میں اپنے لوں گی میں لختِ جگر کا سر
لاشے پہ اس کے چادرِ تطہیر اُڑھاؤں گی
بہرِ مدد میں آپ کو اس دم بلاؤں گی
پامال ہو نہ لاشۂ فرزندِ مصطفیٰؐ چھینے نہ ظلم زینبؑ و کلثومؑ کی ردا
قیدی بنانے پائیں نہ عابدؑ کو اشقیا فوجِ جفا نہ لوٹ لے گھر میری آل کا
ہیں آپ کُل جہاں کے مددگار یا علیؑ
دردر پھرے نہ عترتِ اطہار یا علیؑ
بولے علیؑ کہ اے مری غم خوار صبر کر اے ورثہ دارِ کاشفِ اسرار صبر کر
ہے کربلا مقدّرِ احرار صبر کر قبلِ ستم ہو غم کا نہ اظہار، صبر کر
منظور تم کو مجھ سے جو رخصت ہے آج ہی
میرے لیے تو روزِ قیامت ہے آج ہی
آرام تم کو گھر میں علیؑ کے ملا نہیں لیکن تمھارا ظرف کہ شکوہ کیا نہیں
وہ کونسا ستم ہے جو تم پر ہوا نہیں پر آئینے میں دل کے کدورت ذرا نہیں
اب عذر کر کے مجھ سے نہ مجھ کو خجل کرو
ہاں مجھ سے جو خطائیں ہوئی ہیں، بحل کرو

زہراؑ نے ہاتھ ہاتھ میں حیدرؑ کا لے لیا آنکھوں سے مل کے چوم کے ہونٹوں سے یہ کہا
اس ہاتھ کی قسم، مجھے شکوہ نہیں ذرا جو عمر ساتھ گزری وہ حاصل ہے عمر کا
انعام ہمری سرِ محشر مجھے ملے
اس ہاتھ ہی سے ساغرِ کوثر مجھے ملے

بولے علیؑ، اگر ہو وصیّت کوئی، کہو فرقت زدہ کے حق میں بھی ارشاد کچھ کرو
شاید اسی طرح سے مداوائے ہجر ہو داغِ غمِ فراق کو نور اپنا بخش دو
زہراؑ نے دیکھا چہرۂ حیدرؑ کو ناز سے
پھر کچھ وصیتیں کیں دلِ بے نیاز سے

ملبوس وقتِ غسل نہ میرا ہٹائیے مجھ کو کفن عبائے نبیؐ کا پنھائیے
اوپر سے پھر خدیجہؑ کی چادر اُڑھائیے تابوت میرا پردۂ شب میں اٹھائیے
اک عمر تک اٹھاتے رہے میرے ناز آپ
میت پہ میری پڑھیے گا مولا نماز آپ

جب ڈھل چکے ہوں رات کے بھی ایک دو پہر ظلمات پردے ڈال دیں مردم کی چشم پر
تابوت اٹھایئے گا ردا اُس پہ ڈال کر کیا غیر، اپنوں کی بھی نہ مجھ پر پڑے نظر
اک غیر بھی جنازے پہ میرے نہ آنے پائے
تابوت کو بھی ہاتھ نہ کوئی لگانے پائے

تیرہ کی شب ہے، ہو گی بہت آج چاندنی میت کے ساتھ ہو نہ لحد پر ہو روشنی
یا شاہ! آرہا ہے قریں وقتِ جاں کنی تن میں کھٹک رہی ہے بہت جان کی انی
یہ وقت ہے خدائے جہاں سے نیاز کا
کرلوں ادا فریضہ آخر نماز کا

حجرے میں فاطمہؑ گئیں، مسجد میں مرتضیٰؑ حسنینؑ آئے گھر میں تو اسماء نے یوں کہا
شہزادو کھانا کھالو کہ ماں کی ہے یہ رضا حسنینؑ بولے، حکم ہے یہ آج کیوں نیا
ماں کے بغیر ہم نے نہ کھایا نہ سوئے ہیں
تنہا گئی ہیں گھر سے تو ہم پہروں روئے ہیں

حجرے میں پڑھ رہی تھیں مناجات فاطمہؑ اک بار بند ہوگئی تہلیل کی صدا
اسماء نے کھولا دوڑ کے در بیتِ حزن کا دیکھا کہ جسم سرد ہے اور دل رُکا ہوا
چلّا کے روئیں یوں کہ کلیجے دہل گئے
حجرے میں جانے کے لیے بچے مچل گئے

اسماء سے پوچھتے ہیں کہ کیوں پیٹتی ہو سر سونے دو سو رہی ہیں جو زہرا ئے نامور
کیا بات ہے جو آتا نہیں کچھ ہمیں نظر بے اختیار آنکھیں ہوئی جارہی ہیں تر
اسماء کی چپ سے لفظ لبوں میں سمٹ گئے
اطفال دوڑ دوڑ کے ماں سے لپٹ گئے

جب دیکھا دل دھڑکتا نہیں، سرد ہے بدن گھبرا کے یہ حسینؑ سے کہنے لگے حسنؑ
اب تک تو جب رہا تھا حرارت سے ان کا تن کیا بات ہے جو سرد ہوا جسم دفعتاً
بابا کو دو خبر کہ وہ آ کے دوا کریں
جب تک وہ آئیں ماں کے لیے ہم دعا کریں

ہاتھ اُٹھے یاں حسینؑ و حسنؑ کے پئے دُعا کلثومؑ و زینبؑ آگئیں روتی برہنہ پا
چاروں نے اپنے حلقے میں مادر کو لے لیا رُو رُو کے ربِّ راحم و غفار سے کہا
یارب نہ چھین بچوں سے بنتِ رسولؐ کو
صحت کے ساتھ عمرِ خضرؑ دے بتولؑ کو

یارب! ہمارے جینے کی صورت ہے ماں کے ساتھ عیش و نعم ہیں، فرحت و راحت ہے ماں کے ساتھ
دنیائے بے اماں میں مسرت ہے ماں کے ساتھ دولت ہے، سلطنت ہے، حکومت ہے ماں کے ساتھ
یہ سلطنت نہ چھین، نہ ہم کو غریب کر
سوگِ رسولِ مصطفیٰ ہمیں روشن نصیب کر

مسجد سے آ کے سنتے کھڑے تھے علیؑ دعا بند آنسوؤں پہ باندھ کے آہستہ سے کہا
اے بیٹو اب فضول ہے ہر عرض و التجا اے بیٹیو نہ روؤ، جو ہونا تھا ہو چکا
ہم جس سے تھے امیر وہ دولت نہیں رہی
دنیا میں شاہزادیِ جنت نہیں رہی

حسرت سے دیکھا بچوں نے چہرے کو باپ کے     آئی سمجھ میں بات تو غش کھا کے گر پڑے
غش سے اٹھے تو بہنوں سے بھائی لپٹ گئے     آنسو ٹپک رہے تھے یتیمی کی آنکھ سے

عترت پہ مصطفیٰؐ کی قیامت کا وقت تھا
مشکل کشا پہ سخت مصیبت کا وقت تھا

بولے علیؑ کہ اے مری غم خوار الوداع     اے نورِ چشمِ سیدِ ابرار الوداع
اے میرے گھر کی مالک و مختار الوداع     غم آشنائے بے کس و بے یار الوداع

صحرائے ہجر، غم کا سمندر ہے سامنے
تنہا علیؑ ہے، ظلم کا لشکر ہے سامنے

لرزہ تھا گھر میں ضبطِ شہِ مشرقین سے     تھرّا رہا تھا عرش فغانِ حسینؑ سے
کہرام قدسیوں میں تھا زینبؑ کے بین سے     کس طرح روحِ فاطمہؑ بھی سوتی چین سے

پھیلا کے ہاتھ گود میں سب کو اٹھا لیا
بچوں کو فاطمہؑ نے گلے سے لگا لیا

امت نے کیسے لوٹی ریاضت بتولؑ کی     برباد کس طرح ہوئی دولت بتولؑ کی
خوشیوں کے پھل نہ لائی مشقت بتولؑ کی     خاک اور خوں میں مل گئی محنت بتولؑ کی

لختِ دلِ حسنؑ ہوئے مقتولِ زہرِ غم
خونِ حسینؑ بن گیا دریائے شہرِ غم

بعدِ علیؑ حسنؑ سے خلافت نے کی دغا     صلحِ حسنؑ نے جھوٹ کا منھ بند کر دیا
بے مُلک ہو کے مُلکِ سخاوت کو لے لیا     ان کی سخا کے سامنے شاہی کا سر جھکا

سائل کو مال کیا ہے، خلافت بھی بخش دی
طبل و علم بھی بخشا، حکومت بھی بخش دی

نورِ امامِ شام کی ظلمت پہ تھا گراں     آب و غذا سے سازشیں کرتی تھیں تلخیاں
مقتولِ جامِ زہر ہوئے سیدِ جناں     بارانِ تیر سے ہوا تابوت ضو فشاں

غاصب نے دی جگہ نہ جوارِ رسولؐ میں
آخر کو سوئے پہلوئے قبرِ بتولؑ میں

لے دے کے پنجتن میں تھی اب صرف ایک ذات  وہ ذات جس کا جزو تھا مجموعۂ صفات
مجموعۂ صفات تھا تلخیصِ کائنات  تلخیصِ کائنات کا عنوان تھی نجات
شر کو تھا ڈر نجاتِ ہمہ کائنات سے
کد ظلم کو تھی ذاتِ سراپا صفات سے

بربادیٔ حسینؑ کے ساماں ہوئے بہم  اک نقطے پر سمٹ گئے اسبابِ درد و غم
زہراؑ کے لختِ دل پہ ہوا نرغۂ ستم  شاخیں نہالِ فاطمہؑ کی ہوگئیں قلم
نازاں تھا جس پہ حق وہ سپاہی نہیں رہے
وہ مرد جن سے ڈرتی تھی شاہی، نہیں رہے

مقتل کی نذر ہوگیا لشکر حسینؑ کا  بیٹا رہا نہ کوئی برادر حسینؑ کا
دستِ اجل نے لوٹا بھرا گھر حسینؑ کا  ہونے کو فدیہ رہ گیا اک سر حسینؑ کا
زینبؑ پکارتی رہی، بھائی کو چھوڑ دے
اے شمر! فاطمہؑ کی کمائی کو چھوڑ دے

مادر کا فرض بنتِ نبیؐ نے ادا کیا  چادر کو اپنی ریگِ تپاں پر بچھا دیا
کٹتے گلے کو زانو پہ اپنے اٹھا لیا  بیٹے کا وقتِ ذبح پڑھا پہلا مرثیہ
اصغرؑ کی لاش دل سے لگائے ہوئے رہیں
ہر ظلم میں سکینہؑ کو تھامے ہوئے رہیں

سر کی ردائیں لے گئی جب فوجِ اشقیا  سیدانیوں پہ سایۂ نور برسا کیا
زینبؑ کا ساتھ گیارھویں کی شب کو یوں دیا  جو اشک ٹپکا اپنی مژہ پر اٹھا لیا
آئے علیؑ جو بیٹی کی مشکل کشائی کو
زہراؑ نے دیکھا صدق کی وعدہ وفائی کو

زینبؑ نے کی شمار جو دولت حسینؑ کی  دیکھا ہے گم یتیم شہِ مشرقین کی
کی جستجو ہر ایک طرف نورِ عین کی  مقتل سے آرہی تھی صدا شور و شین کی
نعشِ پسر کے پہلو میں زہراؑ دکھائی دیں
دادی کے زیرِ سایہ سکینہؑ دکھائی دیں

چھوڑا جو کاروانِ محمدؐ نے کربلا ہمراہ تھیں سفر میں اسیروں کے فاطمہؑ
گر کوئی طفل بھاگتے ناقے سے گر پڑا زہراؑ نے اپنی گود میں اس کو اٹھا لیا
سایہ فگن سروں پہ ردائے بتولؑ تھی
روشن شبوں کو شمعِ صدائے بتولؑ تھی

بڑھتا رہا قدم بہ قدم کاروانِ غم طے کر رہی تھی اشکوں کے صحرا فغانِ غم
کرتی تھی قطع جادۂ آلام جانِ غم بالا تھی جشنِ عیش و مسرت سے شانِ غم
ناقوں پہ آل، نیزوں پہ تھے سر بلند سرؑ
پستی میں فوج، عرش پہ تھے ارجمند سرؑ

کوفے کی ہر گلی میں تھا انبوہِ اہلِ کیں ہر گھر تماشا گاہ تھا، ہر در تماش بیں
استادہ بام پر تھے تماشے کو نازنیں عبرت کی آنکھیں خوفِ تماشا سے بند تھیں
آخر درودِ قافلۂ اہلِ ابتلا ہوا
کوفے میں وارد ابنِ شہِ لافتیٰ ہوا

بالائے بام بیٹھی تھی اک بی بی ڈھانپے سر تھیں گرد باندیاں کہ نہ اس پر پڑے نظر
اس صاحبِ حشم کو تھا بے پردگی کا ڈر تھا حکم ایستادہ نہ ہوں مرد بام پر
رطب اللساں تھی مدحِ شہِ انس و جاں میں وہ
شبیرؑ آنے والے ہیں، تھی اس گماں میں وہ

اتنے میں شور آیا قریں، گونجے قہقہے بت بے حسی کے بیچ سے رستے کے ہٹ گئے
بالائے بام بیٹھے تھے جو، اٹھ کھڑے ہوئے آوازیں دب گئیں دف و قرنا کے شور سے
ماہی مراتب ابھرے، علم آئے سامنے
خود و زرہ میں اہلِ ستم آئے سامنے

پیچھے نشاں کے نیزوں پہ ہیں کچھ بریدہ سر غلطاں بخاک چہروں پہ ہے نور جلوہ گر
لب خشک، آنکھیں بند، جبینیں لہو میں تر کچھ اس قدر حسیں کہ لگے زندوں کی نظر
ہے درمیاں میں سر کسی عزت مآب کا
جیسے گھرا ہو تاروں میں پھول آفتاب کا

ابر و ہلال، ماتھا فلک، آنکھیں ماہتاب بینی بلند، گوش ہیں گل، ہونٹ ہیں خوش آب
واللیل زلفیں، چہرہ ہے والفجر کی کتاب رخسار لالہ رنگ، ذقن دستۂ گلاب
چھینٹوں سے خوں کے ریشِ مطہر خضاب ہے
گردن ہے یا کہ شاخِ گلِ آفتاب ہے

بی بی نے دیکھا ہو کے پریشاں اِدھر اُدھر بولی کنیزوں سے کہ ٹھہرتی نہیں نظر
یہ آدمی کا سر ہے کہ نورِ خدا کا سرَ مارا ہے ظالموں نے کسے کچھ تو دو خبر
اس سر کے گرد سر نہیں انوار ہیں تمام
لگتا ہے انبیا کے یہ آثار ہیں تمام

بولیں کنیزیں سنتے ہیں باغی تھے یہ تمام یہ چاہتے تھے ملکِ عراق اور تختِ شام
حاکم کا ان کے دل میں نہ تھا کچھ بھی احترام سردار اِن کا کہتا تھا، میں حق کا ہوں امام
اس کے جواں خلیفہ سے لڑنے کو آئے تھے
یثرب سے کربلا میں اجڑنے کو آئے تھے

بولی جو ہو سو ہو، یہ ہے کس حُسن کی نمود نیزے پہ سر نہیں ہے یہ، ہے صبح کا ورود
ایسا جوان دیکھے گی کب چشمِ ہست و بود دیکھوں اِدھر تو پڑھتی ہے جیسے نظر درود
دل کہہ رہا ہے پھول یہ باغِ علیؑ کا ہے
میرے دہن میں خاک، یہ چہرہ نبیؐ کا ہے

اور اس بلند نیزے پہ دیکھو خدا کی شان کیا طنطنہ ہے، رعب ہے کیا، کیسی آن بان
یہ سر ہے یا کہ فوجِ صداقت کا ہے نشان چہرہ وفا کا نور، شجاعت کا ہے جہان
لگتا ہے یوں کہ دوش پہ ہے آج بھی علَم
کھولے ہوئے نہ سر پہ ہوں اس کے علیؑ علَم

اس سبز نیزے پر ہے جو سر، ہوگا گلبدن پھولوں میں ہے بسی ہوئی زلفوں کی ہر شکن
کانوں کے پاس سہرے کی لڑیاں ہیں ضوفگن ہے ہے خدا نہ کردہ ہو یہ صورتِ حسنؑ
کرنیں ہیں گرد یا کہ دعائیں دلہن کی ہیں
آنکھوں میں بند شاید ادائیں دلہن کی ہیں

یہ کہتے کہتے چیخ کے بولی وہ حق شناس          اے بی بیو! وہ ننھا سا نیزہ ہے عرش اساس
اک شیرخوار، آنکھوں لبوں میں ہے کیسی پیاس          آغشتہ ہے لہو میں یہ کس ماں کے دل کی آس
پھولوں کے درمیان یہ غنچہ کھلا ہے کیوں
کھیتی میں سورجوں کی یہ تارا اُگا ہے کیوں

وہ دیکھو ساتھ ساتھ ہیں دو نیزوں پر دو سر          جیسے کہ اب بھی دیکھتے ہوں سوئے یک دگر
چہروں پہ ہے تہور و غیرت کا کیا اثر          کم سن ہیں پر غضب کے ہیں تیور، عجب نظر
جعفر کا دبدبہ ہے یہ، تیور علیؑ کے ہیں
کس منھ سے میں کہوں کہ یہ دلبر علیؑ کے ہیں

نیزوں پہ نور اُٹھائے ہوئے ہے سپاہِ شام          ہر سر کو مومنہ کی نظر کرتی ہے سلام
کہتا ہے دل انھی کی زیارت کرو مدام          بولی مصاحبوں سے، میں کہتی ہوں لاکلام
یہ سب جواہر ایک ہی کانِ شرف کے ہیں
کچھ لعل ہیں مدینے کے، کچھ دُرِ نجف کے ہیں

یہ کہتے کہتے جھک کے اٹھی جو نگاہِ زار          دیکھا سروں کے پیچھے ہے اونٹوں کی اک قطار
بے سایہ ہیں کجاوے تو ناقے ہیں بے مہار          کچھ پر ہے مال لوٹ کا اور کچھ پہ ہیں سوار
اونٹوں کے ساتھ بھاگتا ہے اک نحیف و زار
چہرہ مریض، پاؤں برہنہ، ضعیف و زار

مڑ کر کہا کہ دیکھو ہے یہ ظلم بھی عجیب          پہنے ہوئے ہے بیڑیاں پیروں میں بدنصیب
پھر بھی یہ حکم ہے کہ نہ ٹھہرے کہیں غریب          دیکھو وہ تھک کے ٹھہرا، وہ آیا کوئی قریب
ہے ہے یہ کیا غضب ہے کہ دُرّے لگاتے ہیں
دوبھر ہے جس کو چلنا بھی، اس کو بھگاتے ہیں

گردن سے اپنا طوق نکالے تو وہ چلے          زنجیریں ہتھکڑی سے سنبھالے تو وہ چلے
دیں راہ اُس کو چلنے کی بھالے تو وہ چلے          یہ ظالم اپنا دُرّہ ہٹالے تو وہ چلے
تلووں میں چبھتے ہوں گے بہت خار، کیا چلے
پرسش ہو اشکوں سے تو بیمار کیا چلے

نیزے بھی، برچھیاں بھی، تبر بھی ہیں بھالے بھی　　تیر و کمان والے بھی، تلوار والے بھی
گھوڑا سوار فوج بھی، پیدل رسالے بھی　　دستے حبش کے بھی ہیں، عرب کے جیالے بھی
ہیں اتنی فوجیں اک اسی بیمار کے لیے
اتنے ستم ہیں ایک تن زار کے لیے

ناقوں پہ سر برہنہ یہ کون ارجمند ہیں　　کچھ عورتیں ہیں غم زدہ، اطفال چند ہیں
بالوں سے منہ ڈھکے ہوئے ہیں، آنکھیں بند ہیں　　تیور یہ ہیں کہ گر کے بھی سب سے بلند ہیں
شور و شر ہجوم سے آنکھیں بچائے ہیں
شرما کے بچے گودیوں میں منہ چھپائے ہیں

بڑھتا گیا ہجوم، ہوا بند راستہ　　رستا رکا تو فوج رکی، قافلہ رکا
اک ناقہ چلتے چلتے وہیں پر ٹھہر گیا　　تین آفتاب اس میں تھے، اک ماہ زاد تھا
چہرے نہاں تھے زلفوں میں، زلفیں غبار میں
دل اختیار میں تھے نہ اشک اختیار میں

کوزہ دکھا کے ننھا سا مہ زاد نے کہا　　اے بی بی! کوئی پانی پلا دے ہمیں ذرا
چھڑکاؤ راستوں پہ تو ہوتا ہے جا بجا　　اک قطرہ ہم کو دینے سے رکتے ہیں اشقیا
پاکر اشارہ بی بی کا، اک باندی آب لائی
اور اک طعامِ گرم سے لبریز قاب لائی

لڑکی نے دیکھا اپنے بزرگوں کو گھوم کر　　پھر خود ہی بولی بی بیوں سے پھیر کر نظر
دو گھونٹ پانی پی لیں تو ہوجائے حلق تر　　خواہش نہیں غذا کی ہمیں اے نکو پسر
بی بی پکاری، آپ کے قربان جایئے
چکھ لیجیے طعام، مری مان جایئے

زلفیں ہٹا کے ایک خوزادی نے یہ کہا　　پانی اسے پلادو تو دے گا خدا جزا
گذریں جو تین روز بھی بے آب و بے غذا　　خیرات صدقہ لیتی نہیں آلِ مصطفیٰ
گھبرا کے بولی مومنہ یہ کیا کلام ہے
خیرات ہے نہ صدقہ، یہ نذرِ امام ہے

پھر ایک بار چونک کے پوچھا یہ کیا کہا — کچھ آپ نے کیا تھا ابھی ذکرِ مصطفیؐ
کیا رشتہ آلِ پاک سے ہے کچھ جناب کا — بولی خوزادی، دور کا ہے اُن سے واسطا
ہم تو اسیر و بے وطن و بے نقاب ہیں
وہ آسماں جناب رسالت مآبؐ ہیں

وہ بولی صاف صاف کہیں آپ اپنا حال — آج آرہے ہیں بندی کے دل میں عجب خیال
نیزوں پہ جب سے دیکھے ہیں سر، ہے بہت ملال — زنجیر بستہ دوڑتا ہے کون خوش خصال
ہو حال اگر امام کا معلوم، کچھ کہو
کس حال میں ہیں زینبؑ و کلثومؑ کچھ کہو

بولی خوزادی اُن سے تعلق تمھیں ہے کیا — وہ بولی میں ہوں ذرۂ دہلیزِ فاطمہؑ
کلثومؑ کی کھلائی ہوں، زینبؑ کی خادمہ — کہتی تھی مجھ کو اپنی کنیز آلِ مصطفیؐ
ان کے طفیل دین بھی دولت بھی پائی ہے
جو دیکھتی ہیں آپ، وہ حشمت بھی پائی ہے

اُمِّ حبیبہ کہتی تھیں لونڈی کو فاطمہؑ — اترا تھا ایک شب مرے گھر نورِ کبریا
میں مرگئی تو جینے کا حکم اُن سے ہے ملا — پائی حیاتِ تازہ بھی، ایماں بھی مل گیا
ظلمت نصیب تھی، مری قسمت سنور گئی
عقبیٰ چمک گیا، مری دنیا نکھر گئی

واصل بحق ہوئیں وہ، مرے دن پلٹ گئے — اوراق ماہ و سال کے کتنے اُلٹ گئے
عشاقِ آل سیکڑوں شہروں میں بٹ گئے — کوفے میں آکے سلسلے ماضی سے کٹ گئے
مولائے کائنات ہی سے پھر شرف ملا
کوفے کو چند سال عروجِ نجف ملا

مولا جو آئے، آئیں یہاں شاہزادیاں — لوٹ آئیں اِس کنیز کے گھر شادمانیاں
خدمت میں اُن کے جاتی تھیں ہر دن جو باندیاں — حاصل تھا امتیاز مجھے اُن کے درمیاں
سب کہتے تھے مصاحبِ زہراؑ رہی ہے یہ
دی تھی انھوں نے جاں جسے، بندی وہی ہے یہ

آقا ہوئے شہید تو کوفہ ہوا تباہ غدار شہر میں نہ حسنؑ کو ملی پناہ
پھر جا بسے مدینے میں عترت کے مہر و ماہ مدّت سے تک رہی ہوں میں شہزادیوں کی راہ
شہرت یہ ہے حسینؑ ہدایت کو آئیں گے
دعوت پہ اہلِ کوفہ کی تشریف لائیں گے

میں روز میہمانی کا کرتی ہوں اہتمام آبِ خنک بھی رکھتی ہوں، پکواتی ہوں طعام
کرتی ہوں روز فرش کا، مسند کا انتظام شور آج صبح سے تھا کہ آنے کو ہیں امام
بیٹھی تھی یہ امید لیے آکے بام پہ
جاؤں گی صدقے آج ضیائے امام پہ

لیکن یہ کیا تماشا ہے آتے نہیں ہیں شاہ فوجوں نے چار سمت سے کردی ہے بند راہ
کچھ سر دکھائی دیتے ہیں مانندِ مہر و ماہ کچھ بی بیاں ہیں ناقوں پہ، بچے ہیں کچھ تباہ
دل دہلا جارہا ہے کہ یہ ماجرا ہے کیا
اے بی بیو! بتاؤ کہ تم نے سُنا ہے کیا

اب دوسری خوزادی نے رُخ سے ہٹائے بال اس مومنہ کے چہرے کو دیکھا بصد ملال
فرمایا تو نے دیکھ لیا ہے ہمارا حال چہرے ہمارے غور سے دیکھ اے محبِّ آل
شاید تجھے شباہتِ زہراؑ دکھائی دے
زینبؑ کا بھی یہیں کہیں چہرہ دکھائی دے

اُمِ حبیبہ چیخ اٹھی، شاہ زادیو! آیا یقیں کہ زینبؑ و کلثومؑ تم ہی ہو
قربان ہو کنیز کچھ احوال تو کہو کس طرح پہنچیں بی بیاں اِس حالِ زار کو
ہے خیر تو امامِ زماں خیریت سے ہیں
کہہ دو حسینؑ ابن علیؑ عافیت سے ہیں

زینبؑ نے سر جھکا کے کہا کیسی خیریت فرزندِ مصطفیؐ نے کہاں پائی عافیت
خاک اور خوں میں مل گئی زہراؑ کی ذرّیت ہوتے اگر حسینؑ تو چھنتی نہ حرّیت
سر قطع کر کے ان کا سناں پر چڑھا لیا
بے وارثوں کو ظلم نے قیدی بنا لیا

عباسؑ پانی لانے گئے تھے، نہ آسکے　　قاسمؑ نہ اکبرؑ اپنی جراحت دکھا سکے
پامال لاشیں ہوگئیں، ہم کر ہی کیا سکے　　نے دفن کر سکے نہ کفن ہی پنھا سکے
یہ پیاسی ہے یتیم شہِ مشرقین کی
یہ سر برہنہ بیٹھی ہیں بانو حسینؑ کی

چادر کو سر سے پھینک کے چلائی مومنہ　　شہزادیاں برہنہ سر اور اوڑھوں میں ردا
بولی کنیزوں سے کہ میں کہتی تھی تم سے کیا　　نیزوں پہ سر بریدہ ہے کنبہ رسولؐ کا
ہے ہے ہماری بی بی کا کنبہ اُجڑ گیا
شہزادیوں سے شاہ سفر میں بچھڑ گیا

زینبؑ نے غم زدہ سے کیا رُو کے یہ کلام　　پہچانا تو نے کیوں نہیں اے عاشقِ امام
ٹھہرا تھا سر امام کا آ کر قریبِ بام　　آئے تھے کرنے ماں کی مصاحب کو وہ سلام
اک شب تو میزبان بنی تھی بتولؑ کی
مہمانی تیری سبطِ نبیؐ نے قبول کی

وہ بولی جان و دل مرے صدقے امام پر　　ساتھ ان کے کون نور کے پارے ہیں جلوہ گر
کلثومؑ نے کہا کہ عزیزوں کے سب ہیں سر　　دو سر جو ساتھ ساتھ تھے زینبؑ کے ہیں پسر
عباسؑ بھی جلو میں ہیں، اکبرؑ بھی ساتھ ہیں
قاسمؑ بھی چھوٹے نیزے پہ اصغرؑ بھی ساتھ ہیں

بچّوں کے ساتھ پیاسے رہے تین روز بھائی　　قاسمؑ کو سہرا بھایا نہ شادی ہی راس آئی
پیاسوں کے خوں سے سرخ ہوئی نہر کی ترائی　　اصغرؑ کی پیاس زہر لب تیر نے بجھائی
آیا جو وقتِ عصر نبیؐ کا شجر کٹا
سجدے میں تھے حسینؑ تو خنجر سے سر کٹا

آئی قیامت، آگ لگی، جل گئے خیام　　بے پردہ ہوگئے ورثائے کسا تمام
عارض ہوئے سکینہؑ کے سیلی سے لالہ فام　　عابدؑ کو حکمِ قید ملا بخشے ہی امام
کوفہ بھرا ہے فاتحِ بدر و حنین سے
زنجیریں بات کرتی ہیں ابنِ حسینؑ سے

اُمِّ حبیبہ بولی یہ کیا انقلاب ہے؟ کوفے میں ننگے پاؤں بنِ بوترابؑ ہے
زنجیر میں وصی رسالت مآبؑ ہے سچ کہتے ہیں کہ دہر سراسر سراب ہے
محتاجِ قبر لاشۂ سلطانِ دیں رہے
ملکِ خدا یزید کے زیرِ نگیں رہے
زینبؑ یہ بولیں رونے کو اک عمر ہے پڑی ہے مختصر بہت یہ ملاقات کی گھڑی
آگے کی منزلیں ہیں ابھی اور بھی کڑی حسرت کی پھانس کیوں ترے دل میں رہے اڑی
مہمانی کے ہیں جتنے بھی اسباب کر بہم
پھر ہوں گے تیرے گھر نہ شہیدوں کے سر بہم
اے نیک بخت آئے ہیں سب تیرے میہمان کر اہتمامِ فاتحہ، کھانوں سے بھر دے خوان
کوزے بھی آبِ سرد سے پُر ہوں، رہے یہ دھیان قرآن پڑھ کے نذر دے، قرآں کی ہیں یہ جان
ہفتم سے آج تک ہے گرسنہ نبیؐ کی آل
پانی کی کر سبیل، ہے تشنہ نبیؐ کی آل
جلدی سے فاتحہ کا کیا اس نے اہتمام لائیں کنیزیں سر پہ اٹھائے ہوئے طعام
بچّوں کو اپنے ہاتھ سے دیتی تھی بھر کے جام آبِ خنک پہ گرتے تھے اطفالِ تشنہ کام
روتی تھی بار بار وہ منہ ڈھانپ ڈھانپ کر
سنتی تھی کربلا کا بیاں کانپ کانپ کر
زینبؑ نے آخر اُمِّ حبیبہ سے یہ کہا ہے تجھ سے بنتِ فاطمہؑ کی ایک التجا
دے دے رسول زادیوں کو ایک اک ردا اس خیر کے عوض ترا پردہ رکھے خدا
خود اس نے دوڑ دوڑ کے سب کو ردائیں دیں
سیدانیوں نے ڈھانپ لیے سر، دعائیں دیں
اتنے میں غل مچاتے بڑھے دشمنانِ دیں نیزوں پہ آگے آگے سروں کی صفیں بڑھیں
بے اختیار ناقوں پہ سیدانیاں چلیں پھر سے ردائیں نیزوں کی نوکوں نے چھین لیں
زینبؑ نے دیکھا مومنہ کو مڑ کے یاس سے
رو رو کے اس نے فوج کو دیکھا ہراس سے

اُمّ حبیبہ بولی بصد آہ، الوداع    اے میرے شاہزادو، مرے شاہ الوداع
اے شاہزادیانِ فلک جاہ الوداع    حافظ رہے اسیروں کا اللہ الوداع
مہمان سب چلے گئے غم خوار رہ گئی
معروف گریہ تشنۂ دیدار رہ گئی

کوفے سے شام تک گئی عترت بتولؑ کی    درباروں میں طلب ہوئی بضعت بتولؑ کی
ہرجا تھی سر پہ چادرِ عصمت بتولؑ کی    ہے اہلِ عصمت آج بھی اُمّت بتولؑ کی
شہزادیاں ہیں اب بھی کنیزانِ فاطمہؑ
محشر تلک وسیع ہے دامانِ فاطمہؑ

گھر عاشقانِ آل کے آتی ہیں فاطمہؑ    اُن کی خوشی یہی ہے کہ ہو مجلسِ عزا
وہ جانتی ہیں اشکِ عزادار کی بہا    رومال اُن کا پائے گا ہر دیدۂ ولا
گوہر غمِ حسینؑ کے چنتی ہیں فاطمہؑ
ذکرِ حسینؑ ہو کہیں سنتی ہیں فاطمہؑ

# بارگہِ لوح و قلم

(بیانِ فضائلِ قلم و سفرِ اہلبیت و واپسیِ اہلِ حرم)

پھر اے قلمِ قدرتِ اظہار رواں ہو    اے اشہبِ فکرِ فلک آثار رواں ہو
اے ابرِ خیالات گہربار رواں ہو    اے موجِ صدا، کشتیِ افکار رواں ہو
تو ٹھہرے تو تخئیل کے شہپر نہیں کھلتے
جب تک نہ چلے، تیغ کے جوہر نہیں کھلتے

یہ سچ ہے کہ رکھتا ہوں میں لب اور دہاں بھی    فیضِ سخنِ صدق سے ناطق ہے زباں بھی
سرچشمۂ تخلیق نے دی طبعِ رواں بھی    خلاقِ حقیقی سے ملی فکرِ جواں بھی
یہ ساری عطائیں تھیں گرفتاری کے اسباب
بے کار قلم بنتے یہ بیکاری کے اسباب

لب اور دہاں کرتے فقط تلخ نوائی    طلاق زباں کرتی سدا ہرزہ سرائی
یہ طبعِ رواں بنتی غمِ آبلہ پائی    پاتی نہ کبھی فکر بھٹکنے سے رہائی
تنہائی کے محبس میں بسر کر گیا ہوتا
ملتا نہ اگر مجھ کو قلم، مر گیا ہوتا

بچپن سے بر سے ہاتھ پہ سایہ ہے قلم کا
جب پائی زباں، ذوق بھی پایا ہے قلم کا
راس آیا کوئی ساتھ تو آیا ہے قلم کا
جو رزق بھی کھایا ہے، وہ کھایا ہے قلم کا
منصب ہو کہ شہرت ہو، کمائی ہے قلم نے
سادات کی عزت بھی بچائی ہے قلم نے

سادات کے شجروں کے وَرَق کھا گئی دیمک
نازِ نسب و نسل ہے بازیچۂ کودک
نسبت شہِ لولاک سے پاکیزہ ہے بے شک
پر نام کی نسبت کو جہاں مانے گا کب تک
میں بے قلم آلِ شہِ ابرار نہ ہوتا
اس نسبتِ عالی کا سزاوار نہ ہوتا

وہ عالمِ اُمّی لقب، وہ اعلَمِ اسرار
ہیں اہلِ صُحُف اُس کی ہدایت کے طلبگار
ہیں جتنے رسول، اہلِ کتاب، اُن کا وہ سردار
ہے اُس کا قلم لوحِ الٰہی کا بھی مختار
ہر علم ہے نہر اُس کے ہی دریائے کرم کی
قرآں نے بھی کھائی ہے قسم اُس کے قلم کی

قربان اُس اُمّی پہ جہاں کے علما ہیں
شاگرد اُس اُمّی کے ہیں جتنے عُرَفا ہیں
صدقے میں اُس اُمّی کے زباں داں شعرا ہیں
طلاب اُس اُمّی کے رسولانِ خدا ہیں
جس گھر کو ملا درس اُس اُمّی کی زباں سے
جبریل سبق لیتے ہیں قرآں کا وہاں سے

کافر ہے وہ، جو اُس کے قلم کا نہیں قائل
ہرزہ ہے کلامِ شعرا اُس کے مقابل
تلمیذ نہیں اُس کا تو عالم بھی ہے جاہل
درس اُس سے نہ لے علم تو ہے زہرِ ہلاہل
وہ شہر ہے اہلِ قلم، اربابِ شرف کا
معدن ہے وہی گوہرِ یکتائے نجف کا

وہ صاحبِ علم و قلم و لوحِ مشیت
حاصل ہو بہت دور کی بھی اُس سے جو نسبت
مِل جاتے ہیں علم و نظر و ذہن و بصیرت
لب اور قلم پاتے ہیں اظہار کی قدرت
میں اہلِ قلم ہوں تو عنایت ہے اُسی کی
کچھ علم جو پایا تو ودیعت ہے اُسی کی

کس مُنہ سے قلم لکھے کہ نسبت ہے نبیؐ سے　　مُجھ تلخ بیاں کو بھی عقیدت ہے نبیؐ سے
اِس تُرش زباں میں جو حلاوت ہے نبیؐ سے　　عصیاں کو جو اُمّیدِ شفاعت ہے نبیؐ سے
گر شہپرِ جبریل کا سایہ ہے قلم پر
یہ رنگ اِسی نسبت سے تو آیا ہے قلم پر

کرتی ہے ذلیل آمروں، سلطانوں کی نسبت　　کشکولِ گدا بنتی ہے دھن والوں کی نسبت
کام آتی نہیں خاک جہاں بانوں کی نسبت　　ہے پست بہت اونچے شبستانوں کی نسبت
صرف ایک ہی نسبت میں نجاتِ ابدی ہے
نسبت ہی محمدؐ کی حیاتِ ابدی ہے

ہے ناز کے شایاں شہہِ لولاک سے نسبت　　ہے تاجِ حکومت قدمِ پاک سے نسبت
ذرات کو مِل جاتی ہے افلاک سے نسبت　　معراج ہے نعلین کی بھی خاک سے نسبت
سیّد ہوں کہ میں اُن کے غلاموں کا ہوں مدّاح
ممدوحِ جہاں ہوں کہ اماموں کا ہوں مدّاح

اے افصحِ کونین! وضاحت ترا صدقہ　　اے صاحبِ قران! بلاغت ترا صدقہ
اے باعثِ تخلیق! ذہانت ترا صدقہ　　اے دُرِّ یتیم! اوجِ نجابت ترا صدقہ
ہے صید ترے سامنے شہبازِ تخیّل
نعلین تری غایتِ پروازِ تخیّل

نسبت تری ثابت قدی پائے قلم کی　　رحمت تری جودت لبِ گویائے قلم کی
بخشش تری ضَو دیدۂ بینائے قلم کی　　پرتَو ترا تابش یدِ بیضائے قلم کی
نورِ ازلی رب نے کہا تیرے قلم کو
ہو اِک رمَقِ نور عطا میرے قلم کو

لکھے ہیں سرِ عرش قلم نے ترے اسما　　جن کے لیے سجدے میں جُھکے آدم و حوّا
راز اُن کے معانی کا ملائک نے نہ پایا　　تحریر تھی تیری، جسے کرتے رہے سجدا
اِک بُوند ہے عرفاں ترے دریائے قلم کی
ہیں سارے نبی گرد ترے پائے قلم کی

کہتے ہیں وحی جس کو قلم کا ہے اُترنا　　عنوانِ نزولِ قلمِ حق ہے خود 'اِقرا'
کھاتا ہے قلم کی قسم آغاز وحی کا　　مستور و عیاں جو ہے قلم کا ہے تماشا
لا علم جہاں رہتا خداوندِ جہاں سے
پردہ نہ اُٹھاتا جو قلم کنزِ نہاں سے

خود ناطقِ مطلق کا تکلّم ہے قلم سے　　کُن میں ہے جو خلّاق تحکّم ہے قلم سے
افلاک میں نغموں کا ترنّم ہے قلم سے　　بنّی میں گُل آثار تبسّم ہے قلم سے
پھونکے نہ قلم روح تو اصوات ہیں فانی
گر قُم نہ کہے خامہ تو نغمات ہیں فانی

گُل کھلتے ہیں انگاروں میں فیضانِ قلم سے　　تلواریں نگوں ہوتی ہیں فرمانِ قلم سے
دنیائیں بدل جاتی ہیں اعلانِ قلم سے　　ہیں سلطنتیں لرزے میں طوفانِ قلم سے
اِک جنبشِ خامہ سے پلٹ جاتی ہے دنیا
اِک حرف کے دامن میں سمٹ جاتی ہے دنیا

قدرت ہو قلم پر تو جہاں زیرِ نگیں ہو　　عالم ہے وہیں، لفظ جہاں گوشہ نشیں ہو
راتیں چمک اُٹھتی ہیں، منور یہ کہیں ہو　　ٹھہرے جو قلم، سرد ستاروں کی جبیں ہو
ہر بوند گراں اس کی شہیدوں کے لہو سے
یہ لکھتا ہے تاریخ یزیدوں کے لہو سے

سائنس، ادب، فلسفہ و علمِ معیشت　　جغرافیہ و علمِ مدن، کیمیا، ہیئت
ہو علمِ طبیعی و حیاتی کہ طبابت　　دنیا کی ہو تحقیق کہ عقبیٰ کی ہدایت
ہر علم و فن و درک ہے ممنون قلم کا
تہذیب کے تن میں ہے رواں خون قلم کا

نغموں کی مسیحائی ہو یا رقص کا آہنگ　　تعمیر کی جدّت ہو کہ تصویر کے ہوں رنگ
جذبات نگاری ہو کہ صورت گریِ سنگ　　آدابِ تکلّم ہوں، تدبر ہو کہ ہو جنگ
قانون ہر اِک فن کو سکھایا ہے قلم نے
ہر جادہ ترقّی کا بنایا ہے قلم نے

ماضی کے دفینوں کو کُریدا ہے قلم نے  آئینۂ حاضر کو تراشا ہے قلم نے
نادیدہ زمانوں کو اُجالا ہے قلم نے  آئندہ کو رفتہ سے ملایا ہے قلم نے
بے شکلیِ عالم کا تشکُّل بھی قلم سے
ہے وقت کے دھارے کا تسلسل بھی قلم سے

خالق بھی قلم، کُن بھی قلم، اور نبی بھی  ہے تار بھی، مضراب بھی، اور نغمہ گری بھی
اول بھی ہے، آخر بھی، خفی بھی ہے جلی بھی  عالَم بھی ہے آدم بھی ہے، خاتَم بھی وصی بھی
شمعِ قلمِ ختمِ رسالت کی ہے ضَو ایک
فانوس تو چودہ ہیں، ہدایت کی ہے لَو ایک

پہلا ہے قلم اوّلُ ما خلق کا مصداق  تحریر کیا روزِ ازل اُس نے ہی میثاق
ہے خامۂ تقدیر کا اُس نور پہ اطلاق  اُس کے کلمہ خواں صحفِ عرش کے اوراق
ہوجاتا جہاں خلق، قلم وہ کہیں رکھتا
میں مدح کروں اُس کی، یہ قدرت نہیں رکھتا

شاخ اُس قلمِ نور کی منہاجِ بلاغت  لیتی ہے جو الہام سے بھی باجِ بلاغت
ہر خطبۂ و مکتوب ہے سرتاجِ بلاغت  ہے بعد وحی کے وہی معراجِ بلاغت
توحید کی رمزوں کا وہی عقدہ کُشا ہے
ہو بابِ سیاست تو وہی قلعہ کُشا ہے

کرتا ہے خدا جس کی ثنا، اُس کا قلم ہے  بتلائیں گے جبریل کہ کیا اُس کا حشم ہے
اُس کا قلم اللہ و محمدؐ کا علم ہے  بوجہل مقابل ہوں تو پھر تیغِ دو دم ہے
جن اُنگلیوں میں قدرتِ خیبر شکنی ہے
اُن کا قلم اللہ کے مانند غنی ہے

شمشیر جب اُس اہلِ قلم ہاتھ میں آئی  نکہت سی بِکھری کرتی ہوئی غنچہ کُشائی
ہر صفحۂ باطل پہ گھٹا بن کے وہ چھائی  سُرخیِ ستم تیغ کے پانی سے مِٹائی
جوں حرفِ غلط محو کیا بابِ جفا کو
کاٹا قلمِ تیغ سے ہر وصلِ دغا کو

چلتی تھی قلم بن کے وہ اوراقِ ادب پر　　سر کٹتے تھے لفظوں کی طرح جنبشِ لب پر
رُکتی تھی، مٹا دینے کو، ہر حرفِ غضب پر　　بجلی کی طرح گرتی تھی عنوانِ لقب پر
آلام و مصائب کے مضامین کو کاٹا
ظلم اور تشدّد کے فرامین کو کاٹا

ہجرت کی شبِ تار میں تنویر ہے اُس کی　　فتحِ اُحد و بدر بھی تفسیر ہے اُس کی
خیبر کے ہر اک باب پہ تحریر ہے اُس کی　　جبریل کے شہپر پہ بھی تحریر ہے اُس کی
اُس تیغ کی ہر بات مناجات سے افضل
ہر لفظ دو عالم کی عبادات سے افضل

ایمان کی نصرت ہے یداللہ کی شمشیر　　اُس کی نگہِ عدل ہے اسلام کی تعبیر
اُتری وہ جہاں، کعبۂ حق ہوگیا تعمیر　　ہے نہجِ بلاغہ اُسی تلوار کی تقریر
کس نے قلم و تیغ کو یوں ایک کیا ہے
جنگ ایسے عمل کو عملِ نیک کیا ہے

ہیں تیغ و قلم دونوں ہی مظلوموں کے حامی　　ہیں دونوں ہی میدانِ صداقت میں گرامی
ہیں خیر کے دونوں ہی بیک وقت پیامی　　دونوں ہی کو آتے ہیں مَلک دینے سلامی
اک عمرِ علی گذری رفاقت میں قلم کی
جنگ آگئی جب سر پہ تو شمشیر علم کی

شمشیر و قلم دونوں بھی ہیں حجتِ قاطع　　جب تیغِ علی چمکی رسالت ہوئی طالع
تھاما جو قلم نورِ امامت ہوا ساطع　　شمشیرِ قلم سے کیا کونین کو تابع
گر تیغِ خدا دادِ عدالت کی ہے میزان
رفتارِ قلم کذب و صداقت کی ہے میزان

یہ تیغ شب و روز کی روشن حدِ فاصل　　یہ تشنگیِ زر کے لیے موت کا ساحل
یہ معجزۂ نانِ جویں، فقر کی منزل　　کونین میں اس سے نہیں بڑھ کر کوئی عادل
عقدے ستم و جور کے تا حشر کھلیں گے
تا روزِ جزا اس میں ہی اعمال تلیں گے

کیا مدح و ثنا ہو قلم و سیفِ خدا کی　　قرآں نے سندِ نطق کی خود ان کو عطا کی
اور آیۂ تطہیر نے بخشی انھیں پاکی　　اک عمر احادیثِ محمدؐ نے ثنا کی
پائی ہے اگر تیغ خدا دستِ مَلک سے
خامہ بھی، قلم کی قسم، اُترا ہے فلک سے

جب تک تھے نبیؐ، اس نے ہی قرآں کیا تحریر　　جو بعدِ نبیؐ لکھا، ہے وہ کشف کی تعبیر
ہے گوہرِ ہر لفظ میں الہام کی تنویر　　ہر حاشیہ ہے ایک نئے علم کی تفسیر
حیدرؑ سے درِ علم نبوّت کو ملا ہے
علمِ حرمِ حق کا نیا باب کُھلا ہے

ہے مصحفِ ناطق کا قلم کاشفِ اسرار　　سو ڈھنگ سے توحید کا مضموں ہے ضیابار
مبحث ہو رسالت کا تو ہے معجزہ آثار　　ہیں عدل کے عنوان سے لاکھوں دُرِ شہوار
اک حرف سے دروازۂ اسرار کو کھولا
دو لفظوں میں ہر عقدۂ دشوار کو کھولا

موئے قلمِ عقدہ کُشا تیغ کی ہے دھار　　اک وار سے گرتی ہے براہین کی دیوار
کاٹ ایسی ہے، کٹ جاتی ہے شمشیرِ ہر انکار　　ہر لفظ سے پیدا ہے نیا عالمِ افکار
عقبیٰ کے مباحث ہوں کہ دنیا کے مسائل
حل مانگتے ہیں اپنا خود آ آ کے مسائل

تاریخِ تمدن ہو کہ افکارِ سیاست　　عمران کی بحثیں ہوں کہ موضوعِ معیشت
تدوینِ احادیث ہو یا علمِ بلاغت　　تحقیقِ روایت ہو کہ قانونِ درایت
سر ہوتے ہیں یہ قلعے بھی خیبر کی طرح سے
دَر کھُلتے ہیں سو، کعبے کے اِک دَر کی طرح سے

لکھتا ہے قلم عالم و حاکم کے خصائل　　ترکِ طلب و فقر و قناعت کے فضائل
جمہور کے حق اور فرائض کے مسائل　　یوں لکھے کہ معنی میں ہوئے لفظ نہ حائل
صبر اور بغاوت کو ہم آہنگ کیا ہے
علم و عمل و عقل کو یک رنگ کیا ہے

اس خامے کے عارض کا ہے ہر علم میں پرتو　　ہر گوشۂ تاریک ہوا اس سے ہی پُر ضو
شمعوں میں جنوں اور خرد کی ہے یہی لو　　ہر دیدہ و نادیدہ تک اس کی ہے قلم رو
کونین کو تولا ہے اسی نوکِ قلم سے
اللہ بھی بولا ہے اسی نوکِ قلم سے

پائی جو قلم نے مرے تھوڑی سی روانی　　پلکوں سے جو چُنتے ہیں مرے لفظ معانی
رکھے گا مجھے یاد جو یہ عالمِ فانی　　یہ سب قلمِ نور کی ہے فیض رسانی
خامہ مرا حکمِ قلمِ حق سے جواں ہے
فیضِ نبیؐ و ساقیِ کوثر سے رواں ہے

ہے اِک اسی نسبت سے قلم میرا سرافراز　　اسلوب کی جدّت میں کلاسیک کا ہے اعجاز
اظہارِ غمِ ذات ہے آفاق کی پرواز　　ہے مرثیہ میں آج کی نظموں کا سا انداز
ابلاغ کی ہر سطح پہ ترسیل ہے ممکن
ایجاز و علائم میں بھی تفصیل ہے ممکن

ہر تجربۂ زیست ہے بے ہیئت و اسلوب　　احساس کو ہر طرح کے الفاظ ہیں مطلوب
مخصوص کوئی طرز نہیں فکر کو مرغوب　　کیوں صنفِ سخن ہے کوئی خوب اور کوئی ناخوب
ہو پھوٹنا چشمے کو تو پتھر بھی نہیں سخت
پھر شعر پہ کیوں قافیے ہوں تنگ، زمیں سخت

قادر ہو قلم تو نہیں رُکتا ہے کہیں بھی　　یاقوت اُگل دیتی ہے سنگلاخ زمیں بھی
دے اُٹھتی ہے لَو کھردرے لفظوں کی جبیں بھی　　بن جاتی ہیں اصوات بآہنگ حسیں بھی
لفظوں کی چٹانوں سے اُبلتے ہیں معانی
اِک بات کے سَو رُخ سے نکلتے ہیں معانی

ہے بحر کم آہنگ پہ جب شعر کا الزام　　کیوں مرثیہ و مثنوی و ہجو سے اِبرام
ناشاعروں کے تجربے کا شعر نہیں نام　　تیشہ ہو تو ہر سنگ میں بے تاب ہوں اصنام
کہہ دے جو قلم کُن تو ہو عالم نیا پیدا
مٹی سے بھی کر لیتا ہے فن دیوتا پیدا

نا شاعروں کے ہاتھ میں جب بھی قلم آیا تخلیق کی آبادیوں میں سیلِ غم آیا
لفظوں کے لیے لے کے صلیبیں ستم آیا فن نقشِ معانی پہ لیے چشمِ نم آیا
ارزاں ہوئی توقیرِ قلم بے ہنری سے
ہیروں میں بخوف ریزے ٹلے کم نظری سے

بے قدر قلم ہے شجرِ نور سے کٹ کر ہر در کا گدا ہے درِ تخلیق سے ہٹ کر
رہ جاتا ہے درباروں کی چوکھٹ سے لپٹ کر بک جاتا ہے بازار کے سکّوں میں سمٹ کر
سر ہوتے ہیں تشہیر شہیدوں کے قلم پر
پرچم نظر آتے ہیں یزیدوں کے قلم پر

انمول قلم کوڑیوں کے مول بکے ہیں کچھ بن کے لبِ کذب جواہر میں ٹلے ہیں
کچھ قاتلوں کے تیغِ ستم کار بنے ہیں کچھ کر کے ثنا حاکموں کی ٹوٹ گئے ہیں
کٹ جائیں تو محرومِ رگِ تاک ہیں شاخیں
ٹوٹیں شجرِ گل سے تو پھر خاک ہیں شاخیں

ہے جو قلم افزائشِ تہذیب کا آلہ بک جائے تو بن جاتا ہے تخریب کا آلہ
ہے جو ستم و ظلم کی تادیب کا آلہ بن جاتا ہے مظلوموں کی تعذیب کا آلہ
بیچو تو ہے کشکولِ گدا نام قلم کا
بازاروں میں چلاتے پھرو 'کام قلم کا'

ہے فقر پہ فخر اہلِ قلم کے لیے شایاں خوددار اٹھاتے نہیں انعام کا احساں
ہے بے خبری جاہ سے سچائی کا عنواں خوشنودیِ حکّام میں ذلت کے ہیں ساماں
ابنائے زماں آنکھیں بچھاتے ہیں جہاں پر
رکھتی بھی نہیں خاکِ قلم پاؤں وہاں پر

فن ملتا ہے جھک جھک کے ہراک صاحبِ غم سے جُھکتا ہے قلم اشک ہر اِک دیدۂ نم سے
کھنچ جاتا ہے تلوار کی مانند ستم سے ۔ فنکار پہ لازم ہے غرور اہلِ حشم سے
بک سکتے ہیں ایمان، قلم بک نہیں سکتا
نیلام جہاں عیش ہوں، غم بک نہیں سکتا

سچ کا قلم آمر کا قصیدہ نہیں کہتا    مذموم خصائل کو حمیدہ نہیں کہتا
مٹی کو کبھی عرش رسیدہ نہیں کہتا    ذرّوں کو کبھی گوہرِ چیدہ نہیں کہتا
لکھتا ہے قصیدہ تو یہ پامردیِ غم کا
اور مرثیہ لکھتا ہے قتیلانِ ستم کا

چلتا ہے قلم دوڑتا نخلِ شہدا میں    کرتا ہے اگر رقص تو گردابِ قضا میں
روپ اس پہ جو آتا ہے تو سیلابِ جفا میں    رنگ اس کا نکھرتا ہے تو شعلوں کی قبا میں
ہے غربتِ صد آبلہ پا اس کا مقدّر
تنہائی کا زندانِ بلا اس کا مقدّر

بے باک قلم رہتا ہے آوارہ و برباد    ہر دامِ حکومت سے کنارہ کش و آزاد
سرچشمۂ الہام سے مِل جائے اگر داد    رہتے ہیں نہ خوباں کے نہ دنیا کے ستم یاد
ناپُرسیِ عالم سے کدورت نہ گِلہ ہے
تخلیق کی تکمیل ہی خالق کا صِلہ ہے

داروغۂ اصطبل کہ چنگی کا ہو منشی    جج ہو کہ منسٹر، پروفیسر ہو کہ مالی
پولیس کا کارندہ و مخبر ہو کہ فوجی    دھوبی ہو کلکٹر ہو کہ نائی ہو کہ درزی
ہے سب کا صِلہ، گو کہیں زائد کہیں کم ہے
بے مُزد فقط خدمتِ اربابِ قلم ہے

خواہاں ہیں جو اُجرت کے، قلم کان پہ رکھ لیں    الفاظ کو سکّوں کے عوض بیچنے نکلیں
دیواروں پہ روغن کریں اور تختیاں لکھیں    بے کتبۂ و تعویذ ہیں خالی کئی قبریں
سرکاری دفاتر ہیں کُھلے اہلِ قلم پہ
تشہیر کی دکانیں ہیں ہر چار قدم پہ

دولت ہی کمانا ہو تو ہیں لاکھ وسیلے    مُردہ ہو جو دِل، عیش کے ہیں سیکڑوں حیلے
مشتاق تفنّن کے ہیں زردار قبیلے    اس طرح بھی گر اہلِ قلم چاہے تو جی لے
لیکن یہ رہے یاد، قلم سب سے غنی ہے
تخلیق کی تقدیر میں تنہائی لکھی ہے

غُل آج ہے بے مقصدیِ شعر و ادب کا — احساس ادیبوں کو ہے صرف اپنے لقب کا
راقم ہے قلم کربِ دروں، تنگیِ شب کا — ترک اس کا تعلّق ہوا ماحول سے کب کا
مظلوم سے رشتہ ہے نہ ظالم سے غرض ہے
بس اپنے تصوّر کے عوالم سے غرض ہے

کہتے ہیں قلم کرتا ہے خلق اپنی ہی اقدار — جُز ذوق نہیں اور ادب کا کوئی معیار
ہو رنگ کی تفریق کہ آزادیوں پر وار — ہو جنگ کہ امن، اِن سے نہیں فن کو سروکار
تطہیرِ قلم کرتی ہے، نابستگیِ فن
ہر فرض سے آزاد ہے وابستگیِ فن

میں مان لوں نابستگیِ فن کا یہ دعویٰ — پر ڈال لوں آنکھوں پہ کسی طرح سے پردا
برسوں بری اِس چشمِ گنہ گار نے دیکھا — نابستگیِ فن نے کیا ظلم سے سودا
انکارِ سیاست نے چھوئے پائے سیاست
نابستگیِ فن ہوئی رسوائے سیاست

لب بستگیِ فن کا ہوا جشن جو برپا — اظہار پہ بندش ہوئی اور فکر پہ پہرا
نابستہ قلم خول سے باہر نکل آیا — زر دے کے حکومت نے جسے چاہا خریدا
ہر دام پہ بکنے کو قلم صف بہ صف آئے
ایوانوں میں سجدہ بہ سر اہلِ شرف آئے

ویدوں کی، گرنتھوں کی نہ قرآن کی حُرمت — توریت نہ انجیل، نہ ایمان کی حُرمت
آوازِ ضمیر اور نہ انسان کی حُرمت — بس رہ گئی لب بندی کے فرمان کی حُرمت
صرف ایک اشارہ جو کیا بے ہنری نے
چشم و دل و لب نذر کیے دیدہ وَری نے

جو کہتے تھے ہنگامی ادب ہے خس و خاشاک — ہنگامی فرامین سے فن اُن کا ہوا خاک
ہنگامِ ستم ظلم کی خدمت سے نہ تھا باک — شہ کھا کے سیاست سے بھی فن ہوگیا چالاک
بکنے پہ قلم آئے تو پھر رُک نہیں سکتا
وہ کون سی چوکھٹ ہے جہاں جھک نہیں سکتا

کیوں، کس نے قلم بیچا، سوال اس کا نہیں ہے　　غم یہ ہے کہ آلودۂ خاک اب بھی جبیں ہے
ہر عہد میں ہوتا رہا یہ، پھر بھی یقیں ہے　　آزادیِ اظہار قلم والوں کا دیں ہے
نازاں ہوں کہ آزاد ابھی اردوٗ کا قلم ہے
ناقدریوں کی شب میں بھی انوار رقم ہے

صد شکر قلم میرا زر آلودہ نہیں ہے　　گو تلخ ہے پر مصلحت آلودہ نہیں ہے
شعلہ بہ لب و تند ہے، بے ہُوٗدہ نہیں ہے　　پچیس برس لکھ کے بھی فرسودہ نہیں ہے
جس رہ میں قدم رکھنے کی باقی نہ تھی جا بھی
چھوڑ آئی وہاں نقش بری لغزشِ پا بھی

احسان ہے رب کا کہ کیا فکر کو عالی　　تازہ ہوئی، کُہنہ بھی اگر صنف اُٹھالی
ہو شعر کہ نثر ایک نئی راہ نکالی　　تقلید کے در پر نہ گیا بن کے سوالی
خود پست ہوا، گھٹنے نہ دی شان قلم کی
رسوا ہوا خود، رکھی مگر آن قلم کی

جو کچھ ہے قلم، فیض ہے یہ ربّ عُلا کا　　شان اِس کی ہے فیضان رسولِ دو سرا کا
کاٹ اِس کی ہے صدقہ قلمِ سیفِ خدا کا　　بے باکیِ اظہار کرم ہے شہدا کا
زہر اس نے پیے تشنگیِ کرب و بلا کے
ساغر ہوئے کوثر سے عطا آبِ بقا کے

عاصی ہوں میں، خود اپنے گناہوں کا ہے اقبال　　خود اپنی ہی لغزش نے کیا ہے مجھے پامال
روشن ہے جہاں پر کہ ہیں تیرہ مرے اعمال　　پر جُرمِ ریا کا نہیں مُجرم میں کسی حال
اللہ کا مجرم ہوں، زمانے کا نہیں ہوں
اپنے ہی قلم کی طرح فرخندہ جبیں ہوں

اِک عمر تھی وہ بھی کہ بہت کی ہیں عبادات　　فاقوں میں بھی کی حمدِ خدا، نعت و مناجات
تفسیر و احادیث میں کھویا رہا دن رات　　نقش اب بھی ہیں دل پہ مرے قرآن کی آیات
انعام اُن ایامِ اطاعت کا یہی ہے
سجدوں سے زمانے کے جبیں میری تہی ہے

وہ لوگ جو راسخ ہیں رہِ دینِ مبیں پر قشقے کی طرح سجدے سجاتے ہیں جبیں پر
گنتے ہیں معاصی مرے تسبیح یقیں پر کرتے ہیں کنایات میں شک دھرے دیں پر

شاہد ہے خدا، غیروں کو یہ علم نہیں ہے
ایماں ہے مرا کفر بھی اور شک بھی یقیں ہے

چوکھٹ کوئی چومی ہے؟ قلم سے مرے پوچھو حاکم کی ثنا کی ہے؟ قلم سے مرے پوچھو
غیرت کہیں بیچی ہے؟ قلم سے مرے پوچھو دولت کبھی پوجی ہے؟ قلم سے مرے پوچھو

ہے زندگی آئینہ، تعلّی نہیں کرتا
جُز آلِ نبیؑ مدح کسی کی نہیں کرتا

چُوما جو قدم، سیّدۂ عالمیاںؑ کا جب ذکر کیا، ثانیِ زہراؑ کی زباں کا
آزاد جو ہوں، فیض ہے سجادؑ کی جاں کا پیاسا ہوں تو ہوں ذکرِ شہِ تشنہ دہاں کا

ممنون کسی کا نہیں، ممنونِ نبیؐ ہوں
نازاں ہوں تو اس پر ہوں کہ مداحِ علیؑ ہوں

ایوانوں سے اونچی ہے مری گردِ کفِ پا ہر مسند و منصب سے چٹائی مری اعلیٰ
ہے دستِ قلم ہاتھوں سے حکام کے بالا پندارِ خودی زہد کی نخوت سے ہے سچّا

زہّاد مجھے چشمِ رعونت سے نہ دیکھیں
سجدے مرے ماتھے کو حقارت سے نہ دیکھیں

کھایا ہے اگر زخم تو کھایا ہے جگر پر پتھر بھی جو آئے ہیں، لیا ہے اُنھیں سر پر
طاقت کی حقیقت ہے عیاں میری نظر پر زر کاسہ بکف ہے مرے افلاس کے در پر

یہ درسِ خودی نہجِ بلاغۃ سے لیا ہے
مجھ کو یہ شرف نسبتِ حیدرؑ نے دیا ہے

جُز خامہ و کاغذ کوئی دولت نہیں رکھتا جُز زورِ بیاں، میں کوئی طاقت نہیں رکھتا
جُز صحتِ ذہن اور کوئی صحت نہیں رکھتا جُز لغزشِ پا، کوئی ندامت نہیں رکھتا

صد شکر کہ ورثے میں بڑائی نہیں پائی
جُز فکرِ رسا کوئی رسائی نہیں پائی

اے خامۂ گلشن رقم، اے کُن کے سبق خواں　　اے چشمِ جہاں گیر، افق تاب، شفق خواں
اے خیر رقم، صدق بیاں، ویدۂ حق خواں　　اے احمدؐ و حیدرؑ کے فضائل کے ورق خواں
جل جائے جو طوُر ایسی تجلّی نہیں زیبا
اے نطقِ کلیم، ایسی تعلّی نہیں زیبا

اے رخشِ قلم! کھینچ عناں اب تو بیاں کی　　کی سیر بہت حرف و معانی کے جہاں کی
تفریح بھی کی، خامہ فروشوں کی دُکاں کی　　تو دیکھ چکا ہے، یہ تجارت ہے زیاں کی
کر عمر بسر کار گہہِ لوح و قلم میں
سر اپنا جھکا بارگہہِ لوح و قلم میں

وہ بارگہہِ فضل جو قبلہ ہے شرف کا　　جو ابرِ گُہر بار ہے ایماں کے صدف کا
درعلم کا، معدن ہے جو دُرہائے نجف کا　　مکتب ہے جو اُستادِ ملائک کے خلف کا
نیوڑھا وہیں تو اے قلم اب فرقِ ادب کو
پھیلا اُسی سرکار میں تو دستِ طلب کو

پایا ہے جو تو نے اِسی دربار سے پایا　　سورج نے بھی نور اِس درِ انوار سے پایا
گُل نے بھی زر اِس گلشنِ بے خار سے پایا　　قرآن نے بھی نطق اسی سرکار سے پایا
قرطاس و قلم پائے صحائف نے یہیں سے
اُتری ہے وحی عرش پہ اِس گھر کی زمیں سے

جاروب بھی اِس در کی حق آگاہ قلم ہے　　پہنچے جو یہاں خار و خسِ راہ، قلم ہے
افلاک بیاضیں ہیں، کفِ ماہ قلم ہے　　ہے عرش ورق، دستِ ید اللہ قلم ہے
یہ خامہ رواں عرش سے تا فرشِ زمیں ہے
گر شک ہو تو شاہد پر جبریلِ امیں ہے

اِس بیتِ وحی میں ہے جو آیت، وہ جلی ہے　　الہام کے لب چُوس کے پھُولی ہے پھلی ہے
کعبے میں پلی، سانچے میں قرآں کے ڈھلی ہے　　اس گھر کا ہر اِک فرد محمدؐ ہے علی ہے
لکھیں قلمِ حق نے یہ آیات سرِ عرش
معراج میں ان ہی کی ہوئی بات سرِ عرش

قرآں کی سند نہجِ بلاغۃ کو ہے حاصل ہے نامۂ صلحِ حَسن ایمان کا حاصل
آیات ہوئی ہیں سرِ شبیرؑ پہ نازل سجادؑ نے لکھا جو صحیفہ، وہ ہے کامل
تفسیر کا در باقرِؑ ناطق سے کھلا ہے
باب فقہا جعفرِؑ صادق سے کھلا ہے
عرفاں قلمِ موسیٰ کاظمؑ کی عطا ہے تحریرِ رضاؑ خالقِ قرآں کی رضا ہے
تقویٰ ہے تقیؑ سے تو نقیؑ امرِ خدا ہے اور عسکریؑ پر ختم اسیری کی بلا ہے
پردے میں ہے مہدیؑ کے قلم ربِّ عُلا کا
در اُن پہ ابد تک ہے کھلا نطقِ خدا کا
ہے نطق صفت خالقِ ربِّ دو جہاں کی یہ نطق بھی لے ہے قلمِ زمزمہ خواں کی
جس نطق سے کھل جاتی ہیں گرہیں دل و جاں کی وہ نطق ہے ضو خامۂ اعجاز بیاں کی
صامت تھی وحی، نور کے خاموں سے ہے ناطق
قرآں کا ہر اک حرف اماموں سے ہے ناطق
ناطق ہوں فقط لب تو زباں موج ہوا ہے تقریر کی تقدیر میں گردابِ فنا ہے
ہیں لفظ حباب اور زماں سیلِ قضا ہے معنیٰ کی ہر اِک بوند سمندر کی غذا ہے
الفاظ و معانی کو پرولیں جو قلم میں
ہر حرف بنے نغمۂ کُن کتمِ عدم میں
بے سمتی و احساسِ خلا جاں کی گھٹن ہے اُلجھی ہوئی سانسوں کا قفس محبسِ تن ہے
برسوں سے زباں ترش ہے اور تلخ دہن ہے اشعارِ غزل میں بھی دبی دل کی جلن ہے
ہے ہجو سے یا طنز سے ہر لفظ سم آلود
ہے عشق بھی اندیشۂ ہجراں سے غم آلود
ہے جبر زمانے کا کہ افتادِ طبیعت آئینۂ شوق میں بھی ہے گردِ کدورت
اندازِ تمسخر میں بھی مضمر ہے شکایت ہنسنے میں بھی ڈر ہے کہ بدل جائے نہ صورت
خوشیوں کے بیاں میں بھی ملاوٹ ہے غموں کی
بزم و طربِ عیش میں آہٹ ہے غموں کی

اک عمر سے ہے موئے قلم زہر چشیدہ  شرکت ہے ہر اک بزم کی تنہائی رسیدہ
ہے جامِ مئے بے خودی آلام کشیدہ  بن جاتا ہے اشک آنکھوں میں ہر گوہرِ چیدہ
زمزم سے وضو کرنے کی حاجت ہے قلم کو
کوثر میں نہانے کی ضرورت ہے قلم کو

اے زہر چشیدہ قلم تلخ بیانی  اے کرب رسیدہ قلم ترش زبانی
اے درد کشیدہ قلم خون نشانی  اے نوحہ شنیدہ قلم مرثیہ خوانی
تو ساغرِ صبر اہلِ شہادت سے طلب کر
عرفان کی مے نہج بلاغۃ سے طلب کر

میں برسوں بھٹکتا رہا تشکیک کی رہ پر  جادے سے ہدایت کے ہوا منحرف اکثر
گمراہیوں نے چھوڑا نہ لغزش کا کوئی در  تھی کفر کی منزل برے ایمان کا جوہر
سرگشتہ و حیران بھی بھٹکایا قلم نے
رستہ بھی درِ علم کا دکھلایا قلم نے

تا زندگی اب مجھ سے قلم کا ہے یہ پیماں  ہر سال ہو اک مرثیۂ شاہِ شہیداں
مضموں ہو نیا، چہرہ نیا، اور نیا عنواں  ہر فصلِ عزا لوٹے جواہر کی یہ دکاں
ہر اک صدفِ چشم کو یہ ابر گہر دے
رومال کو زہراؑ کے دُرِ اشک سے بھر دے

لایا ہوں قلم اشکِ غمِ شاہ میں دھو کر  دی آب اسے پیاس کے دریا میں ڈبو کر
پایا ہے اسے خاکِ درِ علم کی ہو کر  رکھا ہے اِسے خونِ شہیداں میں بھگو کر
ہے خاکِ نجف تاجِ سرافراز قلم کا
مداحیِ شبیر ہے اعزاز قلم کا

اب اے قلم آنکھوں کو برسنے کی رضا دے  ٹھہرے ہوئے دریا کو اُبلنے کی صدا دے
صحرائے دل و دیدہ کو اشکوں کی گھٹا دے  اس بزم کو گل ہائے مودت میں بسا دے
سینہ ترا اُس ذکرِ شہادت سے بھرا ہے
بے تاب جسے سننے کو یہ بزمِ عزا ہے

لِکھ تذکرہ اب فرقتِ قرطاس وقلم کا　　کرنا ہے بیاں ہجرتِ اربابِ ہِمم کا
بیعت طلب ابرار سے فرماں ہے ستم کا　　رخصت ہے مدینے سے پسر خیرِ اُمم کا
شاخیں قلمِ نور کی کٹتی ہیں شجر سے
ہے مصحفِ ناطق کا سفر علم کے گھر سے
جب حق کے مدینے کے لیے ابرِ غم اُٹھے　　ڈھانے کو درِ علم ستم کے علم اُٹھے
مصحف کی طرف بے ادبوں کے قدم اُٹھے　　قرآں کی حفاظت کو بہتر قلم اُٹھے
تطہیرِ صداقت کی ردائیں بھی ہوئیں ساتھ
لوح وقلمِ حق کی دعائیں بھی ہوئیں ساتھ
خط کذب نے بھیجا ہے بنِ فاطمہؑ کے نام　　اے سیّدِ عالی حشم، اے صاحبِ اکرام
حکّام مدینے کے ہیں سرکار کے خُدّام　　دربارِ خلافت سے ابھی آیا ہے پیغام
امشب ہی ملاقات کی تکمیل ہے لازم
فرمانِ شہنشاہ کی تعمیل ہے لازم
خط کو پسرِ صاحبِ اِقرا نے جو دیکھا　　آثار تردُد کے ہوئے رُخ پہ ہویدا
احباب و اعزا کو وہ خط پڑھ کے سنایا　　فرمایا، یہ درپردہ ہے بیعت کا تقاضا
میں جان گیا، شام کے حاکم نے قضا کی
ہے سلطنت اسلام کی اب مِلک جفا کی
معلوم ہے تم کو، مجھے بیعت سے ہے انکار　　کیسے قلمِ علم کرے جہل کا اقرار
کیا سلطنتِ جبر سے عادل کو سروکار　　کیوں شام کی ظلمات کے محکوم ہوں انوار
فرمانِ جفا درپے آزار ہوا ہے
یہ خط نہیں، صحرائے ستم مُجھ پہ کھلا ہے
اک عُمر سے میں خادمِ قرآنِ مُبیں تھا　　قرطاس کی خلوت میں قلم گوشہ نشیں تھا
دنیا و حکومت سے سروکار نہیں تھا　　مادر کی لحد، نانا کے روضے سے قریں تھا
لکھنا ہے جسے خوں سے وہ قرطاس ملا ہے
میعاد نہیں جس کی، وہ بن باس ملا ہے

احباب پریشاں، متردّد ہوئے انصار    تیوری سے عزیزوں کی ہوا غیظ نمودار
عبّاس کے پہلو میں مچلنے لگی تلوار    فرماتے رہے صبر کی تلقیں شہِ ابرار
جو چیں بہ جبیں دیکھا جوانانِ جناں کو
یاد آ گئی حیدرؓ کی امامِ دو جہاں کو

فرمایا ابھی بند ہر اِک راہ نہیں ہے    جائیں گے جہاں، کیا وہاں اللہ نہیں ہے
تلوار اُٹھانے کی مجھے چاہ نہیں ہے    یہ شہر محمدؐ کا ہے، جنگاہ نہیں ہے
مقصود مجھے پیرویِ صبرِ علی ہے
کب تیغِ یداللہ مدینے میں چلی ہے

گر شہر کے حاکم کا ہو بیعت ہی پہ اصرار    ہے ابنِ علی ترکِ وطن کے لیے تیّار
یہ طے ہے کہ ہم پہلے اٹھائیں گے نہ تلوار    ہو جائیں گے خود گند ستم گار کے ہتھیار
دن ڈھل گیا اس گفتگوئے شاہِ امم میں
بے چین ہوئیں زینب و کلثوم حرم میں

زینب نے خبر پائی کہ آیا ہے خطِ شام    سُن سُن یہ ملی، فکر میں ہیں شاہِ خوش انجام
بیعت کا ہے کچھ ذکر، کچھ اندیشۂ حکّام    بپھرے ہوئے سے ہیں اسداللہ کے گلفام
فضّہ سے کہا، جا کے برادر کو صدا دیں
زینب کو بھی حاکم کا خط اِک بار دکھا دیں

ہمشیر کے پیغام پہ اُٹھے شہِ والا    فرمایا کہ گھر جائیں اب انصار و اعزا
ہے منتظرِ ابنِ علی دُخترِ زہرا    لازم ہے مجھے بہنوں سے بھی مشورہ کرنا
احباب کمر کھولیں، کریں یار اب آرام
یہ آخری شب گھر کی ہے، فرمائیں سب آرام

میں سنتا ہوں، آتی ہے اِک آوازِ فغاں بھی    بے تاب نہ ہوں سیّدۂ عالمیاںؑ بھی
بے شمع نہ ہو روضۂ سرکارِ جہاںؐ بھی    امشب مجھے جانا ہے زیارت کو وہاں بھی
تم لوگ مرا ساتھ بھلا دو گے کہاں تک
شب ڈھلنے پہ میں جاؤں گا حاکم کے مکاں تک

فرما کے یہ، داخل ہوئے گھر میں شہِ ابرار ڈیوڑھی پہ کھڑے رہ گئے کچھ منتخب انصار
زینبؑ نے رُخِ پاک کو دیکھا، ہے غم آثار بے تابی میں اطراف پھریں اُن کے کئی بار
بولیں کہ بلالے کے بہن بھائی کی مرجائے
جو آپ پہ آئی ہے مصیبت مرے سر جائے
تنہا ہیں گُلِ سرسبدِ پنج تنی آپ لے دے کے ہیں اِک ابنِ رسولِ عربی آپ
ہیں وارثِ تیغ و قلمِ مرتضوی آپ دنیا میں ہیں اب مالکِ صبرِ حَسَنی آپ
کیا بات ہے جو صبرِ حَسَن میں خلل آیا
کیوں رحمتِ کونین کے ابرو پہ بل آیا
زینبؑ تھیں پریشان جہاں بھائی کے ہمراہ یکجا ہوئی گرد اُن کے وہاں عترتِ ذی جاہ
کچھ بات ہے تشویش کی سب ہوگئیں آگاہ ہر بی بی کے ہونٹوں پہ تھی گھٹی ہوئی اِک آہ
مختارِ جہاں نے لبِ مجبور کو کھولا
سرور نے خطِ حاکمِ مقہور کو کھولا
فرمایا کہ یہ ظلم کا پیغامِ طلب ہے میں جانتا ہوں، اس طلبی کا جو سبب ہے
اب تختِ حکومت پہ یزیدِ کم ادب ہے بیعت طلبی حیلۂ اظہارِ غضب ہے
عامل سے مناسب ہے کہ میں بات کر آؤں
شاید کوئی رہ نکلے، ملاقات کر آؤں
زینبؑ نے کہا، اے اسد اللہ کے دلبر یہ خط نہ ہو تمہیدِ گرفتاریِ سرور
کرلے نہ اسیر آپ کو مروانِ ستم گر لازم ہے جلو میں رہیں عباسِ غضنفر
گر آپ پہ آنچ آئی تو مرجائیں گے ہم لوگ
گھر آپ نہ آئے تو کدھر جائیں گے ہم لوگ
شبیرؑ نے فرمایا، تردُّد ہے یہ بے جا اس مرحلے پر ظلم یہ جرأت نہ کرے گا
معلوم ہے، اس وقت تو ٹل جائے گا خطرہ لیکن نہیں اب جائے اماں شہرِ نبیؐ کا
انسب ہے مہیا رہے سامان سفر کا
رُخ کرنا ہے کل صبح کو اللہ کے گھر کا

یاں بات چلی بیبیوں میں عزمِ سفر کی بدلی ہوئی صورت نظر آنے لگی گھر کی
تصویر ہر اِک گوشہ بنا دیدۂ تر کی خدام نے جا جا کے اعزا کو خبر کی
حلقے سے حرم کے شہِ خوش خو نکل آئے
آنکھوں سے نظر والوں کے آنسو نکل آئے

ڈیوڑھی سے چلے قصرِ امارت کی طرف شاہ چاپ آپ نے قدموں کی سُنی راہ میں ناگاہ
رُک کر کہا، کون آتا ہے آخر برے ہمراہ روشن تھے اندھیرے میں محمدؐ کے کئی ماہ
عباسؑ کے ہمراہ گہرہائے نجف تھے
ضیغم اسد اللہؑ کے شمشیر بکف تھے

عباس نے کی عرض کہ اے سیّدِ والا خادم کو نہیں شام کے عامل پہ بھروسا
یہ شب، یہ اندھیرا، نہ وہاں جایئے تنہا کیا جانیے، فرمان ہے کیا شام سے آیا
ہو اِذن غلاموں کو تو ہمراہ چلیں ہم
عامل کے درِ مکر کے پہرے پہ رہیں ہم

اِس پاسِ محبت سے ہوئے خوش بنِ زہراؑ اس عشق کے انداز پہ دل اُن کا بھر آیا
فرمایا، یہی ضد ہے تو ساتھ آئیں اعزا پر شرط ہے یہ، جاؤں گا میں قصر میں تنہا
اونچی اگر آواز ہو اس بندۂ رب کی
سمجھو کہ مدد ابنِ محمدؐ نے طلب کی

دروازے پہ استادہ ہوئے قاسمؑ و اکبرؑ پہلو میں ابوالفضلؑ کے تھے اُن کے برادر
داخل ہوئے حاکم کے محل میں بنِ حیدرؑ مروان تھا بیٹھا ہوا عامل کے برابر
دونوں اُٹھے مظلوم کی تعظیم کی خاطر
ظلم اُٹھ کے کھڑا ہوگیا تسلیم کی خاطر

مسند پہ ادب سے شہِ عالی کو بٹھایا عامل نے ستم گار کا مکتوب سُنایا
لکھا تھا، معاویہؔ کو خالق نے اُٹھایا بندے کو شہنشاہِ حقیقی نے بُلایا
شبیرؑ نے فرمایا، قضا رب کی رضا ہے
پابند اس آئین کا ہر شاہ و گدا ہے

بعد اس کے کیا صاف یہ عامل نے تقاضا ہے تختِ خلافت پہ یزید انجمن آرا
لازم ہے کہ بیعت کریں اُس کی شہِ والا فرمان خلیفہ کا ہے فرمان قضا کا
فرزندِ محمدؐ کی ہے بیعت سندِ حق
وہ چاہتا ہے پائے خلافت سندِ حق
شبیرؑ نے فرمایا کہ دے فکر کی مہلت اس رات کے پردے میں مُناسب نہیں بیعت
ہو روشنیِ صبح تو کھلتی ہے حقیقت ہو جائے گی روشن دو جہاں پر مری نیت
اس وقت میں گھر جاؤں، اگر ہو تری مرضی
عامل نے کہا اُٹھ کے، جو سرکار کی مرضی
مروان پکارا کہ یہ کیا کرتا ہے ناداں کل ہوگی گرفتاریِ شبیرؑ نہ آساں
بیعت لے اسی وقت، ہے حاکم کا یہ فرماں اس وقت ترے ہاتھ میں شبیرؑ کی ہے جاں
دے حُکم غلاموں کو ابھی اِن کو پکڑ لیں
زنجیروں میں فرزندِ محمدؐ کو جکڑ لیں
ابنِ اسد اللہ کو غیظ آگیا اک بار رُخ سُرخ ہوا، کانپ اُٹھی پہلو میں تلوار
فرمایا، ہے اللہ مری جان کا مختار ہے کس کی مجال، آج کرے مُجھ کو گرفتار
مولا کی صدا سُنتے ہی تھرّا گئے عباس
در توڑ کے شمشیر بکف آگئے عباس
اللہ کے شیروں کو جو بپھرا ہوا دیکھا مروان کا رُخ فق ہوا، عامل لرز اُٹھا
عباس کے تیور میں تھا انداز علی کا ہم شکلِ نبیؐ غیظ کی صورت تھا سراپا
گھبرا کے ستم گاروں نے جاں بازوں کو دیکھا
حاکم کے غلاموں نے سرافرازوں کو دیکھا
تھی ہاتھ میں شیرِ اسد اللہ کے شمشیر تھی چینِ جبیں مدّعیوں کے لیے زنجیر
کٹ جاتا سرِ ظلم اگر ہوتے نہ شبیرؑ فرمایا کہ اے بھائی معاف ان کی ہو تقصیر
مقصود مجھے پیرویِ صبرِ علی ہے
کب تیغِ یداللہ مدینے میں چلی ہے

دنیا ہے جلالِ اسداللہ پہ قربان     ہیں سلطنتیں صبر کی اک آہ پہ قربان
جاگیریں ہیں مردانِ حق آگاہ پہ قربان     ہیں تختِ شہادت کی گزرگاہ پہ قربان
کیا جاہ و حشم، راہِ سعادت ہے ہماری
ذلت سے بچیں گے یہ، شہادت ہے ہماری

لو جھوک دو غصہ بھرے شیرانِ دلاور     نادانوں پہ بگڑا نہیں کرتے ہیں بجز زر
کیا جانیں یہ، کیا ہے شرفِ آلِ پیمبر     دیکھے نہیں شمشیرِ یداللہ کے جوہر
ظلم اور ستم عیش کریں بیٹھ کے گھر میں
مردانِ خود آگاہ کی منزل ہے سفر میں

گھر آئے سنبھالے ہوئے عباس کو شبیرؑ     تشویش اعزا کو تھی، کیوں ہوتی ہے تاخیر
تھے منتظر انصار، خواتین تھی دل گیر     در تک کئی بار آئی، گئی شاہ کی ہمشیر
آئے جو حسینؑ آگئی جاں حق کے بدن میں
گل پھر سے شگفتہ ہوئے زہراؑ کے چمن میں

احباب سے ملتے ہوئے ڈیوڑھی میں گئے شاہ     اطراف چلیں بیبیاں، بچے ہوئے ہم راہ
بستی یہ اُجڑنے کو ہے شبیرؑ تھے آگاہ     کی حجرۂ زہراؑ پہ نظر کھینچ کے اِک آہ
فرمایا کہ اب روضۂ مادر سے چھٹے ہم
سمجھو کہ ہمیشہ کے لیے گھر سے چھٹے ہم

زینبؑ نے کہا، کہیے تو کچھ کیا ہوئی باتیں     فرمایا ہیں سب بیعتِ با جبر کی گھاتیں
خیمے کرو بار اونٹوں پہ، لدواؤ قناتیں     اب ختم ہوئے امن کے دن، چین کی راتیں
رخصت ہے سحر ہوتے ہی نانا کے وطن سے
ہوتا ہے جدا ماں کی لحد، قبرِ حسنؑ سے

پہلے ہی سے سامانِ سفر کرتے تھے خدام     حجروں سے نکل آیا تھا اسباب سرِ شام
بندھنے لگے بستر تو گئی خواہشِ آرام     نگرانی پہ مامور تھے عباسِ خوش انجام
جانا تھا جو سامان، وہ باہر نکل آیا
دالان میں گہوارۂ اصغر نکل آیا

صندوقوں میں چننے لگا بکھرا ہوا سامان  زہراؑ کی ردا دیکھی تو زینبؑ ہوئی گریاں
آنکھوں سے لگائی گئی تیغِ شہہِ مرداں  چوما بہ ادب پیرہنِ فخرِ رسولاںؐ
ہر بستے میں اِک بھولی کہانی نظر آئی
رکھ لی، جو بزرگوں کی نشانی نظر آئی

خوش پھرتے تھے بھاگے ہوئے چاروں طرف اطفال  رُخ سُرخ، چمک آنکھوں میں، بکھرے ہوئے تھے بال
تھا شوقِ سفر اُن کے لیے غرّۂ شوال  اک دوسرے سے کہتے تھے خوش وقتی کے احوال
وہ جوش تھا قابو میں نہیں آتے تھے بچّے
پکڑیں جو بڑے ہاتھ، مچل جاتے تھے بچّے

تھی بیبیوں کو فکر کہ دل کیسے سنبھالیں  کِن چیزوں کو ہمراہ رکھیں کِن کو نکالیں
کُچھ چین میسّر ہو جو بچوں کو سُلالیں  فرصت ہو تو ہم چشموں سے رخصت کی رضا لیں
ہوں کام بہت سے تو سنورتا نہیں کُچھ بھی
تشویش ہو لاحق تو سُدھرتا نہیں کُچھ بھی

مصروف ہوئے سب تو اُٹھے حضرتِ شبیرؑ  انصار سے کرتے رہے دل جوئی کی تقریر
عزمِ سفرِ شاہ سے زینبؑ ہوئیں دل گیر  گھر اپنے گئیں اوڑھ کے وہ چادرِ تطہیر
دل میں تھا جو بیٹوں سے، نہ شوہر سے کہا کُچھ
کہنے کو کُچھ آئیں، بنِ جعفر سے کہا کُچھ

بیمار رفیقِ سفرِ زیست نے دیکھا  چہرے سے ہیں آثار تذبذب کے ہویدا
بٹھلا کے قریں شفقت و دل جوئی سے پوچھا  کہتے ہوئے رُکتی ہو جسے بات ہے وہ کیا
بولیں کہ مرا بھائی بچھڑتا ہے وطن سے
ہے آپ کو علم اُن کو ہے جو ربط بہن سے

پیدا ہوئے جب سے رہے بھائی بہن اِک جا  بھیّا کو کسی حال میں میں نے نہیں چھوڑا
وہ چھوڑیں جو گھر دل مرا گھر میں نہ لگے گا  پر آپ ہیں بیمار تردّد کی ہے یہ جا
دل دو ہوں تو اِک آپ کو، اِک اُن کو کروں نذر
اِک دل ہے، سمجھ میں نہیں آتا، کسے دوں نذر

اس پاسِ تعلق پہ دل اُن کا اُمڈ آیا — پاس اور بھی کچھ ثانیِ زہراؑ کو بلایا
بستر سے بہ دقت سرِ بیمار اُٹھایا — فرمایا کہ میں نے دُرِ مقصود کو پایا
قرباں ابنِ عم ہو گُہرِ دیدۂ تر پہ
جاؤ بہ خوشی ساتھ برادر کے سفر پہ

اُٹھ اُٹھ کے جھکیں نظریں محبت کی غم آثار — کچھ بارِ حیا اور کچھ احسان کا تھا بار
آنکھوں کی خموشی نے کیا شکر کا اظہار — بولیں کہ نہ بھولوں گی کبھی آپ کا ایثار
اس حال میں صرف آپ کی خدمت ہے مرا فرض
وہ بولے امامت کی اطاعت ہے مرا فرض

ہوتا نہ میں بیمار تو ساتھ آپ بھی چلتا — کیا علم ابنِ عم کو ہے درپیش خطر کیا
بیٹوں کو بھی لے جاؤ کہ ہو کچھ تو سہارا — وقت آئے تو شبیرؑ پہ قرباں اُنھیں کرنا
جعفرؑ کے ہیں پوتے، یہ زمانے کو دکھا دیں
بازو ہی نہیں، سر بھی رہِ حق میں کٹا دیں

شوہر کے اس ایثار پہ زینبؑ ہوئیں گریاں — بولیں کہ جزا آپ کو دے خالقِ احساں
اس عشقِ ابنِ فاطمہؑ پر جاں مری قرباں — خالی نہ ہو دولت سے کبھی آپ کا داماں
رخصت ہوئیں شوہر سے تو پھر آنکھیں بھر آئیں
ساتھ عون و محمد کے برادر کے گھر آئیں

یاں عترتِ شبیر کا گھر زیر و زبر تھا — اطفال و زناں سب ہی کو سودائے سفر تھا
اسباب بندھا تھا تو کھلا دیدۂ تر تھا — صغرا کی جدائی کا ہر اِک دل پہ اثر تھا
بے ہوش کو کیا ہوش، اُجڑتا ہے بھرا گھر
نانا کے مدینے سے بچھڑتا ہے بھرا گھر

شب ڈھلنے کو آئی تو اُٹھے ڈیوڑھی سے سرور — تربت پہ حسنؑ کی گئے نیوڑھائے ہوئے سر
چُپ بیٹھے رہے دیر تلک فاتحہ پڑھ کر — تھی یادوں کے آئینوں میں تصویرِ برادر
لوٹ آیا تھا بچپن انھی یادوں میں سمٹ کر
شہ روئے بہت قبرِ برادر سے لپٹ کر

فرمایا کہ اے بھائی، ہوئی ختم رفاقت شبیر کو تم آج سفر کی دو اجازت
تم سے نہیں، ہے عمرِ گزشتہ سے یہ رخصت لوٹانے کو آیا ہوں میں یاروں کی امانت
بچّے ہیں تمھارے مرے ہمراہ سفر میں
لٹ جائے یہ دولت نہ کہیں دشتِ خطر میں

وعدہ ہے کہ قاسم کا رہوں گا میں نگہدار جب تک ہوں میں، چھوٹے پہ نہ آنچ آئے گی زنہار
ہاں، ہوگیا شبیر ہی گر بے کس و ناچار کھو کر اُنھیں جینے کا نہیں یہ جگر افگار
کھاتا ہوں قسم، بھابھی کی چادر جو چھنے گی
ساتھ اُن کے بری بانو بھی سر ننگے پھرے گی

پھر قبر پہ مادر کے گئے سیّدِ ذی جاہ بالیں پہ جلایا جو دیا، دل سے اُٹھی آہ
گُل رکھتے جو تربت پہ اُڑا رنگِ رُخِ شاہ فرمایا کہ روشن رکھے اس شمع کو اللہ
آئے گا نہ اب شمع جلانے کو بھی شبیر
ترسے گا یہاں پھول چڑھانے کو بھی شبیر

گو اپنے ارادے سے ہوں میں شہر بدر آج درپیش ہیں حالات ہی کچھ ایسے مگر آج
کل تک نہ رہے گا، ہے اگر دوش پہ سر آج مجبور ہوں میں چھوڑنے پر آپ کا گھر آج
پیاری مجھے جاں آپ کی تربت سے نہیں ہے
پر راہِ مفر نانا کی امت سے نہیں ہے

عمّال خلیفہ کے مجھے تنگ کریں گے میں چاہوں نہ چاہوں وہ مجھے یاں رہنے نہ دیں گے
بیعت طلبی کے لیے سو ہاتھ بڑھیں گے یا قتل کی سازش کے لیے دام بچھیں گے
ڈر ہے کہیں شعلوں میں مدینہ نہ لپٹ جائے
کٹتا ہے گلا میرا تو صحرا ہی میں کٹ جائے

جب آپ ہوئیں فوت تو بچپن تھا ہمارا مادر کے بچھڑنے سے ہوئے قلب دو پارا
روئے تھے جو ہم لاش پہ، ہے یاد نظارا اُس وقت تو اتنا تھا حسین آپ کا پیارا
ہاتھ آپ نے پھیلا دیے تھے زیرِ کفن سے
لپٹایا تھا روتے ہوئے بیٹے کو بدن سے

کیا ہو گیا اب، جاتے ہیں ہم، آپ ہیں خاموش        دیوار و در و بام ہیں ظلمت میں سیہ پوش
کرنا ہے سفر ہی میں ہمیں جامِ قضا نوش        آتا نہیں کیوں مامتا کو ماں کی بھی اب جوش
یاں ماں سے گلہ کرنے میں آنسو نکل آئے
واں سیّدہ کی قبر سے بازو نکل آئے

آواز اِک آئی، مرے سینے سے لپٹ جا        اے نورِ چراغِ لحدِ فاطمہ زہرا
تو رویا تو پھٹ جائے گا مادر کا کلیجا        شق ہوگی لحد نانا کی اور عرش خدا کا
بیٹا میں ترے ساتھ بہر گام رہوں گی
سوئے گا تو، میں خیموں کے اطراف پھروں گی

سرور کو دیا قربتِ مادر نے سہارا        یہ جان گئے، اب بھی حسینؑ اُن کو ہے پیارا
غش سے جو کھلی آنکھ تو پھر ماں کو پکارا        روضے کی اُداسی سے ہوا قلب دوپارا
زہراؑ کی صدا آئی، خدا حافظ و ناصر
اے نانا کے شیدائی خدا حافظ و ناصر

بعد اس کے جو منزل تھی سفر کی وہ کڑی تھی        صغرا سے جدائی کی سناں دل میں اڑی تھی
دیکھا جو فلک کو، ابھی رات آدھی پڑی تھی        نانا سے یہ شبیر کے ملنے کی گھڑی تھی
دھیان آیا محمدؐ کا تو بچپن پلٹ آیا
طفلی کا ہر اِک لمحہ نظر میں سمٹ آیا

تاریکی میں کچھ گام چلے تھے شہہِ والا        آنکھوں کو نظر آنے لگا گنبدِ خضرا
روشن تھا اندھیرے میں ہدایت کا منارا        خورشیدِ نبوّت ہی نے خود رستہ دکھایا
روضے کے دیے راہ نمائی کے لیے تھے
بے تاب نبیؐ خود بھی فدائی کے لیے تھے

شبیرؑ نے دروازے پہ دی جھک کے سلامی        فرمایا درود آپ پہ اے جدِّ گرامی
درپے ہیں مجھے شہر بدر کرنے کو شامی        چھٹتی ہے حضور آپ کے روضے کی غلامی
اے رحمتِ کونینؐ! خطا میری بحِل ہو
ایسا نہ ہو سرکار سے شبیر خجل ہو

جس خامے نے لکھا دلِ سرکار پہ "اقرا" میں بعدِ حسنؑ اُس کا نگہدار تھا نانا
اب مصحفِ ناطق سے ہے گونگوں کا تقاضا بیعت کرے ظالم کی قلم مرضیِ حق کا

تابندہ ہیں لوح و قلمِ عرش بھی ہم سے
دینا ہے ثبوت اس کا شہادت کے قلم سے

اب بھی قلمِ حق پہ اگر حرف نہ آتا میں چھوڑ کے سرکار کے روضے کو نہ جاتا
ہوتا نہ اگر آپ کے قرآں سے ناتا آوارہ وطن ہوتا نہ جنگل کو بساتا

میرے لیے گو مُلکِ عدم کا یہ سفر ہے
اوراقِ شہادت پہ قلم کا یہ سفر ہے

میرے لیے کعبے میں بھی مفقود اماں ہے اے باعثِ تخلیق! بہت تنگ جہاں ہے
ہر راہ میں اِک لشکرِ شمشیر و سناں ہے ہر موڑ پہ اِک آگ کا دریا سا رواں ہے

امیدوں کی شاخوں کے ثمر بھی ہیں سم آلود
گلزارِ شہادت کی ہوا بھی ہے غم آلود

پیاں شکنی وعدۂ نصرت میں ڈھلے گی اشجار کے سایے سے بھی تلوار اُٹھے گی
زرخیز زمینوں میں فقط بھوک اُگے گی دریاؤں کی سوجوں سے مجھے پیاس ملے گی

امت مجھے دے گی کلمہ خوانی کا دھوکا
دانستہ مجھے کھانا ہے مہمانی کا دھوکا

اے سرورِ عالم! ہے نواسے پہ جہاں تنگ تعمیلِ جہالت قلمِ علم کا ہے ننگ
خواہانِ خراجِ امن کے کعبے سے ہے اب جنگ نغماتِ وحی شور و شغب سے ہیں بد آہنگ

پاؤں جو شہادت کی رضا، یاں سے چلا جاؤں
ورنہ یہ لحد شق ہو تو میں اس میں سما جاؤں

نانا سے ابھی کرتے تھے شبیرؑ یہ باتیں جاگے ہوئے تھے، بند ہوئیں نیند سے آنکھیں
دیکھا کہ کھلے عرش کے در، چمکیں شعاعیں روشن ہوئیں انوار کی آمد سے فضائیں

اِک سمت پرے اُترے رسولانِ سلف کے
حاجب ہوئے جبریلِ امیں بابِ شرف کے

تربت سے برآمد ہوئے سرکارِ دوعالم　　جبریل نے نعلین کی بوسے لیے پیہم
پیغمبروں کے سر پے تسلیم ہوئے خم　　تھامے ہوئے تھیں سیدۂ دہرؑ کو مریمؑ
اک پہلو میں شمشیر بکف شیرِ خداؑ تھے
اور دوسری جانب حسنؑ سبز قبا تھے
تعظیم بزرگاں کو جھکے حضرتِ شبیرؑ　　لینے کے لیے بوسہ بڑھی صاحب تطہیرؑ
دی دستِ ید اللہ نے مظلوم کو شمشیر　　خود چاک حسنؑ نے کی صلح نامے کی تحریر
بیٹے کو کلیجے سے محمدؐ نے لگایا
سینے سے رسولانِ اب و جد نے لگایا
جبریل نے شبیر کا کیا فرق پہ سایا　　ہر ایک ملک سجدۂ تعظیم کو آیا
موقع جو تکلم کا براہیم نے پایا　　خود ترجمۂ ذبحِ عظیم اُن کو سنایا
بوسہ لیا گردن کا ذبیحِ رہِ حق نے
کی نذر صلیب اپنی مسیحِ رہِ حق نے
فرمایا محمدؐ نے کہ اے نائبِ حیدر　　محزوں نہ ہو، ہے ساتھ ترے مرضیِ داور
ہیں تیری جلوداری کو تیار پیمبر　　شاہی کا تری چتر ہے جبریل کا شہپر
دو دن کو ہے سردار یزید اہلِ جفا کا
سالار ہے تو تا ابد اربابِ وفا کا
ہے نفس ترا مطمئن اے بندۂ شاکر　　تو منزلِ تسلیم و رضا کا ہے مسافر
کیا تیرا بگاڑے گا کوئی جابر و قاہر　　چل راہِ شہادت کے سفر پہ مرے صابر
ہر گام ابد ہے ترا، ہر سانس صدی ہے
قدموں سے ترے لپٹی حیاتِ ابدی ہے
پامال بھی تو ہوگا تو ممتاز رہے گا　　نیزے پہ بھی سر تیرا سرافراز رہے گا
چپ ہو کے بھی تو صدق کی آواز رہے گا　　تا حشر ترے نطق کا در باز رہے گا
کٹ کر ترا سر سورۂ کہف کا جو پڑھے گا
کہتے ہیں کہ مصحفِ ناطق، یہ کھلے گا۔

ہوں میں بھی، ہے تصویرِ پیمبر بھی ترے ساتھ عباس کے پیکر میں ہیں حیدر بھی ترے ساتھ
ہے ثانیِ زہرا تو ہے مادر بھی ترے ساتھ قالب میں ہے قاسم کے برادر بھی ترے ساتھ
تیرا یہ سفر بھی مری ہجرت کی ہے تکمیل
اور تیری شہادت مری بعثت کی ہے تکمیل

فرما کے یہ خاموش ہوئے سرورِ اکرم بوسے لیے ماں نے لب وحلقوم کے پیہم
حیدر نے کیا سینے پہ خود نادِ علی دم تھا دیدنی بھائی کی بغل گیری کا عالم
سوئے تو پریشان تھا دل، روح غمیں تھی
آنکھیں جو کھلیں خواب سے تشویش نہیں تھی

آتے ہوئے روضے سے ہوئی پھر سے زیارت حاصل تھا سکوں دل کو تو تھی روح کو راحت
نانا سے چلے لے کے سفر کی جو اجازت دیکھا کہ فلک سے ہے شبِ تار کی رخصت
نجمِ سحری ٹپکا اُدھر دیدۂ شب سے
کرنوں نے کیا شہ کو سلام آ کے ادب سے

یاں ڈیوڑھی پہ رخصت کے لیے جمع تھے احباب واں گھر میں تھیں حضرت کے لیے بیبیاں بیتاب
خدام نے رکھوادیا تھا اونٹوں پہ اسباب تھے منتظرِ حکم سفر شاہ کے اصحاب
ناقے درِ دولت پہ سبک گام کھڑے تھے
پردے کئی ہر ایک عماری پہ پڑے تھے

اک سمت فرس زینوں رکابوں سے سجے تھے اک سمت جوانانِ مسلح کے پرے تھے
جانا تھا سفر پر جنھیں خاموش کھڑے تھے کرنے جو وداع آئے تھے رُخ ان کے سُتے تھے
ویرانی برستی تھی مدینے کے گھروں پر
تھیں عورتیں مغموم کھڑی اپنے دروں پر

ہم درسوں سے ملنے کو چلے آتے تھے اطفال تر آنسوؤں سے ہو گئے تھے بوڑھوں کے رومال
فرقت میں تھا اکبر کی جوانوں کا بُرا حال عباس کے احباب کا دل غم سے تھا پامال
ہم جولیوں پر عون و محمد کے تعب تھا
یاروں کے لیے چھوٹنا قاسم کا غضب تھا

وہ کون سا گھر تھا کہ جہاں پہ نہ تھا کہرام　　ہر کوچے میں ہر راہ میں تھا منظرِ غم عام
تھا شہرِ رسالت میں قیامت کا وہ ہنگام　　جیسے ہوئے فوت آج ہی پیغمبرِ اسلام
کچھ روتے تھے، کچھ پیٹتے تھے اپنے سروں کو
سب گھیرے ہوئے تھے بنی ہاشم کے گھروں کو

اس حال میں یاد آ گئی شبیر کو صغرا　　اک بار بہت زور سے دل سینے میں دھڑکا
جو صبر و سکوں روضۂ احمد سے ملا تھا　　محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے لوٹا
دیکھا جسے وہ مضطر و حیراں نظر آیا
آباد گھر اس وقت بیاباں نظر آیا

جس بی بی سے پوچھا کہ ہے کیا حالتِ صغرا　　منہ پھیر کے آنچل میں چھپاتی تھی وہ چہرا
تھا حجرۂ صغرا پہ ہجوم آلِ عبا کا　　بیمار تھی بے ہوش، عزیزوں کو تھا سکتا
تھا گود میں سر بانو کے، کلثوم کھڑی تھیں
زینب کے قریں خواہرِ مغموم کھڑی تھیں

دیکھا جو حسین آتے ہیں تو راہ دی سب نے　　آداب کیے جھک کے اسیرانِ تعب نے
لفظوں میں تو کچھ بھی نہ کہا بانو کے لب نے　　پر کہہ دیا چپ رہ کے بھی سب چشمِ ادب نے
شہ سمجھے سفر کے لیے تیار نہیں ہے
ماں بیٹی سے چھٹنے کی روادار نہیں ہے

خاموش کھڑے ہو گئے بیٹی کے سرہانے　　کرسی رکھی سرور کے لیے پاسِ وفا نے
بچوں کو مسہری سے لگے لوگ ہٹانے　　مجمع جو چھٹا، آنے کی رہ پائی ہوا نے
کمرے کی گھٹن کم ہوئی جھونکوں سے ہوا کے
رنگ آنے لگا چہرے پہ بیمارِ بلا کے

خوشبو بنِ زہرا کی جو بیمار تک آئی　　الجھی ہوئی سانسوں کی ہوئی گرہ کشائی
کھلنے کی سکت نرگسِ بیمار نے پائی　　تکنے لگی منہ باپ کا شبیر کی جائی
پوچھا بنِ زہرا نے، یہ کیا حال ہوا ہے
وہ بولی، مسیحا مجھے خود بھول گیا ہے

شہ بولے کہ میں کل سے ہوں سامانِ سفر میں　　آیا بھی تو اِک پل کے لیے آیا تھا گھر میں
تو پھر بھی خلش بن کے رہی قلبِ پدر میں　　پھرتی رہی صورت تری ہر وقت نظر میں
ہر ایک سے پوچھا مری صغرا کا ہے کیا حال
جو ملنے کو آیا، اسے بتلایا ترا حال
وہ بولی، اگر آپ کو اتنا ہے مرا دھیان　　لے چلتے نہیں ساتھ مجھے کیوں شہِ ذی شان
میں رات سے رو رو کے ہوئی جاتی ہوں ہلکان　　بعد آپ کے گھر ہے مجھے تنہائی کا زندان
بے جرم سزا مجھ کو امام آپ نہ دیجے
بیٹی کو غمِ حبسِ دوام آپ نہ دیجے
شبیر نے فرمایا، نہ رو اے مری خوش ذات　　کیا جرم، سزا کیسی، تم ایسی نہ کرو بات
صحت سے جو تم ہوتیں تو لے چلتے تمہیں ساتھ　　آفت کا سفر اور مصیبت کے ہیں دن رات
آرام سے ہو، پھر بھی نقاہت ہے تمہیں یاں
گھر میں رہو کچھ روز کہ راحت ہے تمہیں یاں
وہ بولی کہ راحت نہیں، تنہائی ہے آفت　　ماں باپ بہن بھائی سے چھٹنا ہے مصیبت
اپنوں کو نہیں فکر کہ ہے کیا مری حالت　　پھر غیروں سے کیوں کیجیے اُمّیدِ عیادت
بچے بھی، بڑے بھی ہیں خوش اسبابِ سفر میں
رکھوالی کو کیا میں ہی تھی اِک آپ کے گھر میں
در پیش سفر میں ہے اگر آپ کو خطرہ　　کم سن ہیں جو کیوں ان کو لیے جاتا ہے کنبہ
اصغر کو خدا رکھے، ہے کچھ روز کا بچّہ　　جھونکا بھی جو گرم آئے تو کُھلا تا ہے غنچہ
کیا اِن کی نہیں، صرف مری جان ہے پیاری
کیوں آپ کو صغرا ہی، میں قربان، ہے پیاری
بچے رہیں گھر میں تو بہلتی ہے طبیعت　　ساتھ اُن کے سفر میں نہیں رکھنے کی ضرورت
ماؤں کو نہیں، مجھ کو ہے بچوں کی ضرورت　　معصوموں کی صحبت میں سنبھل جائے گی صحت
ساتھ اپنے سفر میں نہ مجھے لیجیے بابا
بچوں کو میں رکھ لوں، یہ رضا دیجیے بابا

بانو نے کہا، تم تو ہو بیمار مری جان　　بچوں کی نگہ داشت میں ہو جاؤ گی ہلکان
اچھوں کے بگڑ جاتے ہیں اس کام میں اوسان　　ماؤں سے الگ بچوں کا رہنا نہیں آسان
بیٹی وہ کرو بات، جو قابل ہو عمل کے
اٹھنا تمھیں دو بھر ہے، ذرا دیکھو تو چل کے

صغرا نے مچلتے ہوئے کی ماں سے یہ فریاد　　سب جاتے ہیں، گھر میں اکیلی رہے ناشاد
گھر کی طرح خالی رہے میرا دلِ برباد　　سب بھولیں مجھے، سب کو اکیلی میں کروں یاد
تم سے گلہ کیا کہ وہ پُرسش کو نہ آئے
اکبر بھی تو خواہر کی سفارش کو نہ آئے

اک گوشے میں اکبر تھے کھڑے سر کو جھکائے　　فرمایا بہن! بھائی تجھے کیسے منائے
ہو جاؤ تم اچھی، وہ دن اللہ دکھائے　　صحت کی خبر سنتے ہی سمجھو کہ ہم آئے
صغرا نے کہا بھائی سے جو آپ کی مرضی
خم ہے سرِ تسلیم جو ماں باپ کی مرضی

عباس نے بڑھ کر یہ کہا، مجھ سے خفا ہو　　رُک جاؤں تمہارے لیے میں، تم جو یہ چاہو
پر کیسے غلام اپنے مربی سے جدا ہو　　کیا جانیے در پیش سفر میں انھیں کیا ہو
وہ بولی کہ حق آپ پہ بابا کا سوا ہے
ساتھ اُن کے سدا آپ رہیں، میری دعا ہے

لپٹا کے کہا بانو نے، اچھی مری بچی　　جب مان گئی بات تو کیوں روتی ہو بیٹی
پونچھ اشک، دوا پی لے، بندھی ہے تری ہچکی　　وعدہ ہے تجھے لینے کو جلد آئے گا بھائی
خیمے جو سفر میں کہیں استاد کریں گے
کنبے کے سب افراد تجھے یاد کریں گے

شبیر نے آغوش میں بیٹی کو اٹھایا　　صحت کی دُعا دے کے، کلیجے سے لگایا
بُلوانے کا وعدہ جو کیا دل اُمڈ آیا　　پلکوں پہ لرزتے ہوئے اشکوں کو چھپایا
صغرا کو نظر آئے جو شبیر کے آنسو
روکا بھی تو بہنے لگے دلگیر کے آنسو

عابد کی طرف دیکھ کے صغرا ہوئی گریاں    سجاد یہ بولے کہ بہن ہو نہ پریشاں
ہم اوروں کی جانب سے تو کرتے نہیں پیاں    آئے کہ نہ آئے کوئی لینے کو تجھے یاں
ملنے کے لیے تجھ سے ضرور آئے گا سجاد
پیاروں کی خبر تیرے لیے لائے گا سجاد

شبیر نے آواز دی، ہر اک اِدھر آئے    جائے نہ وہ صغرا سے اجازت جو نہ پائے
بے اس سے ملے گھر سے نہ باہر کوئی جائے    قاسم سے کہو آکے بہن کو وہ منائے
آداب کیا عون و محمد نے بہن کو
سب بیبیوں نے چوما گرفتارِ محن کو

جب آکے بغل گیر ہوئی اُس سے سکینہ    کچھ بات تھی، صغرا کا جو پھٹنے لگا سینہ
پھوپھیوں سے ملی دخترِ سلطانِ مدینہ    مادر کی دعاؤں میں تھا رونے کا قرینہ
صغرا نے لیا گود میں اصغر کو لپک کر
پھیلا دیے معصوم نے ہاتھ اپنے ہمک کر

صغرا نے کہا ماں سے کہ اصغر ہیں ہمارے    اب جس کا ارادہ ہو سفر کا، وہ سدھارے
جائیں گے نہ یہ کوئی انھیں لاکھ پکارے    اب میرے بن کے رہیں گے یہ مری آنکھوں کے تارے
رو رو کے تھے حیران کیے دیر سے ماں کو
گودی میں بہن کی ہے سکوں بھائی کی جاں کو

ہنستی تھی کبھی چھو کے بہن بھائی کے لب کو    روتی تھی کبھی چوم کے عارض کے عنب کو
اصغر بھی ہنسے جاتے تھے بھولے ہوئے سب کو    حیرت میں تھی ماں، فکر تھی سلطانِ عرب کو
شبیر نے فرمایا کہ دھوپ آ گئی در تک
ہووے نہ کہیں دوپہر آغازِ سفر تک

بہنوں نے بلایا، مگر آئے نہیں اصغر    پھوپھیوں نے پکارا تو نہ دیکھا بھی پلٹ کر
ہمکے نہیں، دکھلائے سکینہ نے جو گوہر    سو طرح بُلا کر اُنھیں خود تھک گئی مادر
پھیلاتا کوئی ہاتھ تو چلاتے تھے اصغر
صغرا سے ہر اک بار لپٹ جاتے تھے اصغر

کوشش ہوئی اصغر کو بُلانے کی کئی بار — صغرا کا تھا ہر چھوٹے بڑے سے یہی اصرار
جائیں یہ خوشی سے تو ہوں میں دینے کو تیار — پر جانے نہ دوں گی انھیں روتے ہوئے زنہار
ناکام کیا بچے نے ہر ایک جتن کو
چھوڑا نہ کسی طرح سے بیمار بہن کو

آخر گئے خود بیٹی کی جانب شہِ جواد — جیسے کوئی بھولی ہوئی بات آئی انھیں یاد
جھک کر کیا معصوم سے کچھ زیرِ لب ارشاد — کیا جانے ہوا کیا اثرِ نطقِ خداداد
معصوم نے دیکھا رُخِ ہمشیر کی جانب
پھیلا دیا پھر ہاتھوں کو شبیر کی جانب

شبیر نے نادان کو گودی میں اُٹھایا — روتی ہوئی بیٹی کو کلیجے سے لگایا
بانو کی طرف بچے کو سرور نے بڑھایا — صغرا کے رواں اشکوں کا طوفاں اُٹھ آیا
سب بولے کہ رخصت ہوئے اصغر بھی بہن سے
سمجھو کہ روانہ ہوئے شبیر وطن سے

لے جا کے الگ بھائی سے زینب نے یہ پوچھا — اصغر سے کہا آپ نے، اے سیّد والا
مولا نے کہا سر کو جھکا کر، یہ کہا تھا — اصغر تمھیں حق پیارا ہے یا پیاری ہے صغرا
کیا حق کے لیے باپ کی نصرت نہ کروگے
کیا ظلم سے تم آخری حجت نہ کروگے

شہزادوں نے ماؤں کو عماری میں بٹھایا — عباس نے زینب پہ کیا چتر کا سایا
اکبر نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا — محمل میں انھیں خود بنِ زہرا نے چڑھایا
گھوڑوں پہ سوار اہلِ وفا نکلے سفر پر
بیمار کھڑی رہ گئی ویرانے کے در پر

سرور کو گھر اللہ کا بھی راس نہ آیا — خط کوفیوں نے لکھ کے شہِ دیں کو بُلایا
خیلِ شہدا نے قدمِ شوق بڑھایا — آرام نہ رستے میں نہ منزل ہی پہ سایا
آخر کو ہوئے خیمے بپا دشتِ جفا میں
شبیر ہمیشہ کو بسے کرب و بلا میں

عاشور کو کٹوا دیے سر بندگیوں نے　　ایماں کو دیا آبِ بقا تشنگیوں نے
دی موت کو جینے کو سند زندگیوں نے　　قرآن پڑھا نیزوں پہ تابندگیوں نے
ہر سر نے قلم ہو کے وہ روداد رقم کی
ہے خاکِ شفا اب بھی قسم اُن کے قلم کی

خیموں میں لگی آگ، لٹی عترتِ اطہار　　سجاد ہوئے طوق و سلاسل میں گرفتار
زینب گئی سر کھولے سرِ کوچہٗ و بازار　　تھیں بانو و کلثوم کھلے مُنہ سرِ دربار
زنداں میں ہوئیں ختم حدیں جور و جفا کی
اِس قید میں آخر کو سکینہ نے قضا کی

زنداں میں گذرے جو اسیروں کو کئی ماہ　　آثارِ بغاوت سے ڈرا شر کا شہنشاہ
غرقِ اشکوں کے طوفاں میں تھے تخت وحشم وجاہ　　ظالم نے رہائی کی نکالی کہیں تب راہ
اس بار کیا ظلم نے سامان سفر کا
لکھا قلمِ جبر نے عنوان سفر کا

یاں شہرِ رسالت میں پریشان تھی صغرا　　صحت ہوئے اِک سال سے زائد اُسے گزرا
لِکھ لِکھ کے خط اکبر کو کئی مرتبہ بھیجا　　نامے کیے شبیر کی خدمت میں روانا
بے تاب رہی وہ کوئی لینے کو نہ آیا
کوئی بھی خبر کنبے کی دینے کو نہ آیا

پل گنتے کٹے ماہ، بدلتے رہے موسم　　تھا مادرِ عباس کو اندیشہٗ مبہم
کیا جانیے کس حال میں ہوں سرورِ عالم　　ہیں قید میں یا قتل ہوئے سیدِ اکرم
روز ایک قیامت سی بپا ہوتی تھی دل میں
صغرا سے تو کہہ سکتی نہ تھی، روتی تھی دل میں

اک روز وہ دونوں درِ خانہ پہ کھڑی تھیں　　رونے کی کچھ آوازیں درِ شہر سے آئیں
تھا کیا اثر آوازوں میں، دونوں لرز اُٹھیں　　ڈر کر کسی رہ گیر سے گھبرا کے یہ بولیں
روضے پہ محمدؐ کے بکا کرتا ہے کوئی
ماتم کسی مظلوم کا کیا کرتا ہے کوئی

اس نے کہا، کرتا تھا منادی ابھی اعلاں　　لوٹے ہیں سفر سے حرمِ سیدِ ذی شاں
ہیں شہر سے باہر ابھی خیموں میں وہ مہماں　　جو چاہے ملے جا کے، یہ حاکم کا ہے فرماں
اشک آنکھوں سے صغرا کے بہے فرطِ خوشی سے
ملتی تھی گلے مادرِ عباسِ علی سے

بولی کہ مبارک ہو تمہارے پسر آئے　　سر کر کے مہم خیر سے میرے پدر آئے
جن کے لیے آنکھوں میں کٹی عمر، گھر آئے　　قائم ہے جہاں جن سے، وہ خیرِ بشر آئے
بینا پے دیدارِ مسیحا ہیں یہ آنکھیں
بے تابِ قدم بوسیِ مولا ہیں یہ آنکھیں

صغرا نے لیا مادرِ عباس کو ہمراہ　　تھیں پردہ نشیں شہر کی راہوں سے نہ آگاہ
ایک ایک سے وہ پوچھ کے طے کرتی رہیں راہ　　آخر کو نظر آئے خیامِ شہِ ذی جاہ
اک خیمے کے دروازے پہ اِک کُرسی پڑی تھی
چاروں طرف اُس خیمے کے اک بھیڑ لگی تھی

صغرا جو گئی پاس تو دیکھا بہ دلِ زار　　کُرسی پہ ہے اک شخص بہت لاغر و بیمار
شانوں پہ نشاں نیل کے، زخموں کے ہیں آثار　　گردن میں ہے تکلیف سے خم، سینہ ہے افگار
تھے خال و خط ایسے کہ کہیں دیکھا ہو جیسے
ڈھب چہرے کا سجاد سے کچھ ملتا ہو جیسے

صغرا نے کیا جا کے سلام اُس کو بصد درد　　اُس نے اِنھیں دیکھا تو ہوا اور بھی رُخ زرد
نعلین و عبا پر تھی بیاباں کی جمی گرد　　کُرسی سے اُٹھا صبر کے میدان کا پامرد
فرمایا، برادر کو نہیں جانتیں صغرا؟
کیا تم بھی مجھے اب نہیں پہچانتیں صغرا؟

صغرا نے گلے لگ کے کہا، خیر ہے بھیا؟　　کیا آپ بہت دن رہے بیمار، ہوا کیا؟
یہ رِستا ہوا زخم کلائی پہ ہے کیسا؟　　گردن میں گلوبند ہے کس واسطے باندھا؟
سجاد نے فرمایا، یہ روداد تعب ہے
تفصیل نہ پوچھو کہ ہر اک بات غضب ہے

گھبرا کے وہ بولی، ہیں کہاں قاسمِ خوشتر؟ عمو ہیں کہاں، اور کہاں اُن کے برادر؟
عون اور محمد مرے بھائی ہیں کہاں پر؟ کس گوشے میں روپوش ہیں وعدہ شکن اکبر؟
کس خیمے میں ہیں، کیوں نظر آتے نہیں بابا؟
کیا بات ہے، کیوں اب بھی گھر آتے نہیں بابا؟
وہ بولے تعجب سے، یہ کیا کہتی ہو صغرا جو گذری، نہیں علم کچھ اس کا تمھیں اصلا
تم بے خبر اور دہر میں ہوتا رہا چرچا ہر لب پہ ہے مظلومیِ سرور کا فسانا
وہ بولی، مجھے خط بھی تو لکھا نہ کسی نے
آئی ہو خبر بھی تو بتایا نہ کسی نے
سوچا کیا لپٹا ہوا صغرا سے برادر کیسے کہوں اس سے کہ لُٹا فاطمہ کا گھر
ہیں عون و محمد نہ ہیں عباسِ غضنفر قاسم ہوئے پامال، چھدا سینۂ اکبر
کس طرح سے اِک ساتھ یہ غم اتنے سہے گی
مرنے کی بھرے گھر کے خبر کیسے سُنے گی
بس اتنا کہا، پوچھ رہی ہو جنھیں صغرا ان میں سے مدینے کوئی واپس نہیں آیا
گھر لُٹ گیا آباد ہوا دشت قضا کا اک روز میں برباد ہوا گلشنِ زہرا
سینے میں لیے دولتِ غم آئے ہیں تنہا
ہمراہِ حرم لوٹ کے ہم آئے ہیں تنہا
پیاروں پہ بھرے پیار خداوند کو آیا جو چاہتے تھے تم کو، اُنھیں رب نے بُلایا
اکبر نے شہادت کو دلہن اپنی بنایا گھر قاسم و عباس نے جنگل میں بسایا
عون اور محمد بھی جواں ہونے نہ پائے
شبیر کسی پیارے کو بھی رونے نہ پائے
زخموں سے، غموں سے ہوئے مجروح جو بابا جلاد نے سر سجدے میں ان کا بھی اُتارا
بیمار تھا میں، خیموں کو اشرار نے لوٹا اک سال سے زائد ہمیں زنداں میں گزرا
آزاد جو ہوتے، نہ بُلاتے تمھیں بی بی
اکبر جو نہیں، لینے ہم آتے تمھیں بی بی

سجاد کی باہوں سے گری کانپ کے خواہر      سُن کر خبرِ آمدِ صغرا ہوا محشر
سجاد اُسے لے گئے خیمے میں اُٹھا کر      زانو پہ لِٹا کر اُسے رونے لگی مادر
سب جمع ہوئے ملنے کو اکبر کی بہن سے
بیمار کو ہوش آیا ہزاروں ہی جتن سے

آنکھیں جو کھلیں، تکتی تھی ایک ایک کا چہرا      آنسو تھے نہ فریاد نہ آہیں تھیں نہ شکوا
اک ساتھ غم اتنے جو ملے ہو گیا سکتا      ماں نے کہا، کیوں چپ ہو کہو حال تو اپنا
وہ بولی کہ اماں مجھے اصغر سے ملا دو
سورج تو ہوئے گُم، مہِ نو مجھ کو دکھا دو

معصوم کا نام آتے ہی سینوں میں اُٹھا جوش      مادر نے کیا ضبط، رہیں بیبیاں خاموش
ہر سمت سے مایوس پھری چشمِ گہر کوش      تھی گو ہر مقصود سے خالی ہر اک آغوش
وہ بولی کہ گُل گشت کو باہر گئے ہوں گے
ہمراہ سکینہ مرے اصغر گئے ہوں گے

زینب نے سکینہ کا سُنا نام تو روئیں      صغرا کے قریب آ کے محبت سے یہ بولیں
پوچھو نہ سکینہ کو، وہ محبوبِ پدر تھیں      ضد کر کے وہ شبیر سے ملنے کو سدھاریں
ہم سے تھی عزیز اُن کو رفاقت شہِ دیں کی
گُل گشت کو نکلی ہیں وہ فردوسِ بریں کی

یارا نہ رہا صبر کا، کہنے لگیں صغرا      دولہا بنے اکبر مجھے سہرا نہ دکھایا
قاسم کا ہوا عقد، چچی نے نہ بُلایا      رخصت ہوئی خواہر، مجھے پرچہ بھی نہ بھیجا
اب کم سے کم اصغر سے مجھے آپ ملا دیں
اُس گوہرِ گم گشتہ کا کچھ آپ پتا دیں

بانو ہوئیں بیٹی کے اِن الفاظ پہ گریاں      بولی رُخِ مادر کی طرف دیکھ کے حیراں
کیوں روتی ہو، ہو گا وہ کہیں پاس ہی اماں      جائے گا کہاں دور مرا اصغرِ ناداں
فضہ سے کہا، دیکھو، کہیں گر نہ پڑا ہو
رستے میں اکیلا کہیں روتا نہ کھڑا ہو

بانو نے کہا، فکر نہ اُس کی کرو صغرا اب اُس کی نگہدار ہیں خود فاطمہ زہرا
مدت ہوئی ماں بہنوں کی گودی سے وہ رُوٹھا آغوشِ زمیں کو اُسے خود باپ نے سونپا
آنکھوں میں پھرا کرتا ہے ٹھہرا ہوا جھولا
دل کو کھ جلی ماں کا ہے اُجڑا ہوا جھولا
صغرا نے عجب یاس سے دیکھا سوئے مادر زینب کی طرف مُڑ کے یہ کہنے لگیں رو کر
رہتے جو مرے پاس، نہ مرتے ابھی اصغر گر جانتی بنتی میں ملے گا مرا گوہر
بابا بھی خفا ہوتے تو اصغر کو نہ دیتی
آغوش میں ماں کی بھی برادر کو نہ دیتی
رو رو کے میں ایک ایک سے کرتی رہی منت پر ساتھ مجھے رکھنے کو سب سمجھے مصیبت
پڑتے نہ وہ بیمار بھی، کرتی جو میں خدمت لو لگ گئی، تپ آئی، ہوئی کس طرح رحلت
رہتے جو مرے ساتھ، بلا آنے نہ دیتی
یوں ہاتھوں سے میں مُفت اُنھیں جانے نہ دیتی
کُبرا کا رچا بیاہ، میں کر پائی نہ شرکت دیکھی نہیں عمو کی علمداری کی شوکت
مرتے ہوئے اکبر نے بھی دکھلائی نہ صورت کر بھی نہ سکی باپ کے لاشے کی زیارت
کھوئے ہیں جو دُرہائے نجف پاؤ گی کیسے
اماں! مرا اصغر مجھے لوٹاؤ گی کیسے
ماں بولی کہ ہم کیا، ترے بابا بھی تھے مجبور کیا کرتے دوا، پانی بھی دینے سے تھے معذور
لاش، ایک کے بعد ایک، اٹھانے میں ہوئے چور بازو ہوئے شل، ٹوٹی کمر، آنکھیں تھیں بے نور
اُس وقت مدد کو اُنھیں اصغر نے بُلایا
دریا کو شہادت کے شناور نے بُلایا
آغوش میں شش ماہے کو حضرت نے اُٹھایا لو تیز تھی، دامانِ عبا اُن کو اُڑھایا
قتال کو مُرجھایا ہوا پھول دکھایا دریا طلب آب کو صحراؤں میں آیا
اک جام مگر وارثِ کوثر نے نہ پایا
اک قطرہ بھی خوں خواروں سے اصغر نے نہ پایا

غنچے کے لیے مانگتے تھے شہ ابھی پانی     جنگل سے چلا ظلم کے اک تیر بجوانی
وہ تیر تھا یا زہر لب شعلہ فشانی     لینے اُسے گردن پہ بڑھی غنچہ دہانی
ننھا سا دیا بجھ گیا جھونکے سے ہوا کے
ٹوٹے دل و بازو پسرِ دستِ خدا کے

سالارِ شہیداں اُنھیں خیمے میں جو لاتے     نہلا نہیں سکتے تھے تو ہم اشک بہاتے
خوں پونچھتے گردن سے، نئے کپڑے پنھاتے     اصغر کو کسی پھولوں کی وادی میں سُلاتے
روئے تھے نہ عباس نہ اکبر کے لیے شاہ
کہتے ہیں کہ روئے بہت اصغر کے لیے شاہ

پورا نہ ہوا پانی پلانے کا جو پیماں     خیمے میں بھی آئے نہ پلٹ کر شہِ ذی شاں
بے تاب رہی در پہ کھڑی عصر تلک ماں     اصغر کے لیے پیاسی سکینہ رہی گریاں
تا شام نہ شکل اصغر و شہ کی نظر آئی
آئی تو شہادت ہی کی آخر خبر آئی

جب بعد شہادت کے ہوئی ختم لڑائی     پیش آئی شہیدوں کے سر و تن میں جدائی
شکل اصغرِ معصوم نے یوں ماں کو دکھائی     نیزے پہ برے چاند کی صورت نظر آئی
ہر دم سفرِ شام میں ہمراہ رہے وہ
زندان میں بھی آئے تھے ملنے کے لیے وہ

جب بعد رہائی کے ملا رہنے کو اِک گھر     ٹوٹے ہوئے اسباب کے ساتھ آئے کٹے سر
تھا مہرِ امامت کے جلو میں برا اختر     تکتا رہا کھولے ہوئے آنکھیں رُخِ مادر
بالوں میں لہو، عارضوں پر گردِ سفر تھی
پھر بھی وہ ضیا تھی کہ چکاچوند نظر تھی

ہم کرتے ہوئے کرب و بلا تک سفر آئے     سر ماہِ بریدہ کا وہیں دفن کر آئے
"جب لیجیے نام اُس کا، وہیں چشم بھر آئے     یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے"
دکھلا کے جھلک وہ مہِ نو ڈوب گیا ہے
عکس اُس کا ہر اک نجمِ مژہ ڈھونڈ رہا ہے

دل کھول کے رو لو کہ ہے فطرت کا تقاضا　　وارث شہدا کے نہیں کرتے کبھی شکوا
غم رخصت سفر، صبر ہے سرمایہ عزا کا　　کونین ہیں بیعانہ شہیدوں کے لہو کا

ہے کاتب تقدیر جہاں خوں شہدا کا
یہ لکھتے ہیں جو، بنتا ہے وہ قلم خدا کا

ہے جن سے مشیت کا بھرم، یہ وہ قلم ہیں　　ہیں حافظ ناموس قلم، یہ وہ قلم ہیں
ہیں حق کے سرافراز علم، یہ وہ قلم ہیں　　ہیں آب بقا، ساغر جم، یہ وہ قلم ہیں

یہ چاہیں جدھر موڑ دیں عناں رخش زماں کی
کٹ کر بھی رقم کرتے ہیں تاریخ جہاں کی

قلمیں انہی خاموں کی قلم ہیں شعرا کے　　روشن ہیں دیے لفظوں میں خون شہدا کے
مصرعے نہیں فرمان ہیں یہ قدر و قضا کے　　اشعار نہیں، ترجمے ہیں حق کی رضا کے

یہ قدرت اظہار ودیعت ہے خدا کی
ہر لفظ وحید ایک امانت ہے خدا کی

(یکم اکتوبر 1978ء)

# شہادتِ نطق

(در حالِ شبیہ پیمبرؐ علی اکبر ابن الحسینؑ)

لب مصلحت کے بند ہیں، جرأت بیاں کی دے     یارب مری زبان کو قدرت بیاں کی دے
ہر لفظ جاگ اُٹھے، وہ کرامت بیاں کی دے     حاکم ہے کذب، مجھ کو صداقت بیاں کی دے
صاحب سخن کو تو یدِ بیضا بھی کر عطا
دی ہی زباں تو لبِ عیسیٰ بھی کر عطا

سنتا ہوں ایک عمر سے سناٹے کی فغاں     کب سے ہوں میں سکوت کے صحرا میں سرگراں
آغشتہ اپنے خوں میں ریا کشتہ نیکیاں     خاموشی کی صلیب پہ اصوات نیم جاں
کھلتا ہے لب تو ہوتا ہے بابِ حیات بند
کھولو گرہ جو کذب کی بابِ حیات بند

کہتے ہیں بزدلی کو مروّت، ریا کو دیں     خوف وخطا وکذب ہیں اخلاق کے امیں
حق گوئی شرعِ ظلم میں جائز کہیں نہیں     چہرے ہیں جرم وجور وجفا کے بہت حسیں
ساکت رہو تو عیشِ دو عالم کا در کھلے
اظہارِ شک کرو تو جہنم کا در کھلے

احسان ہے ترا جو کیا صاحبِ سخن — اے خالقِ کلام و کلیم! اے خدائے فن
تیری عطا ہے نطق، مُقِر ہیں لب و دہن — اے ناطقِ حقیقی و خلاقِ ذوالمِنن
میری زباں سدا سے نمک خوارِ نطق ہے
میں کیوں رہوں خموش، یہ انکارِ نطق ہے

لب تشنگی کی قبر ہے دریا سکوت کا — ستارِ جرم و جور ہے صحرا سکوت کا
نامنصفی کے تن پہ ہے چہرہ سکوت کا — جائے قیامِ ظلم ہے خیمہ سکوت کا
وہ نطق دے سکوت کا بھی دل دھڑک اُٹھے
موجِ سخن سے راکھ میں شعلہ بھڑک اُٹھے

نظروں میں گر کے اٹھنا مدارج میں ہے زیاں — یارب! نہ مدحِ ظلم سے آلودہ ہو زباں
حاصل ریا سے ہو جو فراغت تو تنگِ جاں — ملتی ہے پست ہو کے بلندی تو رائگاں
یارب! بجز سخن کوئی دولت نہیں قبول
قیمت ہو مُہرِ لب کی تو جنت نہیں قبول

تمیزِ حسن و قبح مٹاتی ہے خامشی — عالم کو بیوقوف بناتی ہے خامشی
حکمت کو زہرِ جہل پلاتی ہے خامشی — خیر اور شر کا فرق اٹھاتی ہے خامشی
ہر اک شہیدِ ظلم شہیدِ سکوت ہے
ظالم ہے جس جگہ بھی، یزیدِ سکوت ہے

خوش ہو کے خوب سر کو ہلاتی ہے خامشی — جب احمقوں کی بزم میں جاتی ہے خامشی
بولے کوئی تو آنکھ دکھاتی ہے خامشی — مسند پہ بے زباں کو بٹھاتی ہے خامشی
حاکم ہے جبر و جور کے دربار میں سکوت
بکتا ہے خوب جھوٹ کے بازار میں سکوت

صدّقنا کہہ کے سچ کو دباؤ تو خوش سکوت — آمنّا کہہ کے سر کو جھکاؤ تو خوش سکوت
لفظوں میں مدعا کو چھپاؤ تو خوش سکوت — جھنڈے پہ جھوٹ کو جو چڑھاؤ تو خوش سکوت
خاموشی پہرے دار معانی کی قبر پر
رقصاں دھواں ہے شعلہ بیانی کی قبر پر

ہے خامشی میں جہل و حماقت کو عافیت　　چپ رہنے ہی میں خیر ہے کہتی ہے مصلحت
اہلِ ریا کی شرع میں حق گوئی معصیت　　جابر کے آگے خامشی سب سے بڑی صفت
ڈرتے ہیں جرم و کذب ہی چہرہ نمائی سے
خبث اور جہل کانپتے ہیں لب کشائی سے
کیوں چپ رہے نہ جھوٹ کے آگے پیمبراں　　گر خامشی شرافت و نیکی کا ہے نشاں
کیوں آگ سے نہ جھجکی براہیمؑ کی زباں　　فرعون کی خدائی تھی موسیٰؑ کو کیوں گراں
کیوں آج بھی صلیب محبت کی ہے زباں
کیوں آج بھی سکوت شقاوت کی ہے زباں
قرآں ہے نطق، نطق کا ہوتا تھا کیوں نزول؟　　کیوں گونگے بہرے بت تھے محمدؐ کو ناقبول؟
کیوں صلح کوش چپ نہیں ایمان کا اصول؟　　کیوں تھا سکوتِ جہل گزیدہ سے حق ملول؟
کیوں توڑی مہرِ خوف شہِ مشرقین نے؟
کیوں بیعتِ یزید نہ کرلی حسینؑ نے؟
قرآں ہے ان کا آج بھی ناطق جو حق نیوش　　قرآں بھی ان کے واسطے صامت جو خود خموش
قرآں ہے ان کا ہونٹوں پہ جو ہیں سحر بدوش　　قرآں ہے ان کا نیزوں پہ، جو ہیں اجل فروش
ناطق نہیں تو اہلِ سخن معتبر نہیں
نیزوں پہ بھی خموش شہیدوں کے سر نہیں
ہتلادے کون ہے ترا نائب زمین پر　　اے وہ کہ تیری ذات ہے میزانِ خیر و شر
یادہ کتاب خواں رہے کٹ کر بھی جن کے سر؟　　عاری زبان و لب سے یہ دوپا یہ جانور؟
نائب کیا سکوت کو تو نے زمین پر؟
یا نورِ رہبری ہے سخن کی جبین پر؟
گر صاحبِ کلام ہیں تیرے پیام بر　　گر ہے کلام تیری صفت اے کلام گر
گر ہیں ترے کلام کے محرم شجر، حجر　　گر ہیں ترے کلام کے آئینے خشک و تر
پھر ہے سکوت ہرزہ سرا کیوں جہان میں
کیوں حکمراں ہے تیرگی کون و مکان میں

کیوں خامشی کی زباں کو کیا دراز　　کیوں تو نے خامشی کے رنگ ہیں اتنے نظر نواز
کیوں خامشیوں کے ساز　　کیوں نغمگی پہ چھا گئے خامشیوں کے ساز
کیوں ہے سکوتِ جہل زمانے میں سرفراز

اہلِ سخن پہ کیسے ہوا حکمراں سکوت
کیا صبر و ضبطِ نطق کا ہے امتحاں سکوت

ظلمات، خوف، جہل، ریا، کذب، ظلم، نار　　ہے اک سکوت، روپ ہیں اس کے کئی ہزار
مکر و حسد، دغا و تشدد، صلیب و دار　　تیغ و سنان و تیر و تبر، قتل و سنگسار

جاگیر و تخت، منصب و انعام اسی کے روپ
کرسی پہ اکڑے بیٹھے ہیں سب خامشی کے روپ

کرسی ملے تو اندھا نظر سے ہو بہرہ مند　　کرسی پہ آ کے بیٹھے تو احمق ہے عقل مند
کرسی پہ چڑھ کے بونے ہیں دیوتاؤں سے بلند　　کرسی پہ آئے گونگا تو سب کی زباں ہو بند

کرسی ہی راہبر ہوسِ زر کی راہ میں
کرسی خدا سکوت کی اندھی نگاہ میں

ہر سمت دیکھتا ہوں خموشی کا شعبدہ　　اے خالقِ جماد و نبات، اے مرے خدا
کرتی ہے سر بلندوں کو پامال برملا　　کم ظرف ہے، دنی ہے یہ دنیائے بے حیا

سفلہ ہے، سفلہ پرور و ظالم نہاد ہے
بنیاد میں زمین کی شاید فساد ہے

ایک آدھ آدمی ہے کہیں ان کے درمیاں　　بالشتیوں کی اس نے بسائی ہیں بستیاں
سینے پہ آسمان کے چڑھتی ہیں پستیاں　　جس سے گریز کرتی ہیں جھوٹی بلندیاں

شمعوں کے سر پہ تیرگیِ دود حکمراں
ہستی کی مملکت میں ہے نابود حکمراں

دانش گہوں میں علم زبوں، جہل سرخرو　　ہے خامشی ہی قاسمِ دستارِ آبرو
تحقیقِ زندگی پہ ہیں مامور مردہ جو　　زخمِ خرد کو تیرہ دماغی کرے رفو

بے لب سکوت منتظمِ جامعات ہے
تقسیمِ عقل، عقل کے اندھوں کے ہاتھ ہے

زخموں کے پیرہن ہیں زباں پر سجے ہوئے ہیں لفظ کے کفن میں معانی چھپے ہوئے
افواجِ مصلحت کے ہیں نیزے تنے ہوئے ہیں کھوکھلی زبانوں کے چابک اٹھے ہوئے
دندانِ حرص و آز کے نرغے میں ہے زباں
پابند و خوار ظلم کے کونے میں ہے زباں
خورشیدِ صبح شام کی کالی گھٹاؤں میں سچ بے اماں مدینۂ حق کی فضاؤں میں
بیٹھی ہے جنگ امن کے کعبے کی چھاؤں میں بو خونِ عشق کی ہے ہوس کی ہواؤں میں
فرمانِ جبر ہے کہ نہ غم کو زباں ملے
پائے جو غم زباں تو نہ اس کو اماں ملے
جنگل میں شور وغل کے ہے گم صم نواگری آزادیٔ خیال کی قسمت ہے بے گھری
آوارہ دشتِ جہل میں علمِ پیمبری خار و خسِ سکوت سے الجھے سخن وری
خواہاں خراج کا لبِ اظہار سے سکوت
بیعت طلب ہے جرأتِ گفتار سے سکوت
قیّوم و حی و قادر و ناظم ہے تیری ذات اے وہ کہ تیرا لفظ ہے تخلیقِ کائنات
تیرے کلام ہی سے ثبات و تغیرات آئینے تیرے علم ونظر کے ہیں شش جہات
تیری ہی جوئے فیض ہے طبعِ رواں مری
ہے تجھ سے اذنِ نطق کی طالب زباں مری
در سے ترے غریب کو گنجِ سخن ملا تیری عطا کہ نطق کو لب اور دہن ملا
جو ہے مسیحِ لفظ و معانی، وہ فن ملا یہ لعلِ شب چراغ، یہ دُرِ عدن ملا
ہر لفظ میرا گوہرِ شہوار ہوگیا
تیرے کرم سے میں بھی گہربار ہوگیا
منصب ہو، اقتدار ہو، بے اعتبار ہے شاہنشہی ذلیل ہے، سرمایہ خوار ہے
جس بات پر بھی زعم ہو، نا پائیدار ہے طاقت ہے بے بساط تو زر بے وقار ہے
اک طرح کا دوام جو حاصل ہے، فن کو ہے
دنیا میں اعتبار میسّر سخن کو ہے

اک بحرِ بے کنار ہے ظلمات کا رواں سیلِ زماں کی راہ میں ہر شے ہے اک گماں
یہ نقطے اور کچھ نہیں، ہیں نطق کے نشاں ہاں، کچھ چراغ تیر رہے ہیں یہاں، وہاں
ابھرا سخن کا نقش، زمانہ سمٹ گیا
سیلِ زماں کلام کے رستے سے ہٹ گیا
معنیٰ ہے نور، لفظ سہارا ہے نور کا ہر روپ میں کلام منارا ہے نور کا
تیشہ ہے عشق، صوت شرارا ہے نور کا نغمہ ہے بحر، ساز کنارہ ہے نور کا
سارے فنون شاخیں ہیں مشکوٰتِ نور کی
سارے علوم شرح ہیں آیاتِ نور کی
ہر لفظ اک کلیدِ طلسمِ حیات ہے ہر لفظ اک سیاحتِ صحرائے ذات ہے
ہر لفظ اپنے آپ میں اک کائنات ہے ہر لفظ اک ثبوتِ شکستِ ممات ہے
ہر لفظ ایک عقدہ کشائی ہے نطق کی
ہر لفظ ایک چہرہ نمائی ہے نطق کی
اس موج روشنی سے بھڑکتی ہے تیرگی لفظوں پہ دسترس ہو تو چھٹتی ہے تیرگی
رستے سے اس کے خوف سے ہٹتی ہے تیرگی اس تیغ کا ہو وار تو کٹتی ہے تیرگی
لفظوں کا ہے سفر کہ چراغانِ نطق ہے
معنیٰ کا ہے نزول کہ بارانِ نطق ہے
ہے نطق وجد و کیف تو وحشت ہے خامشی ہے نطق حرفِ عشق تو نفرت ہے خامشی
فضل و شرف ہے نطق تو ذلّت ہے خامشی دریا دلی ہے نطق تو خسّت ہے خامشی
عرفانِ ذات، حق کی رسالت ہے ناطقہ
تکمیلِ آدمیت و نعمت ہے ناطقہ
ہے نطق طوُر اور خموشی حجاب ہے ہے نطق چہرہ اور خموشی نقاب ہے
ہے نطق سیلِ وقت، خموشی حباب ہے ہے نطق سلسبیل، خموشی سراب ہے
ظلماتِ خامشی میں پیمبر ہے ناطقہ
لب تشنگی میں ساقیٔ کوثر ہے ناطقہ

آیا ہے سخت وقت زباں پر، مدد کرو یا مصطفیٰؐ و ساقیِ کوثر! مدد کرو
الفاظ ہونے والے ہیں بے سر، مدد کرو قطعِ زباں کی فکر میں ہے شر، مدد کرو
جمہوریت میں بے سخنوں کو زباں ملی
لیکن کہیں نہ میری زباں کو اماں ملی
وجدان و کشف، جذبہ و الہام کی زباں یہ وہ زباں جو خاص کی اور عام کی زباں
تشکیک و دین، کفر اور اسلام کی زباں بانی گرو کی، ویدوں کے پیغام کی زباں
روشن خیالیوں سے بصارت اسے ملی
ذکرِ حبیبؐ حق سے طہارت اسے ملی
گنگ و جمن کی آبرو، توقیرِ گومتی یہ وہ زباں جو کوثر و تسنیم سے دُھلی
گوداوری، کرشنا کی اک موجِ عاشقی موسیٰ کا حسن، سندھ کی، راوی کی لاڈلی
ہنستا ہے اس کی آنکھوں میں مہتاب کاشمر
دیتی ہے بحرِ ہند کو یہ آب کاشمر
جمہوریت کی جان، اخوت کا نطق ہے یہ وہ زباں، جو میل و محبت کا نطق ہے
گلہائے رنگ رنگ کی وحدت کا نطق ہے آزادیِ خیال و شرافت کا نطق ہے
کہتا ہے جو اسے یہ ہے تفریق کی زباں
وہ چاہتا ہے بند ہو تخلیق کی زباں
برسوں کہا گیا اسے غدّار کی زباں یہ وہ زباں جو عشق کے اظہار کی زباں
کھلتی ہے اس کے قتل کو اشرار کی زباں رُکتی ہے اس کے ذکر سے سرکار کی زباں
برسوں رہی تغافلِ جاناں سے جاں بہ لب
اب ہے ہجومِ بردہ فروشاں سے جاں بہ لب
یہ قیدِ ہر مقام سے آزاد ہو گئی زنجیر جب سے قیدِ فرنگی کی ہے کٹی
بن باس پایا لفظوں نے یہ دیکھتی رہی آئین نے کہا کہ ترا گھر ہے بے گھری
جو آشنا تھے، شکل بھی پہچانتے نہیں
اپنے ہی گھر کے بچے اسے جانتے نہیں

زیر و زبر ہیں عطف و اضافات کے نشاں　　مخرج سے کٹ کے ہو گئیں اصوات نوحہ خواں
معنیٰ سے چھوٹ کر ہوئے الفاظ نیم جاں　　مِٹ مِٹ کے نقطے ملکِ عدم کو ہوئے رواں
زخم اب بھی ہیں ہرے کہ زباں لال ہوگئی
تحریر کی جو شان تھی، پامال ہوگئی
بے وارث اس کو جان کے سب لوٹتے رہے　　کچھ گونگے بہرے بیٹھے اسے پوجتے رہے
آپس میں اندھے اس کا کفن بانٹتے رہے　　سب قائدانِ قوم اسے بیچتے رہے
غیروں نے اس کے دفن کا فرماں اُدھر دیا
اپنوں نے اس کی ہستی سے انکار کردیا
فاقے پڑے تو کوئی بھی پُرساں نہیں ہوا　　مرثی زباں کا کوئی زباں داں نہیں ہوا
اک بے بسی تھی اور کوئی گریاں نہیں ہوا　　جز حرفِ شوق کوئی غزل خواں نہیں ہوا
پایا جو کچھ تو سیکڑوں غم خوار آگئے
ترکے میں حصہ لینے کو حقدار آگئے
اس کی مجاوری کو سبھی اٹھ کھڑے ہوئے　　دیکھا ہے اقتدار نے جو التفات سے
منکر تھے اِس سے جو، وہی اس کے گلے پڑے　　جتنے تھے گونگے بہرے، سب اہلِ زباں بنے
تاجر ہیں جمع، بیچ نہ ڈالیں زبان کو
دندانِ حرص مل کے نہ کھالیں زبان کو
پہلے تو لوٹا، ہوتی ہیں اب اشک شوئیاں　　یہ التفات ہو نہ تغافل سے بھی گراں
ڈرتا ہوں، مصلحت کی نہ بن جائے یہ زباں　　آنسو فروش بیٹھے ہیں کھولے ہوئے دکاں
دستِ گدا میں بن گئی کشکول ووٹ کا
پورس کے ہاتھیوں پہ بنی جھول ووٹ کا
یہ ترجمانِ صدق و صفا سرخ رو رہے　　توفیق دے زباں کو کہ با آبرو رہے
طوقِ گلو نہ بن سکے، نورِ گلو رہے　　بے باک، حق پسند، جواں، نکتہ جو رہے
مرنے نہ پائے یہ مری تہذیب کی زباں
بن کر رہے ہزار اسالیب کی زباں

اک عمر سے ہے قتلِ زباں کا مجھے قلق اے خالقِ کلام و زباں، اے لسانِ حق
میں نے بھی اس زباں میں لہو سے لکھے ورق میں نے بھی اس زباں میں پڑھا صدق کا سبق
تیرے عطا و جود سے مجھ کو زباں ملی
اردو سے مجھ کو قوتِ شرح و بیاں ملی

تخلیق کو بنایا ہے تو نے مری سرشت تو خالقِ زمانہ و خلاقِ خوب و زشت
تو چاہے تو یہ خاک ہو، چاہے تو ہو بہشت سینچی ہے میں نے خون سے افکارِ نو کی کشت
میرے زباں کے باغ کو شاداب رکھ سدا
تو میری کشتِ شعر کو سیراب رکھ سدا

بارانِ فیض سے کھلیں ہر رنگ و بو کے پھول تیرے کرم سے ہنستے رہیں یہ لہو کے پھول
تازہ رہیں سدا مرے ذوقِ نمو کے پھول روشن رہیں دماغ و دل و آرزو کے پھول
میرے یہ پھول آبروئے فن رہیں سدا
مفلس کے ہیں چراغ، یہ روشن رہیں سدا

آلودۂ ریا نہ ہوں دل کے سبو کے پھول یارب! ہمیشہ مہکیں مری گفتگو کے پھول
چنتا رہے زمانہ مری جستجو کے پھول ہردم زبان گوندھے لبِ صدق خو کے پھول
بادِ سموم آئے نہ اس مرغ زار میں
ہو جشنِ گل کی دھوم سدا اس دیار میں

ہنستی رہے سکوت پہ میری نگارِ فکر یارب کبھی خزاں نہ ہو میری بہارِ فکر
دنیا سے بے نیاز رہے تاج دارِ فکر رکھیں حریف پلکوں پہ میرا غبارِ فکر
صحرائے غم میں شاخِ سخن کی ہری رہے
جھولی مری سدا زرِ گل سے بھری رہے

شہرِ سخن پہ اترے مضامیں کا قافلہ تخلیقِ فن کی خالقِ کل سے ہے یہ دُعا
فن ہو مرا کلام کا اک زندہ معجزہ ذرّے مری زمیں کے ہوں خورشید آشنا
میرے تخیلات سے ایجاد ہو جہاں
میرے تصورات سے آباد ہو جہاں

موجِ خیال فرش سے افلاک تک اٹھے　　دشتِ سکوت نورِ بیاں سے چمک اٹھے
جامِ سفال آبِ بقا سے چھلک اٹھے　　لفظوں کے گلشنوں سے زمانہ مہک اٹھے
پرتو رہے سخن میں جلال و جمال کا
جوہر اس آئینے سے نہ جائے کمال کا
خاموشیوں کا شہرِ طلسمات جاگ اُٹھے　　خوابیدہ لفظ ومعنی کی بارات جاگ اُٹھے
اُتریں شعاعیں، مجلسِ ظلمات جاگ اُٹھے　　دہشت مآب خواب سے یہ رات جاگ اُٹھے
صدقہ علیؑ کی تیغ عدالت شعار کا
جوہر مری زباں کو ملے ذوالفقار کا
بس ہوچکی نقاب خموشی کی تار تار　　بس ہوچکی مذمّتِ خوفِ سیاہ کار
ان کا بیاں ہو، جن سے سخن کا رہا وقار　　ہے مقتضی گریز کا اب نطقِ آبدار
ہجوِ زمانہ ہوچکی، مدحت کے گل کھلیں
شاخِ نہالِ غم پہ مسرت کے گل کھلیں
ہر عہد میں ہوئے ہیں فقط چند دیدہ ور　　غم کیوں کریں، ہے قحطِ رجال آج کل اگر
بیٹھا کیے ہیں پہلے بھی انسان خاک پر　　زریں قبا پہنتے تھے پہلے بھی خوک و خر
ممدوح کی تلاش میں ہے سرگراں جہاں
اس در پہ جائیں، سجدے میں ہیں آسماں جہاں
جس کا ہر ایک گوشہ ہے معنی کا اک جہاں　　وہ در، جو ہے کلام کا گھر، نطق کا مکاں
جس کی ثنا میں روحِ امیں ہیں قصیدہ خواں　　جس کا ہر ایک ذرّہ ہے قرآں کا رازداں
جس کے غلاموں سے ہے سرافراز نامِ حق
جس گھر کی باندیوں کی زباں ہے کلامِ حق
آوازۂ صداقت وحق جس سے ہے بلند　　وہ گھر ہوا نہ جس پہ کبھی بابِ نطق بند
ہے ناطقِ حقیقی کو جس کا سخن پسند　　جس کے کلام سے ہے جہاں اب بھی بہرہ مند
ڈخانۂ شرف سے عیاں حق کی آیتیں
جس گھر کے طفل و پیر وجواں حق کی آیتیں

جس کا غبار ماہ نشاں، مہر دست ہے    وہ گھر، جو خامشی کے بتوں کی شکست ہے
سدرہ کی منتہا سے پرے، جس کی جست ہے    چوکھٹ سے جس کی چرخِ چہارم بھی پست ہے
نسبت حبیبِ حق کی طرف اس مکاں کو ہے
مولودِ بیتِ حق سے شرف اس مکاں کو ہے

اس گھر کے ہیں فقیر جہاں کے لیے کریم    اس گھر سے بھیک مانگتی ہے جنتِ نعیم
اس گھر سے جس نے سیکھا سخن، ہوگیا کلیم    اس گھر کے پاسباں ہیں سلاطیں سے بھی عظیم
خیرہ ہیں آنکھیں دہر کی جس برقِ طور سے
اس کا دیا جلا تھا اسی گھر کے نور سے

مطلع شرف کا، مقطع ہر اک افتخار کا    یہ گھر مکاں ہے فضل کا، مسکن وقار کا
مصدر ہے کُن کے نغمے کا، مولد بہار کا    منبع یقیں کے نور کا، باب اعتبار کا
رُخ جس طرف کیا اسے قبلہ بنا دیا
اس گھر نے بت کدے کو بھی کعبہ بنا دیا

نورِ نگاہِ خیرِ بشر، مسکنِ بتولؑ    کعبہ خدا کا گھر ہے تو یہ خانۂ رسولؐ
قرآن اور حدیث ہے یاں نطق کا نزول    یاں مہکے سیدانِ جناں کے قدم کے پھول
جذب اس کی خاک میں ہے پسینہ رسولؐ کا
اس گھر سے محترم ہے مدینہ رسولؐ کا

آتے ہیں سجدہ کرنے ملک اس کی خاک پر    اس گھر کا در ہے علم کا باب اور سخن کا در
آتے ہیں اس کی دید کو ہر شام اور سحر    اس گھر کا یہ شرف ہے کہ خود سیدِ بشرؐ
معراج ایک بار ہی افلاک کو ملی
عزت یہ لاکھ مرتبہ اس خاک کو ملی

پائے ہیں عقل و عشق نے اس گھر سے حوصلے    سب معرفت کے سلسلے اس گھر ہی سے چلے
ایماں کو عزم بخشا، شہاموں کو اسلحے    دی حریت غلاموں کو، بوڑھوں کو ولولے
ہر غزوۂ رسولؐ اسی گھر سے سر ہوا
حکمِ جہادِ نفس یہیں کارگر ہوا

شاہد ہے خود خدا، یہ فضیلت مآب ہیں　　اس گھر کے سب مکین شرف کی کتاب ہیں
چشمِ مباہلہ میں سبھی انتخاب ہیں　　تطہیر کی نگاہ میں سب آفتاب ہیں
گلدستۂ کسا میں ہیں ایماں کی صورتیں
کلمہ انھیں کا پڑھتی ہیں قرآں کی سورتیں

خندق میں کلِّ کفر کو حکمِ قضا دیا　　بدر و اُحد میں تیغ کا سِکّہ جما دیا
ہجرت کو فتحِ مکّہ کا عنواں بنا دیا　　توڑا حصارِ شر، درِ خیبر گرا دیا
بار آور اس مکاں میں رہی ہے صدائے حق
اس گھر میں آکے رہن ہوئی ہے رضائے حق

یا بحرِ خامشی میں ہے مینارۂ سخن　　یہ گھر ہے یا مرقعِ انوارِ پنج تن
یا شام کی سپہ میں علَم حق کا ضوفگن　　یا عشق ریگِ دشتِ ہوس پر ہے خیمہ زن
شرمندہ ہو ارم، جو اسے روبرو کریں
اس گھر میں آکے کوثر و زمزم وضو کریں

صدقہ ہے اِن کا، جس کو جہاں نے حشم کہا　　اس گھر کا فیض ہے، جسے ابرِ کرم کہا
اس گھر کی خاک ہے، جسے باغِ اِرم کہا　　شاہی نے پائی بھیک تو طبل و علَم کہا
بندے ہیں یہ، ہے شان مگر کبریائی کی
اللہ کا ہے نام، انھوں نے خدائی کی

تشبیہ و استعارہ و فن کا نظام کیا　　میں کیا زبانِ شعر کی یہ دھوم دھام کیا
حق ان کا مدح خواں ہے، بشر کا کلام کیا　　کیا فکر کا مقام، تخیّل کا کام کیا
اس گھر کے طفل کی بھی فصاحت کسے ملی
فضہؔ کے نطق کی بھی بلاغت کسے ملی

عجزِ بیاں کے چاک مژہ سے رفو کریں　　ہو اِن کا فیض ہم پہ تو ہم گفتگو کریں
پھر اِن سے دستگیری کی ہم آرزو کریں　　پہلے خود اپنے دل کے لہو سے وضو کریں
نام ان کا لے وہی، جو ریا ناشناس ہے
لب کھولے وہ، جو عشق کا جادا شناس ہے

شانِ جہادِ نفس امامت سے پوچھیے　　اس رہ کے پیچ و خم کو رسالت سے پوچھیے
آتی ہے نیند کب، شبِ ہجرت سے پوچھیے　　مرنے کا لطف شوقِ شہادت سے پوچھیے
غزوات بھی ہیں، حرمتِ بیتِ خدا بھی ہے
اس راہ میں فرات بھی ہے کربلا بھی ہے

تیغِ علیؑ بھی، نطقِ رسالت مآبؐ بھی　　اس راہ میں جہاد بھی لازم کتاب بھی
طوق و رسن بھی، خونِ بنِ بوترابؑ بھی　　بے پردگی بھی، عصمتِ حق کی نقاب بھی
اس راہ میں صغیر نہ کوئی کبیر ہے
ہر نقشِ پا میں نورِ سراجِ منیر ہے

چلتا رہا جو مرضیِ داور کے ساتھ ساتھ　　اس راہ پر چلیں تو اسی گھر کے ساتھ ساتھ
ٹھہریں کہیں تو قاسمؑ و اکبرؑ کے ساتھ ساتھ　　اٹھیں قدم تو سبطِ پیمبرؐ کے ساتھ ساتھ
گر کوئی راہ روکے تو پھر حُر کی شان سے
مہماں بنے تو جان بھی دے آن بان سے

اُس گھر کی راہ ہے جو وحی کا ہے ملتجا　　یہ جادۂ وفا، یہ رہِ عشق آشنا
جاتے کہاں ہیں نقشِ کفِ پائے مصطفیٰؐ　　واقف نہ ہو تو پوچھ لو جبریلؑ سے پتا
اِس گھر کی راہ منزلِ اہلِ نجات ہے
اِس راہ میں جو موت بھی آئے حیات ہے

پوچھو علیؑ سے تم شبِ ہجرت کا ماجرا　　گر پوچھنا ہو نکتۂ مرگِ حیات زا
یہ راز ہر قدم پہ یہاں فاش ہوگیا　　یا کربلا کی راہ میں آؤ برہنہ پا
اٹھیں نہ گر قدم تو بصارت کا ساتھ دو
آنکھیں نہ ہوں تو ذوقِ سماعت کا ساتھ دو

نزدِ پدر ہے پہرے پہ تصویرِ مصطفیٰؐ　　راہِ خطر میں سوئے ہیں تھک کر شہِ ہدا
وہ خواب، ہے جو آئینہ فردا و دوش کا　　وہ خواب جس پہ راتوں کی بیداریاں فدا
وہ نیند ہے کہ ہر نفسِ خوش نماز ہے
آنکھیں ہیں بند یا درِ معراج باز ہے

عارض پہ ہیں نثار دو عالم کی دولتیں  خوابیدہ رخ پہ جاگ رہی ہیں صباحتیں
ماتھے پہ ہیں پسینے کے قطرے کہ آیتیں  ہیں غنچگیِ لب میں گلوں کی حکایتیں
ساکت ہے دوجہاں شہِ ابرار کے لیے
ٹھہرا ہوا ہے وقت بھی دیدار کے لیے

لی آہِ سرد فاطمہؑ کے دل کے چین نے  اک بار پہلو بدلا شہِ مشرقین نے
اکبرؑ کو آنکھیں کھول کے دیکھا حسینؑ نے  بڑھ کر قدم کو تھام لیا نورِ عین نے
پوچھا پسر نے آپ ہیں افسردہ کس لیے
سلطانِ صابرین ہیں آزردہ کس لیے

کہتا تھا جیسے مجھ سے کوئی رمز آشنا  فرمایا سوتے سوتے سنی میں نے اک ندا
بڑھتے ہیں اس طرف سے حسینؑ اُس طرف قضا  ہے منزلِ قضا کو روانہ یہ قافلہ
اپنا قلق نہیں، مجھے تیرا خیال ہے
اے نورِ چشم! تو ابھی تازہ نہال ہے

"کیا حق پہ ہم نہیں ہیں؟ یہ کہیے غلام سے"  اکبرؑ نے سر جھکا کے یہ پوچھا امامؑ سے
"حق آج زندہ ہے تو ہمارے ہی نام سے"  فرمایا شاہِ دیں نے یہ اس لالہ فام سے
کیا تم کو حق کی راہ میں مرنا قبول ہے؟
بولا پسر کہ "یہ تو ہمارا اصول ہے

اس رہ سے جو ہٹیں، وہ ہمارے قدم نہیں  "ہم حق پہ ہیں تو موت کا پھر کوئی غم نہیں
مرنا بھی سچ کے واسطے جینے سے کم نہیں  دل سیر ہو تو تشنہ لبی کا الم نہیں
جس کا نہ اعتبار ہو وہ زندگی ہے موت
حق جس سے بے وقار ہو، وہ زندگی ہے موت"

اے نورِ چشم، لختِ جگر، خانداں کی جان  فرمایا شہ نے "لیتا تھا میں تیرا امتحان
تجھ ایسے حق پرستوں سے ہے زندگی کی شان  قائم ہے تجھ سے نطقِ صداقت کی آن بان
ڈرتے نہیں ہیں موت سے شیرِ خدا کے شیر
دیتے ہیں درسِ حق یونہی آلِ عبا کے شیر"

''تم نوجواں ہو اور علی اصغرؑ ہے شیر خوار راہِ خدا میں دونوں کا یکساں ہے اعتبار
بچے ہوں یا غلام، ہوں بوڑھے کہ پردہ دار ہے جو ہمارے ساتھ، وہ حق کا نگاہ دار
میں جانتا ہوں، قافلہ یہ انتخاب ہے
یہ کاروانِ نطقِ رسالت مآبؐ ہے''

یہ کارواں کہ جس پہ ہے سبطِ نبیؐ کو ناز ہے جس کی دید کے لیے چشمِ زمانہ باز
جس کا ہر اک قدم ہے رہِ عشق کی نماز تاریخ ساز جس کا ہر اک فردِ دل نواز
ناطق یہ آیتیں ہیں کوئی بھی خفی نہیں
اِن کے بغیر صدق بھی خود مکتفی نہیں

اِن پارہ ہائے صدق و شرافت کے درمیاں سرنامۂ کلام ہے شبیرؑ کی زباں
لیکن اک ایسی آیتِ روشن بھی ہے یہاں آیاتِ نطق مانتی ہیں جس کو اپنی جاں
نورِ نبیؐ عیاں ہے اس آیت کے نور سے
کہہ دو یہی رسولؐ ہیں، دیکھو جو دور سے

ان کا وجود قافلۂ اہلِ حق کی جان پیکر میں ان کے سیدؑ لولاک ہیں جوان
قامت میں سرفرازیِ ختمِ رسل کی شان طرزِ خرام میں ہے محمدؐ کی آن بان
ہر خال و خط میں عینِ شباہت رسولؐ کی
حاصل حسینؑ کو ہے رفاقت رسولؐ کی

ان کے جلو میں یادوں کا اک کارواں رہے رکھیں جہاں یہ پاؤں وہیں آسماں رہے
بیٹھیں جہاں یہ، سایۂ رحمت وہاں رہے ہوں جس طرف یہ، حق بھی اُدھر بے گماں رہے
چہرہ ہے اِن کا، چہرہ رسالت مآبؐ کا
نام ان کا بھی وہی ہے جو ہے بوترابؑ کا

نطق افصحِ عرب کا، بلاغت علیؑ کی ہے ہے خلق مصطفیٰؐ کا، شجاعت علیؑ کی ہے
سرمایہ ہے رسولؐ کا، دولت علیؑ کی ہے خیرالبشر کی جان، ریاضت علیؑ کی ہے
کافر بھی ان کو دیکھ کے صلِ علیٰ پڑھے
دیکھے انھیں تو کلمہ نبیؐ کا خدا پڑھے

جب گھٹنیوں چلے تو شجاعت جواں ہوئی — بچپن کو ان کی دیکھ کے ہمت جواں ہوئی
یہ جب جواں ہوئے تو شہادت جواں ہوئی — ساتھ ان کے ہر دعائے رسالت جواں ہوئی
تخلیقِ کائنات ہے جیسے رسولؐ سے
باغِ حسینؑ تازہ ہے اس ایک پھول سے

ماں کا غرور، بہنوں کی چاہت جوان ہے — یہ ہیں جواں تو حق کی ریاضت جوان ہے
غربت میں ابنِ زہراؑ کی دولت جوان ہے — زینبؑ کی ایک عمر کی محنت جوان ہے
سب کی دعا یہ ثمرۂ حق لازوال ہو
اس شاخِ گل کو دیکھ کے دنیا نہال ہو

ان کی زبان تیغِ فصاحت کی ہے بہار — ان کی بہار باغِ صداقت کی ہے بہار
اِن کا وجود خیمۂ عترت کی ہے بہار — ان کی نگاہ صبحِ مسرت کی ہے بہار
ہنستے ہیں آنکھیں موت کی آنکھوں میں ڈال کر
ظلم ان کے آگے رکھ دے کلیجہ نکال کر

الحانِ حق میں لحن انہی کا رسول ہے — آواز اِن کی نطقِ رسالت کا پھول ہے
اِن کی صدا وظیفۂ ابنِ بتولؑ ہے — قرأت ہے اِن کی وہ، جو خدا کو قبول ہے
دنیا میں شب رہے، جو یہ نورِ بیاں نہ دیں
نکلے نہ آفتاب، اگر یہ اذاں نہ دیں

بولا پسر سے سیدۂ دوسرا کا پھول — صبحِ شبِ دہم نے جو کھولا قبا کا پھول
مہکے پھر آج لحنِ حبیبِ خدا کا پھول — گلدستۂ اذاں پہ کھلے مصطفےٰؐ کا پھول
''اکبرؑ قضا کے دشت میں تم آج اذان دو''
تشنہ لبی کو جرأتِ حق کی زبان دو

اک ٹیلے پر کھڑے ہوئے فوجوں کے درمیاں — صحرا میں سر بلند ہوا سرو قد جواں
تصویر ہے نبیؐ کی کہاں، جھوٹ ہے کہاں — منظور تھا کہ دیکھ لیں افواجِ دشمناں
آنکھیں اگر نہ دیکھیں شباہت رسولؐ کی
کانوں سے سن لیں طرزِ خطابت رسولؐ کی

کروٹ بدل کے خواب سے وحشت بلا اٹھا　　دی جب اذاں تو نورِ خدا جگمگا اٹھا
صحرا میں اک نہالِ صداقت نما اٹھا　　ذرّوں کو ناز، خاک سے سورج نیا اٹھا

دشمن کو بھی گماں کہ بلاتے ہیں خود رسولؐ
سوئے ہوئے دلوں کو جگاتے ہیں خود رسولؐ

اذنِ نوا ملا تو ہر اک غنچہ جاگ اٹھا　　مَل مَل کے آنکھیں خواب سے ہر ذرّہ جاگ اٹھا
سنکی ہوائیں، ناچی کرن، نغمہ جاگ اٹھا　　تخلیق کے کرشموں کا سرچشمہ جاگ اٹھا

چہکے طیور، شاخِ شجر گل فشاں ہوئی
فطرت درود پڑھنے لگی، کلمہ خواں ہوئی

سجدوں سے گود بھرنے کو اوپر اٹھی زمیں　　اُٹھے نماز پڑھنے رفیقانِ شاہِ دیں
چمکی نہ مارے شرم کے خورشید کی جبیں　　چھپ کر ہوئے ستارہ و مہتاب خوشہ چیں

اک لحنِ حق صداؤں کا گلدستہ بن گیا
ظلمت میں نور کے لیے خود رستہ بن گیا

تخلیق پھر جہاں ہوا گویا شروع سے　　اِس آفتابِ لحن کے برقِ طلوع سے
دی خلق نے گواہی قیام و رکوع سے　　سجدہ کیا جہاں نے خضوع و خشوع سے

حقا کہ ہیں حسینؑ رسالت مآبؐ سے
اور ہیں رسولؐ پاک بنِ بوترابؑ سے

گم کردگاں کے واسطے حجت تھی یہ اذاں　　شبیرؑ کے کلام کی طاقت تھی یہ اذاں
تکمیلِ کارِ ختمِ رسالت تھی یہ اذاں　　نعت ہے جس پہ ختم، وہ نعت تھی یہ اذاں

مدّت سے گرِ کشا کشِ سود و زیاں میں تھا
کھنچ آیا حق کی سمت، وہ زور اس اذاں میں تھا

ہم شکلِ مصطفیٰؐ کا ہے اعجاز یہ اذاں　　اعجاز ہے رسولؐ کا قرآن کی زباں
ہے یہ اذان آج بھی اعلانِ حق کی جاں　　صدیوں سے سن رہے ہیں بیابان و گلستاں

ساری اذانیں گونج اسی لحنِ جواں کی ہیں
ممنون سب نمازیں اسی اک اذاں کی ہیں

وہ بادِ ظلم و جور، وہ جاں کی شگفتگی — اعجاز اثر وہ لحن، وہ سیلابِ تشنگی
سوکھے ہوئے لبوں کے بیاں میں وہ تازگی — وہ تین دن کی بھوک میں بھی جوشِ زندگی

نافہم کہہ اٹھیں کہ وحی کا نزول ہے
بولیں زبان داں، یہ زبانِ رسولؐ ہے

اس مصلحت کدے میں صداقت بیان کی — حاصل اسی زباں کو ہے قدرت بیان کی
دھڑکن دلوں کی اور حرارت بیان کی — تابندگی دماغ کی، جرات بیان کی

یہ نطق ہی رسول ہے آیاتِ خیر کا
ہے آخری کمال کمالاتِ خیر کا

ہے ظلم کے حصار میں فرہادِ تیشہ زن — یہ نطق ہی سکوت کے سینے کی ہے چبھن
صحرا میں ہے سکوت کے منارۂ سخن — ہے تیرگی جہل میں خورشیدِ شب شکن

پردے میں ہو تو نام اسی کا ضمیر ہے
بے پردہ ہو تو ضربِ شہِ قلعہ گیر ہے

گردن میں ظلم و کذب کے زنجیرِ نطق تھی — اکبرؑ کی تھی اذان کہ شمشیرِ نطق تھی
منکر درود خواں تھے وہ توقیرِ نطق تھی — نادم تھا خود سکوت، وہ تاثیرِ نطق تھی

ظلماتِ خامشی میں پیمبر تھی یہ اذاں
لب تشنگی میں ساقیِ کوثر تھی یہ اذاں

امواجِ تیغ و تیر نہ جن کو ہلا سکیں — اِس اک اذاں نے ایسی صفیں حق کی باندھ دیں
تا عصر اس اذان کی کرنیں جواں رہیں — قائم اسی سے عرش تو ثابت رہی زمیں

کٹتے گئے گلے، یہ اذاں ضو فگن رہی
نیزوں کی نوک پر یہی شمعِ سخن رہی

باطل کے آگے بن گئے وہ برقِ کوہ طور — جن کے دلوں میں چمکا اس آوازِ حق کا نور
وہ بن گئے ضمیرِ جہاں، صدق کا شعور — سینوں میں جن کے اترا تھا اس جام کا سرور

محکم ترین آیۂ حجت تھی یہ اذاں
دیباچۂ جہادِ صداقت تھی یہ اذاں

اک سمت خامشی کے اندھیرے تھے تیغ زن　　اک سمت اس اذاں کی شعاعیں تھیں ضوفگن
اک سمت تھی یہ فکر کہ ہو قطع یہ سخن　　اک سمت تھے کلام کے چشمے لب و دہن
تھی اس طرف شبیہ رسالت مآبؑ کی
فوج اُس طرف یزیدِ جہالت مآب کی

چلّوں میں تیر جوڑ کے بڑھنے لگے لعیں　　برداشت کر سکے نہ سخن حق کا اہلِ کیں
برسا رہے تھے تیر اُدھر سے سیہ جبیں　　آگے تھے شہ کے مقتدیانِ امامِ دیں
پہلی نمازِ عشق نے فدیے طلب کیے
سر عاشقوں نے نذرِ شہِ خوش لقب کیے

جو جانتا تھا جامِ شہادت کو زندگی　　وہ جس کو حق کی راہ میں مرنے کی تھی خوشی
چہرہ تھا جس کا آئینۂ نورِ احمدیؐ　　جس کے سخن کی شمع تھی سینوں کی روشنی
بے تاب تھا کہ باپ سے اذنِ وغا ملے
مرنے کی زندگی کے لبوں سے رضا ملے

گر آل میں سے کوئی شہیدِ جفا ہوا　　اصحاب کو یہ فکر کہ پہلے ہوں وہ فدا
اکبرؑ کی ضد کہ پہلے ہوں وہ فدیۂ خدا　　سَر اُٹھ سکے گا پھر نہ کبھی پیشِ مصطفیٰؐ
آلِ عباؑ میں آپ وہ فردِ فرید تھے
ہے راویوں کا قول کہ پہلے شہید تھے

قاسمؑ کے ہوتے پائیں شبیہِ نبیؐ رضا　　لیکن یہ مانتا نہیں دل اہلِ درد کا
عباسؑ دیکھیں اور بنِ شبیرؑ ہو فدا　　زینبؑ کے لال زندہ ہوں، اکبرؑ کریں قضا
جاں دینے والے اتنے بنِ بوترابؑ پر
اور آنچ آئے شکلِ رسالت مآبؐ پر

پیغمبرِ خدا کا سراپا عزیز تھا　　سب ہی کو یہ جوانِ دل آرا عزیز تھا
اکبرؑ نہیں حسینؑ کو نانا عزیز تھا　　قرآن کا یہ بولتا پارہ عزیز تھا
کہتا ہے دل، حسینؑ نے جب سب لٹا دیا
ہمشکلِ مصطفیٰؐ کو تب اذنِ وغا دیا

ہتھیار اپنے ہاتھ سے بر میں لگائے گا فخرِ خلیلؑ بیٹے کو دولھا بنائے گا
خود آہنی بچاؤ کو سر پر پنھائے گا پٹکا علیؑ کا ان کی کمر میں سجائے گا
یہ شان بھی جوان کی دکھلائیں گے حسینؑ
نوشہ بنا کے خیمے میں لے جائیں گے حسینؑ

پروانہ وار جمع ہوئیں گرد بیبیاں آیا پدر کے ساتھ جو خیمے میں نو جواں
بہنوں نے چوما بھائی کو ہو ہو کے شادماں دیکھا انھیں تو آ گئی زینبؑ کی جاں میں جاں
اٹھارہ سال کی یہ ریاضت سبھی کی ہے
سرور کو علم ہے، یہ امانت سبھی کی ہے

جو دل میں ہے وہ ان سے کہو میرے لالہ فام بیٹے سے بولے، بڑھ کے پھوپھی کو کرو سلام
وہ اذن دیں تمھیں تو بنے گا تمھارا کام زہراؑ کی جانشین سے اب تم کرو کلام
اکبرؑ جھکے تو بڑھ کے پھوپھی نے اٹھا لیا
زینبؑ نے ان کو اپنے گلے سے لگا لیا

تم بن سنور کے آئے کہ دھوکا نظر کا ہے بولیں کہ خیر تو ہے ارادہ کدھر کا ہے
ہم لٹ رہے ہیں، عزم تمھارا سفر کا ہے کچھ صبح سے خیال تمھیں اپنے گھر کا ہے
اپنے تئیں تو زدِ بلا کر چکی ہوں میں
دو لال اپنے تم پہ فدا کر چکی ہوں میں

ہتھیار اپنے جسم پہ سارے سجائے ہو میں خوب جانتی ہوں کہ رخصت کو آئے ہو
چھوڑو گے ہم کو، اس لیے آنکھیں چرائے ہو بابا کو اپنے ساتھ سفارش کو لائے ہو
پورے کسی طرح مرے سپنے نہ ہو سکے
بیٹے ہوئے پرائے تم اپنے نہ ہو سکے

رہتا قدم سے آپ کے لپٹا ہوا مدام بولا وہ خوش سخن کہ فدا آپ پر غلام
کیا آپ چاہتی ہیں کہ مقتول ہوں امام لیکن حسینؑ پر ہے لعینوں کا اژدہام
اکبرؑ پہ ایک اور یہ احسان کیجیے
مجھ کو نبیؐ کے لال پہ قربان کیجیے

زینبؑ نے مادرِ علی اکبرؑ سے یہ کہا    کچھ سُن رہی ہو، لیتے ہیں یہ رخصتِ وغا
ماں نے کہا کہ جاؤ، بزرگوں کی جو رضا    ماں سرفراز ہو جو کرو حق پہ جاں فدا
میں جانتی ہوں موت سے شادی رچاؤ گے
جاؤ گے اب جو خیمے سے، پھر کر نہ آؤ گے

جی بھر کے ایک بار سراپا تو دیکھ لوں    زلفیں بکھر رہی ہیں، انھیں تو بہم کروں
پھر کیا خبر کہ جیتا تمھیں دیکھ بھی سکوں    اچھا سدھارتے ہوتو کچھ پڑھ کے پھونک دوں
بہنوں نے اپنی باہوں میں ان کو جکڑ لیا
آگے بڑھے تو بچوں نے دامن پکڑلیا

لیتے تھے بوسے سب لبِ شیریں کلام کے    تھے تشنگانِ دید بہت تشنہ کام کے
بچے بھی روک لیتے تھے دامن کو تھام کے    اٹھتے تھے اور گرتے تھے پردے خیام کے
باہر جو آئے خیموں سے شورِ فغاں اٹھا
صابر پدر کے سینے سے غم کا دھواں اٹھا

فرمایا اے خدائے دو عالم تو رہ گواہ    میں بھیجتا ہوں تیرے لیے جانبِ سپاہ
وہ نازشِ ذبیح، وہ خورشیدِ خوش نگاہ    میرے غموں کی رات میں جو ہے مثالِ ماہ
کردار و خط و خال میں ہے مصطفیٰؐ نما
طرزِ سخن میں، چال میں ہے مصطفیٰؐ نما

اے صبر دینے والے مرے ربِّ ذوالجلال    آتا جو روئے پاکِ نبیؐ کا مجھے خیال
اکبرؑ کو دیکھ لینے سے ہوتا تھا میں نہال    تیری رضا کہ آتا ہے اس پر بھی اب زوال
تیرے حبیبِ خاص سے وقتِ جدائی ہے
اُمّت سے کچھ گلہ نہیں، تیری دہائی ہے

واقف ہے اے خدا تو مرے دل کے حال سے    کس دل سے ہو رہا ہوں جدا اپنے لال سے
یہ لوگ جو خلاف ہیں احمدؐ کی آل سے    کچھ حظ اٹھا سکیں گے نہ مال و منال سے
ڈس لے گی ان کو حرص و ہوس ناگ کی طرح
کردے گا عیش خاک انھیں آگ کی طرح

بھاگے گی جس طرف کو بھی، وہ راہ ہوگی تنگ یہ قوم جس کو قتلِ نبیؐ میں نہیں درنگ
اپنے ہی حاکموں کے لیے ہوں گے کل کو ننگ مہماں بلا کے کرتے ہیں جو لوگ مجھ سے جنگ
جو قتل کر رہے ہیں مرے نونہال کو
گردن سے کیسے پھینکیں گے خوں کے وبال کو

جب تک جیے گا، ہو نہ سکے گا کہیں بھی شاد اس نخل کو جو قطع کرے گا، وہ بد نہاد
ہوگا نہ اس کا گھر کبھی آباد و با مراد رہنے نہ دے گا چین سے اک پل اُسے عناد
وہ تشنۂ ہوس جو گرے گا سراب پر
لوٹے گا بسملوں کی طرح فرشِ خواب پر

آواز تیری اس کی صدائے اذاں میں ہے یا رب! یہ نوجواں ترے حفظ واماں میں ہے
تنہا ترے حبیب کا ثانی جہاں میں ہے قوت علیؑ کے وار کی اس کی زباں میں ہے
تو آزما رہا ہے تو طاقت بھی بخش دے
بندے کو اپنے صبر کی دولت بھی بخش دے

تھامی رکابِ توسنِ محبوبِ دل نواز اپنے خدا سے کرکے نیاز اٹھا بے نیاز
جاؤ، سدھارو جنگ کو اے میرے گھر کے ناز اکبرؑ سے بولے، تم کو خدا رکھے سرفراز
گھوڑا بڑھا تو گھٹنے لگا نور آنکھ سے
آنسو بہے جو لال ہوا دور آنکھ سے

جاتا ہے نور آنکھ کا اور قلب کا سرور حق نے کہا کہ صابر و شاکر ہے تو ضرور
چل پیچھے پیچھے بیٹے کے اے چشمِ حق کے نور نانا کے شوقِ دید کا ہے دل میں گر وفور
چلتی جواں کے ساتھ محبت کہاں تلک
دیتی نظر کا ساتھ بصارت کہاں تلک

دیکھا کبھی فلک کو، کبھی سوئے کارزار گر گر کے اٹھے تو اٹھ کے گرے شاہ بار بار
دی یہ صدا کہ اے علی اکبرؑ ترے نثار ہونے ہی کو نظر سے تھا اوجھل جو راہوار
آہستہ چل کہ میں تری رفتار دیکھ لوں
بیٹا ٹھہر کہ میں تجھے اک بار دیکھ لوں

گھوڑے سے ایک بار اُتر آیا وہ حق شناس سن کر ندائے سبطِ رسولؐ فلک اساس
ہنس کر وداع کیجیے، نہ ہوگا مجھے ہراس بولا کہ ایک فدیے کی خاطر ہیں آپ اُداس
صبرِ خلیلؑ میں بھی یقیناً خلل پڑے
شبیرؑ مسکرائے، پر آنسو نکل پڑے

سوچا پلٹ کے خیمۂ عترت کے پاس جائیں بہتے تھے اشک اور تھی کوشش کہ مسکرائیں
باتوں سے تشنگیِ دِل و دیدہ کو بجھائیں ماں سے پسر کا ذکر کریں، درد کو مٹائیں
اکبرؑ سدھارے فوجِ جفا کار کی طرف
شبیرؑ آئے خیمۂ اطہار کی طرف

پردے کے پیچھے آ کے خواتیں کھڑی ہوئیں کرسی پہ بیٹھے خیمے کے آگے امامِ دیں
پڑھتی تھی چہرہ غور سے سرور کا وہ حزیں ماں کو دکھائی دیتا نہ تھا جو پسر کہیں
اکبرؑ کا حال چہرۂ شبیرؑ سے پڑھو
ان پر جو گزرے، ماتھے کی تحریر سے پڑھو

اکبرؑ نے فوجِ ظلم پہ دوڑایا راہوار میدانِ کارزار میں تھے جمع بدشعار
اُٹھا زمیں سے تا بہ فلک نور کا غبار دن ہوگیا سیاہ دلوں کی نظر میں تار
چیخے نقیب یہ غضب کردگار ہے
افلاک سے اترنے کو پھر ذوالفقار ہے

بولا کوئی کہ آتا ہے لشکر، کرو خبر راکب غبارِ نور میں آتا نہ تھا نظر
شاید نزولِ فوجِ ملائک ہے خاک پر چلایا کوئی، فوجوں کا کیا اس طرف گزر
کوئی پکارا کود پڑو سب فرات میں
لشکر ہیں بجلیوں کے اندھیروں کی گھات میں

اڑتے ہوئے پھریروں کو سمجھے وہ بادبان بھاگے ہوا کے رخ پہ علم دار بے تکان
سردار بد حواس، سپاہی تھے نیم جان منہ پیٹتے تھے پنجوں سے افواج کے نشان
منکر علیؑ کے چیخے، دہائی علیؑ کی ہے
آمد بلا کے دشت میں حق کے ولی کی ہے

نیزے چبار ہے تھے اَنی خوفِ عام میں　　تلواریں چھپ رہی تھیں کنارِ نیام میں
رہوار منہ چھپائے ہوئے تھے لگام میں　　تیروں کو راہ ملتی نہ تھی اژدہام میں
تھا قاتلوں کو خوف، لڑائی علیؑ سے ہے
ہے تو امیدِ عقدہ کشائی علیؑ سے ہے
بیٹھا غبارِ نور، ہٹے ڈر کے بد خصال　　یہ شور سُن کے رک گیا شیرِ خدا کا لال
دامن پہ گردِ غم تھی نہ چہرے پہ تھا ملال　　زلفیں جھٹک کے سامنے آیا وہ خوش جمال
فرمایا اشقیا سے، مجھے آج دیکھ لو
مجھ میں جمالِ صاحبِ معراج دیکھ لو
بولے یہ ابن سعد سے کچھ لوگ برملا　　گھبرا کے پیچھے ہٹنے لگی فوجِ اشقیا
تو خود ہی دیکھ کون ہے نائب رسولؐ کا　　غاصب ہے، جھوٹ بکتا ہے، حاکم ہے جو ترا
ظالم نے کیا کیا یہ بڑے بول بول کر
اترے ہیں آسماں سے نبیؐ تیغ تول کر
کہتے تھے کام ہم کو نبیؐ سے نہ آل سے　　گھبرا گئے تھے شمر و عمر اِس سوال سے
کرتا ہے جو کرو تم اُسی کے خیال سے　　سچ اور جھوٹ تلتا ہے حاکم کے مال سے
لو انتقامِ بدر و احد آج امام سے
منصب بڑھے گا، پاؤ گے جاگیر شام سے
نورِ جمالِ حق تھا اِدھر، خوفِ نار اُدھر　　جمعیتِ دلی تھی اِدھر، انتشار اُدھر
تصویر تھی نبیؐ کی اِدھر، اور غبار اُدھر　　تھے خیر و عدل و صدق اِدھر، کارزار اُدھر
اکبرؑ کی ذات بن گئی میزانِ خیر و شر
دھند لے تھے صاف ہوگئے عنوانِ خیر و شر
سردار بھاگے پھرتے تھے کرنے کو انتظام　　ٹوٹے ہوئے پروں کو جماتی تھی فوجِ شام
تھا قلبِ مطمئنہ کا وارث بنِ امام　　شمر و عمر لڑائی کا کرتے تھے اہتمام
اکبرؑ نے رکھ کے تیغِ علیؑ کو غلاف میں
جوہر دکھائے نطقِ نبیؐ کے مَصاف میں

ہاں میں علیؑ ہوں، نام ہے میرا یہ بالیقیں فرمایا، ''جو گماں ہے تمھیں، وہ غلط نہیں
ہم شکلِ مصطفیٰؐ مجھے کہتے ہیں شاہِ دیں تم کو یہ خوف تھا کہ محمدؐ نہ ہوں کہیں
بیٹا حسینؑ کا ہوں، میں پوتا علیؑ کا ہوں
میں زندہ اک نشان خدا کے ولی کا ہوں
وارث ہیں خیر و عدل کے پیغام کے تو ہم حق دار ہیں رسول کے، اسلام کے تو ہم
مورد ہیں آج غدر کے الزام کے تو ہم عارف ہیں اس جہاں میں جو الہام کے تو ہم
حق دار کیسے بیعتِ غاصب کرے قبول
سچ کس طرح حکومتِ کاذب کرے قبول
ہم ہیں خدا کے بندوں کی مشکل کشائی کو حق نے کیا ہے خلق ہمیں رہ نمائی کو
ہم پر خدا کا دھوکا ہوا ہے خدائی کو جھکتے ہیں روحِ قدس یہاں جبہ سائی کو
جد رحمتِ جہاں تھے تو مبدائے فیض ہم
کوثر سے پوچھ لو کہ ہیں دریائے فیض ہم
آلِ نبیؐ کی عقدہ کشائی بھی دیکھ لو حاکم کی دے کے آج دہائی بھی دیکھ لو
بھاگو نہیں، علیؑ کی لڑائی بھی دیکھ لو سرکش سروں کی تن سے جدائی بھی دیکھ لو
سر تا قدم وجود ہے میرا کلامِ حق
اب تیغ کی زباں سے بھی سن لو کلامِ حق
آنکھیں ہیں کور اور سماعت تمھاری خام میں حجتِ خدا کی ہوں اک حجتِ تمام
بے کار ہے تمھارے لیے زحمتِ کلام لب پر تمھارے مُہر تو دل طمع کے غلام
اپنے نبیؐ کی شکل بھی پہچانتے نہیں؟
اے بزدلو! خدا کو بھی کیا مانتے نہیں؟
جاگیں گے کان سر پہ جو کڑکیں گی بجلیاں آنکھیں کھلیں گی موت کو دیکھو گے جب عیاں
کھولے گی تیغ دل کی گرہ، تب کہو گے 'ہاں' ٹوٹے گی مُہر ہونٹ کی، کہنے کو الاماں
تم مانتے نہیں جو کہا کردگار کا
مانو گے تم کہا ہوا بس ذوالفقار کا

چمکے گی سر پہ برق تو دیکھو گے روشنی    کھولے گی تن سے جاں کی گرہ نوک تیغ کی
آئے گی راستی پہ کماں چھوڑ کر کجی    سیدھا کروں گا نیزے پہ رکھ کر تمہیں ابھی
گرز و تبر وبال ہیں، بھاگو گے چھوڑ کر
نکلیں گی جانیں خود و زرہ توڑ توڑ کر

تن پر زرہ نہیں، قفسِ بال و پر ہے یہ    بوجھ اسلحوں کا لادا ہے کیوں، بارِ خر ہے یہ
جوشن نہیں، گرفتِ اجل کا اثر ہے یہ    سر پر نہیں ہے خود، حبابِ نظر ہے یہ
تر ہوں گے تشنہ تیغ کے لب تم کو مار کر
دریا نہائے گی یہ تمھیں پار اُتار کر

ندی چڑھی جو تیغ کی، پھٹ جائیں گے ابھی    دریا کے پہرے داروں کے رستے ہیں کاغذی
ہے گھاٹ موت کا، جسے سمجھے ہو زندگی    لے ڈوبے گی تمہیں، جو اٹھی موج خون کی
گھوڑے کی ایک ٹاپ سے پشتوں کو توڑ دوں
دریا بہے، جو پیاس کا دامن نچوڑ دوں

تم پر جنوں سوار نہ ہو، دیکھ کر پری    گھونگھٹ سے اب نکلتی ہے شمشیرِ حیدری
اب دیکھو خوں کے بحر میں اس کی شناوری    بس! اک جھلک سے پڑ گئی فوجوں میں ابتری
آگے بڑھو جو اِذن تمہیں اضطراب دے
منہ سے نہیں تو تیغ سے کوئی جواب دے

تلوار اٹھا کے فوج میں ڈوبا وہ تشنہ کام    گھوڑے کو ایڑ دی تو کیا فتح نے سلام
چمکا جو نور حق کا، ہٹی تیرگیِ شام    ہر وار پر اجل کو دیا، حکمِ قتلِ عام
ابرِ جفا سے نکلا جری آفتاب وار
ٹھہرا جو کوئی سامنے، ٹوٹا حباب وار

روباہ تھے بنے ہوئے کل تک جو شیر تھے    سر سرکشوں کے پست، زبردست زیر تھے
سب پہلواں پہاڑ سے، مٹی کے ڈھیر تھے    جن کو ہوس تھی عیش کی، جینے سے سیر تھے
یوں اک جوان فوج کو پامال کر گیا
بستی سے جیسے موت کا لشکر گزر گیا

انعام کی ہوس میں چلا ایک پہلواں   پلٹا بھگا کے فوج عدو کو جو نوجواں
سمجھا تھا، تھک چکا ہے بہت لڑ کے تشنہ جاں   طارق بنِ کثیر اُسے کہتا تھا اک جہاں
بہکایا کچھ ہوس نے تو کچھ انتقام نے
تب مرد بن کے آیا تھا اکبرؑ کے سامنے

ہنس کر پکاری موت، یہ ایندھن سقر کا ہے   اکبرؑ نے مسکرا کے کہا، رخ کدھر کا ہے
اُن کے ہی ساتھ شوق اِسے بھی سفر کا ہے   داغ اِس کے دل میں اپنے برادر، پسر کا ہے
اکبرؑ تھے خوش کہ ایک شکار اور آ گیا
واں چہرہ حسینؑ پہ بادل سا چھا گیا

بولے حسینؑ معرکہ اکبرؑ نے سَر کیا   گھبرا کے بولی ماں، میرے بچے کو کیا ہوا؟
ہے سخت یہ مقابلہ، آساں کرے خدا   آتے تھے سوئے خیمہ کہ اک پہلواں بڑھا
پیاسا ہے میرا لال، توانا حریف ہے
حق سے دعا کرو، وہی اپنا حلیف ہے

غالب کر اس شقی پہ بھی اکبرؑ کو، اے خدا   ماں نے اٹھا کے دستِ دعا، حق سے یہ کہا
میں نے حسینؑ کے لیے فدیہ اُسے دیا   یہ تو نہ میں کہوں گی کہ اکبرؑ کو رکھ سدا
تشویش ہے حسینؑ کو وہ مضمحل نہ ہوں
شیرِ خدا کے شیر کسی سے خجل نہ ہوں

آنکھوں سے اپنے لال کی شمشیر دیکھ لوں   ہیں غمزدہ مسرّتِ شبیرؑ دیکھ لوں
وہ آئیں گھر، دعا کی میں تاثیر دیکھ لوں   اک بار پھر رسولؐ کی تصویر دیکھ لوں
مل لیں وہ آ کے باپ سے، پھر جاں فدا کریں
آگے رضا تری، وہ رہیں یا قضا کریں

آیا تھا لینے بدلہ عزیزوں کا بدشعار   ماں کی دعا اِدھر سے چلی، اُس طرف سے وار
جم کر کھڑا ہوا بھی نہ تھا، ہو گیا شکار   تیغ دو دم کے شعلے سے اک دم ہوا دوچار
فوجوں کو فکر، کیا وہ ہواؤں میں کھو گیا
اکبرؑ پکارے آگ تھا، اب خاک ہو گیا

یاں ماں نے ختم کر کے دعا، شہ پہ کی نظر   دیکھا کہ انبساط کا چہرے پہ ہے اثر
آنکھوں نے پڑھ لیا کہ ہے یہ مژدۂ ظفر   جانا کہ فتح یاب ہوا پارۂ جگر
سر ماں کا کردگار کی تسلیم کو جھکا
بیٹا پدر کے سامنے تعظیم کو جھکا

جاں ایک بار مل گئی پھر سے حسینؑ کو   لپٹا لیا کلیجے سے اس دل کے چین کو
ماں کو ملال، فکر شہِ مشرقین کو   کیا دیں گے تحفہ دید کا اب نورِ عین کو
پائی تھی فتح پیاسے نے افواجِ شام پر
انعام اس کا قرض تھا شاہِ انام پر

اکبرؑ نے کی یہ عرض کہ اے شاہِ بے عدیل   آیا ہوں شوقِ دید میں، وقفہ ہے یہ قلیل
کانٹے مری زباں میں ہیں، اے نازشِ خلیل   کچھ کیجیے میری پیاس بجھانے کی بھی سبیل
کیونکر حسینؑ کرتے مداوائے تشنگی
دریائے فیض وجود تھا دریائے تشنگی

فرمایا، میرے منہ میں زباں رکھ دو اے پسر   پایا دہانِ شاہ کو اکبرؑ نے خشک تر
بولے کہ تشنہ تر ہیں شہنشاہِ بحر و بر   شدّت عطش کی ہوتی ہے اتنی نہ تھی خبر
دیجے رضا کہ صبر و شجاعت سے کام لوں
اب میں ارم میں ساقیِ کوثر سے جام لوں

دم بھر کو مل کے شہ سے پسر پھر جدا ہوا   پہلے سے اب کے اور قلق کچھ سوا ہوا
پانی نہ دے سکے تھے تو دل تھا بجھا ہوا   ہونٹوں پہ فقرے شکر کے تھے، سر جھکا ہوا
فرمایا اب وہ مانگنے پانی نہ آئیں گے
میداں میں ہم ہی اُن کے منانے کو جائیں گے

ماں سے کہا اب ان کو سپردِ خدا کرو   بیٹے سے دل ہٹاؤ، خدا کی ثنا کرو
دنیا سے سر فراز اٹھیں، یہ دُعا کرو   غالب ہوں دشمنوں پہ، یہی التجا کرو
مہماں وہ ایک پل کے تو ہم دو گھڑی کے ہیں
دائم تغیرات میں جلوے اُسی کے ہیں

صابر کو تین روز سے پانی ملا نہیں     کب تک لڑے گا فوجوں سے تنہا وہ خوش جبیں
وہ تنہا دل گرفتہ، گرسنہ، غمیں، حزیں     درپے ہیں ایک جان کے لاکھوں شقی، لعیں
اب تک تو رن میں شور ہے ان کی لڑائی کا
سنتا ہوں، اب ارادہ کیا ہے ترائی کا

اے جانِ صبر، صبر کرو، ماں سے یہ کہا     کچھ دیر تک سنی نہیں بیٹے کی جب ندا
شاید نکل گیا ہے، بہت دور برق پا     شورِ مبارزت ہے نہ بھگدڑ کا سلسلہ
محبوبِ جاں ہے جو، وہ صدا ہم سے دور ہے
آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں، ضیا ہم سے دور ہے

بابا مدد کو آیئے، ہے وقت آخری     لب پر تھے یہ سخن کہ صدا کان میں پڑی
نرغہ کیے ہیں گھوڑے کا ہر سمت سے شقی     تن جابجا سے ٹکڑے ہے، دل میں سناں اڑی
گرنا نہیں قبول محمدؐ کی آل کو
تھامے ہوں سو جتن سے فرس کی ایال کو

کب تک فرس اٹھائے، مرا بار آیئے     اے نورِ چشمِ احمدِ مختارؐ، آیئے
گرتا ہوں، اے جہاں کے مددگار، آیئے     تنہا کو قتل کرتے ہیں اشرار، آیئے
آغوش تو ملے گی نہ ماں کی غریب کو
کاندھے پہ آپ اٹھایئے اس کم نصیب کو

حیدرؑ کھڑے ہیں سامنے مشکل کشائی کو     ہے انتظار میرا پیمبرؐ کی جائی کو
کیوں کر سہیں گے آپ پسر کی جدائی کو     آئے ہیں خود رسولؐ مری پیشوائی کو
سب آپ کو بلاتے ہیں ساغر لیے ہوئے
آیا ہے جام ہاتھ میں کوثر لیے ہوئے

دو گام ہی چلے تھے کہ پھر لڑکھڑا گئے     گھبرا کے شہ اٹھے تو قدم ڈگمگا گئے
دیوانہ وار، آئی جدھر سے صدا، گئے     یوں گرتے پڑتے رن میں شہِ دوسرا گئے
آنکھوں سے سوجھتا نہ تھا، دنیا سیاہ تھی
غم میں جوان بیٹے کے حالت تباہ تھی

کس جا ہے میرا نورِ نظر، راستہ دکھاؤ　　کہتے تھے دشمنوں سے بصد درد، ''کچھ بتاؤ
چپ تھے شقی تو بولے کہ ''بیٹا صدا سناؤ''　　گم ہوگیا ہے لعل مرا، کوئی ڈھونڈ لاؤ''
''گہرا ابھی تمھاری جدائی کا داغ ہے
آواز ہی تمھاری ہمارا چراغ ہے

خوشبو ہی میرے گل کی مجھے، اے ہوا! سنگھا　　لوٹا ہے کس نے باغ مرا، کربلا! بتا
اے داغِ ہجر! تو ہی مجھے راستا دکھا''　　آواز خوشنوا کی مرے، اے فضا! سنا
اک سمت اشقیا کے پرے تھے کھڑے ہوئے
اکبرؑ وہیں تھے خون میں غلطاں پڑے ہوئے

آتی ہے اپنے خوں کی مجھے بو، یہاں ہو تم　　روکر پکارے، اے مرے مہرو، یہاں ہو تم
دل کے سرور، راحتِ پہلو، یہاں ہو تم　　اے میرے خوش بیاں، مرے خوشخو یہاں ہو تم
تم کو تو دوشِ شاہِ مدینہ عزیز تھا
کیا خاکِ کربلا کا بھی سینہ عزیز تھا

اب کیا ہوا، جو کرتے نہیں اٹھ کے تم سلام　　کرتے تھے تم تو باپ کا ہر وقت احترام
اتنے خفا ہو، کرتے نہیں باپ سے کلام　　تم کو پکارتا ہے یہ دل مردہ، تشنہ کام
انعام میں بھی میں تمھیں پانی نہ دے سکا
کچھ تم کو، اے رسولؐ کے ثانی، نہ دے سکا

گہرے لگے ہیں زخم بدن پر کہاں، کہو　　کچھ تو زبان سے مرے آرامِ جاں، کہو
تکلیف کس جگہ ہے بہت، جانِ جاں کہو　　سینے میں چبھ گئی ہے کہاں پر سناں، کہو
بولو تو کچھ دوا کی کروں فکر جاکے میں
پانی تمھیں پلاؤں کسی طرح لاکے میں

اے وارثِ شجاعتِ حیدرؑ! جواب دو　　چلا کے تھک گیا ہوں میں، اکبر جواب دو
اے لال! اے شبیہِ پیمبرؐ! جواب دو　　اے نطقِ حق، کلام کے جوہر، جواب دو
اعلاں کرے گا حق کا مرے، میری جان کون
آئے گا وقتِ عصر تو دے گا اذان کون

اصغرؑ کو اپنی باتوں سے تم کب ہنساؤ گے ماں منتظر ہے خیمے کے در پر، کب آؤ گے
مرتا ہے باپ، لاش نہ اس کی اٹھاؤ گے صغراؑ کو تم مدینے سے لانے نہ جاؤ گے؟
آیا ہوں کیسے یاں، تمھیں بتلاؤں کس طرح
تم کو اٹھا کے خیمے میں لے جاؤں کس طرح''
خیمے سے نکلی دوڑتی، زینبؑ اسیرِ غم بیٹے سے ہم کلام تھے یاں سرورِ امم
اٹھے گی لاش کیسے، کمر ہوچکی ہے خم یہ فکر تھی جوان کا صدمہ نہیں ہے کم
بچے بھی ساتھ تھے کہ اٹھائیں گے بھائی کو
دل سے لگا کے خیمے میں لائیں گے بھائی کو
اس حادثے پہ بھول گئے صدمۂ پسر دیکھا جو رن میں شاہ نے زینبؑ کو ننگے سر
فرمایا ''زندہ ہوں میں ابھی سیری چارہ گر دوڑے کہ ڈالیں اپنی عبا ان کے دوش پر
اکبرؑ کی لاش اٹھانے کی قوت بھی آئے گی
وقت آئے گا تو لڑنے کی طاقت بھی آئے گی
برچھی لگے گی اور دلِ لالہ فام میں اکبرؑ نے تم کو دیکھا جو اس اژدہام میں
زہراؑ کی بیٹی ننگے سر، انبوہِ عالم میں کیسا خلل پڑا ہے جہاں کے نظام میں
اکبرؑ کو رنج ہو گا بہت، سر چھپاؤ تم
کھولے گا وہ نہ آنکھ، بہن گھر میں جاؤ تم
جلدی بچھائیے مسندِ پیغمبرؐ خدا تم جاؤ، جا کے ماں سے کہو، صبر کر ذرا
ہنستے ہیں پھول سینے پہ زخموں کے جابجا دولھا پہ سج رہی ہے بہت خون کی قبا
ننھے براتی اِس کے اٹھانے کو ہیں کھڑے
دشمن بھی شادیانے بجانے کو ہیں کھڑے
ہے تر زبان اگر چہ بہت تشنہ کام ہے تصویرِ مصطفیٰؐ یہ مرا لالہ فام ہے
اِس کی اذان صبح کا اعلانِ عام ہے یہ نطقِ حق، ضمیر و نظر کا کلام ہے
ہے یہ شکستِ فاش سکوتِ یزید کی
بچو! تم آکے لاش اٹھالو شہید کی''

آئی برات دولھا کی جب دھوم دھام سے مسند بچھائی ماں نے بڑے اہتمام سے
کوئی لپٹ کے روتا تھا ابنِ امام سے ٹکرا رہا تھا سر کوئی چوبِ خیام سے
ماں پوچھتی ہے بیٹے سے تم کیوں خفا ہوئے
تنہا سپاہِ ظلم میں شاہِ ہدا ہوئے

ماں کو تھا ناز، بہنوں کو بھائی پہ تھا غرور تصویرِ مصطفےٰ سے تھا گھر رشکِ کوہِ طور
برچھی کا پھل لگا تو لٹا گلشنِ سُرور دنیا سیاہ ہوگئی، بچھڑا نظر سے نور
اک دن میں فاطمہؑ کا بھرا گھر اجڑ گیا
اس نقشِ حق کے مٹنے سے نقشہ بگڑ گیا

بیٹا تمھیں جو پوچھے گی صغرؑا تو کیا کہوں عابدؑ جو غش سے چونک کے اُٹھا تو کیا کہوں
چھینے کوئی سکینہؑ کا کوزہ تو کیا کہوں رخصت کو آئیں جب شہِ والا تو کیا کہوں
ابنِ علیؑ کے کپڑوں پہ یہ کس کا خون ہے
سر سے ردا ڈھلکتی ہے، کیسا شگون ہے

اٹھارہ سال پالنے والی کو دو جواب نظریں ملاؤں کیسے جو دامن کو پکڑیں خواب
سوتے ہو گہری نیند میں اے میرے آفتاب ہنگامِ عصر آنے کو ہے وہ اذاں شتاب
وہ صبح کی اذاں ہمیں شب بھر جگائے گی
ہوگی سحر تو تیری صدا یاد آئے گی

کیسی ہے یہ برات، براتی ہیں نوحہ گر دولھا بنے ہو کیسے، یہ کس کی لگی نظر
زخموں کے پھول سینے پہ، کپڑے ہیں خوں میں تر لائے دلہن بنا کے شہادت کو اپنے گھر
چومو قدم حسینؑ کے، تم تو فدائی ہو
بہنوں کو نیگ دیتے نہیں کیسے بھائی ہو

یہ کیا غضب ہے، اُمڈے چلے آتے ہیں لعیں تنہا تمھارے باپ کو سمجھی ہے فوج کیں
تم تو ذرا سی بات پہ ہوجاتے تھے حزیں روتے ہیں شاہ، سوتے ہو تم میرے مہ جبیں
آتی ہے آگ خیمۂ عترت کے واسطے
اکبرؑ اٹھو حسینؑ کی نصرت کے واسطے

ماں اور پھوپھی کے خوابوں کا پیکر خموش ہے　　سب رو رہے ہیں اور علی اکبرؑ خموش ہے
حق کی اذاں شبیہِ پیمبرؐ خموش ہے　　شورِ فغاں میں نطق کا جوہر خموش ہے
بوڑھے، عزیز مُردہ، دل افگار ہیں حسینؑ
تھامو رکاب، جانے کو تیار ہیں حسینؑ

کلماتِ خیر اپنی شہادت کے غم میں ہیں　　آیاتِ حق شبیہِ رسالت کے غم میں ہیں
عرش و زمیں شریکِ امامت کے غم میں ہیں　　سجدہ گزار اذانِ صداقت کے غم میں ہیں
اکبرؑ کا غم نہیں ہے، یہ ہے غم حسینؑ کا
اب بے بسی کو کرنا ہے ماتم حسینؑ کا

طبعِ رواں عطا ہے اُسی تشنہ کام کی　　ہے مرثیہ وحیدؔ کا بخشش امامؑ کی
پائی انھیں کے نطق سے دولت کلام کی　　کی ہے جو مدح اکبرؑ عالی مقام کی
یہ دولتِ کلام کبھی رائیگاں نہ جائے
بن کر فقیر در پہ کسی کے زباں نہ جائے

(اگست 1974)

# سالارِ قافلۂ صبر و رضا

(در حالِ بیماری و اسیری امام زین العابدینؑ)

صحتیں تھامتی ہیں دامنِ بیمار کہاں ناتوانی ہے تب و تاب کا اظہار کہاں
رہبر آزادوں کا ہے ایک گرفتار کہاں سرفرازی ہے غمِ طوقِ گراں بار کہاں
کون ہے مانگتے ہیں جس سے گرفتار مدد
چاہتا کس سے ہے ہر حال میں بیمار مدد
کس کی بیماری مسیحائی کا ساماں ٹھہری کس کی بے ہوشی نئی زیست کا عنواں ٹھہری
کس کے بازو کی رسن حق کی رگِ جاں ٹھہری کس کی محرومیِ جاں دولتِ ایماں ٹھہری
کس کی بیماری سے اسلام نے صحت پائی
کس کی خاموشی سے ایماں نے بلاغت پائی
کون محرومِ شہادت ہے شہیدوں کا امام جیتے جی کارِ شہادت کو کیا کس نے تمام
کانپتے ہاتھوں نے کس طرح کیا کارِ حسام کس گرفتار نے بتلایا کہ حاکم ہے غلام
کس کی خاموش شہادت کا تھا محتاج اسلام
نطق سے کس کے بنا نطق کی معراج اسلام

کربلا! خاک تری خاکِ شفا کیسے ہوئی  یہ زمیں سجدہ گہہِ اہلِ وفا کیسے ہوئی
عام یہ دولت گنجِ شہدا کیسے ہوئی  سلطنت شام کی گردِ کفِ پا کیسے ہوئی
کس کی زنجیر میں ہے ظلم کی تلوار اسیر
کس کے قدموں میں ہوئی وقت کی رفتار اسیر

دہمِ ماہِ محرم تو قضا کا دن تھا  گرم بازاریِ خونِ شہدا کا دن تھا
فتحِ تیغ و تبر و تیرِ دغا کا دن تھا  شبِ باطل کی سحر، اہلِ جفا کا دن تھا
کس کی بیمار نگاہوں نے اُگائے سورج
کس کی پلکوں پہ ٹلے خوں میں نہائے سورج

لب شہیدوں کے تھے خاموش، زباں دی کس نے  لاشے بے گور و کفن تھے، اُنھیں جاں دی کس نے
کذب کے شور میں خاموش اذاں دی کس نے  مصلحت بستہ تھے لب، تابِ بیاں دی کس نے
دی سکینہؑ کو فغاں کس کے سکوتِ غم نے
بخشی زینبؑ کو زبان کس کے سکوتِ غم نے

کون لُٹتے ہوئے خوابوں کا نگہدار رہا  کون غم ہائے شگفتہ کا طلب گار رہا
کون سہمے ہوئے اشکوں کا خریدار رہا  کون اُجڑے ہوئے گلزار کا غم خوار رہا
کس کی آنکھیں رہیں اشکوں کی عماری بن کر
کون کانٹوں پہ چلا بادِ بہاری بن کر

بکھرے اوراقِ شہادت کے بہم کس نے کیے  جمع سینے میں دل افگاروں کے غم کس نے کیے
نصب صحرا میں بہاروں کے علم کس نے کیے  ذکرِ مظلوم کے عنوان رقم کس نے کیے
کون تھا، اپنے عزیزوں کو بھی جو رو نہ سکا
عمر بھر صبر کے دامن سے لہو دھو نہ سکا

کربلا والوں سے بھی کس کی رہی پیاس فزوں  کس کو ہر جام نظر آتا تھا اِک جُرعۂ خوں
کس کی آنکھیں رہیں تا عمر فرات و جیحوں  کس نے چالیس برس پایا نہ اِک پل بھی سکوں
کس نے دیکھا جو ذبیحہ تو بھر آئیں آنکھیں
عمر بھر پیاسوں کی کس کو نظر آئیں آنکھیں

کس کی زنجیر کی جھنکار سے نیندیں ٹوٹیں  کس کے ہر نالۂ بیدار سے نیندیں ٹوٹیں
کس کے نطقِ سحر آثار سے نیندیں ٹوٹیں  کس کے خطبات کی تلوار سے نیندیں ٹوٹیں
کس کے گرنے سے ستمگاروں کی سرکار گری
کس کی بے دستی سے جلادوں کی تلوار گری
کون تھا صرصرِ آفات میں شاخِ ثمرسند  کون تھا خاک نشیں ہو کے سلاطیں سے بلند
کون تھا جس کی عبادت رہی معبود پسند  کون تھا اہرمنستانوں میں یزداں بکمند
کس کی بے تیغی سے تلواریں اماں مانگتی تھیں
درد سے کس کے مسیحائیاں جاں مانگتی تھیں
کس کے سجدوں نے دیا دینِ صداقت کو دوام  کس کے سجدے ہیں سرافرازی کا روشن پیغام
کس کے سجدوں سے ہوا حجتِ حق کا اتمام  کس کے سجدوں سے چلا سجدۂ شبیر کا نام
کھاتے ہیں کس کی قسم عابد وزاہد اب بھی
وقت کہتا ہے کسے سیدِ سجاد اب بھی
عابدوں کے لیے زینت ہے عبادت کس کی  ساجدوں کے لیے واجب ہے سیادت کس کی
کام آئی شہدا کے بھی شہادت کس کی  جادۂ صبر نے مانی ہے قیادت کس کی
کس کو خود جابر و ظالم نے بھی صابر مانا
کس کو شبیرؑ سے صابر نے بھی صابر مانا
ایک ہی نام ہے اِن سارے سوالوں کا جواب  ایک بے ہوشی ہے سب جاگنے والوں کا جواب
ایک ہی دل نے دیا شب کو اُجالوں کا جواب  ایک ہی صبر بنا جبر کی ڈھالوں کا جواب
اُسے شبیرؑ نے بھی اپنا نگہدار کہا
صبرِ زینبؑ نے اُسے قافلہ سالار کہا
نطق اشکوں سے وضو کر لے تو لے نام اُس کا  پاک غم اپنا سبو کر لے تو لے نام اُس کا
صدق دل اپنا لہو کر لے تو لے نام اُس کا  ہونٹ جب صبر کی خو کر لے تو لے نام اُس کا
ہر زمانے کی شہادت کا خلاصہ ہے وہ نام
سجدہ و صبر و عبادت کا خلاصہ ہے وہ نام

صدق کے رمز کی تفصیل ہے نامِ سجادؑ دینِ حق کی نئی تشکیل ہے نامِ سجادؑ
جادۂ صبر کا سر خیل ہے نامِ سجادؑ سجدۂ عصر کی تکمیل ہے نامِ سجادؑ
گزرے جس راہ سے سجدوں کے نشاں چھوڑ آئے
لبِ دشمن پہ شہادت کا بیاں چھوڑ آئے

نبوی صبر کا معیار ہے صبرِ عابد تیغِ حیدر سے بڑا وار ہے صبرِ عابد
صبرِ شبیرؑ سے دشوار ہے صبرِ عابد تیرِ اصغر سے بھی پُرکار ہے صبرِ عابد
انتہا صبرِ حسینی کی ہے آغاز اُن کا
صبرِ عاشور میں تھوڑا سا ہے انداز اُن کا

دہر میں رحمتِ عالم کی نظر ہیں سجادؑ ہیں درِ علمِ علیؑ، در کی خبر ہیں سجادؑ
ہیں دعا عشق کی شبیرؑ، اثر ہیں سجادؑ صبر کی تیغ ہیں زینبؑ کی سپر ہیں سجادؑ
غیظِ زینبؑ ہے جلالِ علوی کی شمشیر
صبرِ سجادؑ ہے عفوِ نبوی کی شمشیر

تخت ہے خاک، جو ہے فرشِ زمیں پر صابر جبر پستی میں ہے اور عرشِ بریں پر صابر
خاک بر سر ہے خطا، اوجِ یقیں پر صابر جُرم چُپ، ناطقے کی شاہ نشیں پر صابر
اُن کی نظروں سے گرے، تخت و مناصب ہوئے پست
چشمِ تاریخ میں ہر دور کے غاصب ہوئے پست

جب بھی گھر لُٹتے ہیں، جلتے ہیں محبت کے خیام جب بھی سر کٹتے ہیں، ہوتی ہے زمیں خون آشام
تازیانوں کی زباں کرتی ہے جب قطع کلام رسن و طوق کو یاد آتا ہے زندانِ شام
قید و بند اُن کی اسیری سے سرافراز ہوئے
شرف و فضل پہ زندان کے در باز ہوئے

نامِ حق لیتا ہے انساں یہ طفیل اُن کا ہے زلزلے میں ہیں جو زنداں یہ طفیل اُن کا ہے
حریت ہو گئی ارزاں یہ طفیل اُن کا ہے لبِ اظہار ہے خنداں یہ طفیل اُن کا ہے
انقلاب اُن کے سَلاسل کی فغاں پر اُٹھے
گردِ نعلین کی جھاڑی ہے تو لشکر اُٹھے

ظلم ہے آج بھی برباد بہ فیضِ سجادؑ　　نطق ہے آج بھی آزاد بہ فیضِ سجادؑ
کربلا اب بھی ہے آباد بہ فیضِ سجادؑ　　کعبہ ہے امن کی بنیاد بہ فیضِ سجادؑ
اِن کی خاکِ کفِ پا قبلۂ اہلِ حق ہے
یہ جہاں بیٹھے، وہی کعبۂ اہلِ حق ہے
دینِ حق کارِ خدا ختم تھا، ہوتے جو نہ وہ　　ذکرِ خونِ شہدا ختم تھا، ہوتے جو نہ وہ
مسلکِ صبر و رضا ختم تھا، ہوتے جو نہ وہ　　شرفِ کرب و بلا ختم تھا، ہوتے جو نہ وہ
وہ نہ ہوتے تو نہ ہر لب پہ یہ قصہ ہوتا
کربلا وقت کا بھولا ہوا حصہ ہوتا
اُسی بیمار کو تاب اور تواں نذر کریں　　اُسی غم تشنہ کو ہم اشکِ رواں نذر کریں
اُسی صابر کو متاعِ دل و جاں نذر کریں　　حق اُسی کا ہے، اُسے کون و مکاں نذر کریں
اُن کی آنکھوں میں فُراتِ عطشِ اصغر ہے
اُن کے اشکوں کی ردا فاطمہ کی چادر ہے
نام لیں اُن کا تو خود درد بھی دولت بن جائے　　ہو اسیر اُن کا جو دل، قید بھی راحت بن جائے
ساتھ دیں اُن کا تو رسوائی شرافت بن جائے　　اُن کو سُن لیں تو خموشی بھی خطابت بن جائے
حشم و دولت و زر اُن کی فقیری کا غبار
تاج و اورنگ و سریر اُن کی اسیری کا غبار
اُن کو دیکھیں تو لبِ غم پہ شکایت نہ رہے　　جان لیں اُن کو تو دعوائے فضیلت نہ رہے
اُن کی چوکھٹ جو ملے، خبطِ حکومت نہ رہے　　پائیں جو خاکِ قدم، خواہشِ دولت نہ رہے
غم رہے غم نہ مصیبت کو مصیبت سمجھیں
جور و ناقدریِ دوراں کو ہی عزت سمجھیں
مرض و درد کی شدت ہو تو آتے ہیں وہ یاد　　رسن و قید کی آفت ہو تو آتے ہیں وہ یاد
گھر کے لُٹنے کی اذیّت ہو تو آتے ہیں وہ یاد　　جان سے پیاروں کی فرقت ہو تو آتے ہیں وہ یاد
اُن کے غم بستہ ہیں زنجیرِ ستم سے آزاد
اُن کے وابستہ ہیں زندانِ الم سے آزاد

وہ جو چاہیں تو بنیں تیغِ قضا آہ و فغاں     پیاس کے شور میں ہو چشمۂ شیریں رقصاں
اِک نظر دیکھیں تو وا ہو لبِ قفلِ زنداں     تخت بگر جائیں، نگوں ہوں سرِ شاہانِ جہاں
سیلِ گفتار میں تاریخ کے ابواب بہیں
اُن کے اشکوں میں ستم گاری کے سیلاب بہیں

فیض ہو اُن کا تو ہو جائے زباں زمزمہ خواں     خوش خرامی سے کترنے لگے گُل طبع رواں
تپ غم سے سخنِ غنچہ ہو شعلہ بہ دہاں     جزر و مدخوں کا بنے لفظ و بیاں کا طوفاں
طبع رُکتی ہو تو وہ اُس کو روانی دے دیں
موجِ اشعار کو تلوار کا پانی دے دیں

ضبطِ غم اُن کا غمِ دل کا بیاں بن جائے     صبر اُن کا ہر اشعار کی جاں بن جائے
اُن کا ہر زخمِ نہاں تیغِ زباں بن جائے     اُن کا ہر لفظ معانی کا جہاں بن جائے
ان سے خاموش خطابت کا طریقہ سیکھیں
نطق سے اُن کے فصاحت کا سلیقہ سیکھیں

طبع نے شادیٔ قاسمؑ سے زباں تر کی ہے     شعر نے مدحت عباسؑ غضنفر کی ہے
نطق نے منقبتِ اکبرؑ و اصغرؑ کی ہے     مدحِ بنتِ علیؑ و سبطِ پیمبرؐ کی ہے
اب ہے بے تاب قلم غم سے شفا پانے کو
لکھتا ہے عابدِ بیمار کے افسانے کو

اُن کا افسانہ ہے افسانۂ قتلِ شہدا     اُن کی خاموشی سے ناطق ہیں سب آیاتِ خدا
نقطۂ صبر میں مرکوز ہے کُل کرب و بلا     پھیل جائے تو یہی نقطہ ہے تاریخِ وفا
اسی نقطے کی ہے تفسیر کلامِ زینبؑ
عصرِ شبیرؑ یہی ہے، یہی شامِ زینبؑ

اُن کا اک اشک بھی ٹپکے تو تلاطم کردے     آہ اُٹھے تو چراغانِ تبسم کردے
نطقِ تاریخ کو مسحورِ تکلم کردے     موج ہر مصرع کو، ہر شعر کو قلزم کردے
اُن کی مواج طبیعت کی ہیں موجیں یہ بند
اُن کی بے تیغ قیادت کی ہیں فوجیں یہ بند

ہے اسیرِ لب سجادؑ گرفتاریِ دل ایک بے ہوش پہ بے ہوش ہے ہشیاریِ دل
جائے گی غیر کے در پر نہ وفاداریِ دل صبرِ بیمار بنے چارۂ بیماریِ دل
اشکِ سجادؑ کی تسبیح عبادت ہے بری
ذکرِ بیمارِ شہادت ہی عیادت ہے بری

آہ و فریاد چلیں آنسوؤں کی دھاروں میں قدمِ ضبط اُٹھے ظلم کی تلواروں میں
سخنِ صدق چلے کذب کے درباروں میں سر بکف صبر چلے جبر کے بازاروں میں
ایک بیمار کی طاقت کا بیاں کرنا ہے
اک خموشی کی طلاقت کا بیاں کرنا ہے

چھوڑ کر قبرِ نبیؐ حضرتِ شبیرؑ چلے ہو کے زہراؑ سے جدا صاحبِ تطہیر چلے
شہدا کھینچے ہوئے ہاتھوں میں شمشیر چلے صبر کی ڈھال لیے عابدِؑ دلگیر چلے
یہ مدینے سے چلے رنج و محن کوفے سے
دست و پابوسی کو آتی ہے رسن کوفے سے

چومنے کے لیے گردن کو اُٹھا طوقِ گراں ہتھکڑی دستِ مبارک کے لیے ہے گریاں
بیڑیاں قدموں پہ سر رکھنے کو ہیں نوحہ کناں باہیں پھیلائے ہوئے کرتی ہے زنجیر فغاں
شہدا کے لئے ہے آخری منزل کا سفر
بہرِ سجاد ہے یہ طوق و سلاسل کا سفر

ہے کمر بستہ گُلِ سر سبدِ پنج تنی سفر آمادہ ہے خوشبوئے رسولِ مدنی
گلشنِ فاطمہ کو چھوڑتی ہے گل بدنی لُٹ رہا ہے چمنِ مرتضوی و حسنی
جانے والوں کو بیاباں سفرِ غربت ہے
گھر ہی صغرا کے لیے رہ گزرِ غربت ہے

کہو صغرا سے کہ اکبرؑ کو بھلائیں بی بی علی اصغرؑ کے لیے جی نہ کڑھائیں بی بی
پدر و عم سے بہت دل نہ لگائیں بی بی خیر بس عابدِ مضطر کی منائیں بی بی
چاہنے والے سبھی دشت میں سو جائیں گے
غم گساری کو پلٹ کر یہی اِک آئیں گے

پھر نہ دیکھو گی رُخِ اکبرؑ و اصغرؑ، دیکھو    جا رہا ہے علمِ فاتحِ خیبر دیکھو
تم سے چھٹتے ہیں سدا کے لیے سرور دیکھو    اب جو اُجڑا تو بسے گا نہ بھرا گھر دیکھو
دو ضمانت میں خدا کی علیِ ثانی کو
ہیں یہی اُجڑے ہوئے گھر کی نگہبانی کو

اکبرؑ و اصغرؑ و قاسمؑ ہیں شہادت پہ فدا    وعدہ آنے کا بھی کرلیں تو نہ ہوگا ایفا
دستِ عباسؑ کو باندھے گی سکینہ کی وفا    کوئی پیارا نہیں شبیرؑ کو اُمت کے سوا
رُک نہیں سکتے، شہیدوں کو صدائیں کیوں دو
بد دعا ہے، اُنھیں جینے کی دعائیں کیوں دو

دلِ صغرا کی طرح ہو گیا یثرب برباد    رہ گئی دیکھتی منہ پیاروں کا وہ صبر نہاد
کربلا بس گیا، ویراں ہے مدینے کا سواد    کیا خبر بے وطنوں کو کہ وطن کرتا ہے یاد
دہم ماہِ محرم کو قیامت آئی
امتحانِ غمِ شبیرؑ کی ساعت آئی

اتنے بے صبر تھے مرنے کو شہیدانِ وفا    فکر ہر ایک کو تھی، اوروں سے پہلے ہوں فدا
مرحلہ صبر کا تھا مرنے کی منزل سے کڑا    بار سر اُترے تو ہو بوجھ غموں کا ہلکا
شہدا ہو گئے آزاد کٹا کر سر کو
منزلِ صبر میں سب چھوڑ گئے سرورؑ کو

جمع کرتے رہے غم صبر کے دامن میں حسینؑ    ایک اِک یاد پروتے رہے مژگاں میں حسینؑ
دن تمام آتے رہے گنجِ شہیداں میں حسینؑ    زخموں کو دل سے لگاتے رہے میداں میں حسینؑ
عصر سے قبل ہی پیاروں کا رسالہ نہ رہا
ابنِ زہراؑ کا کوئی چاہنے والا نہ رہا

جانتے تھے کہ ہیں خیموں میں پریشان حرم    اُن کی تسکین کے اسباب بھی کرتے ہیں بہم
آئے خیمے میں بہن کے شہِ افلاک حشم    بی بیوں بچوں نے حلقہ کیا با دیدۂ نم
ایک مظلوم سے وابستہ ہزار امیدیں
حسرتیں روتی تھیں، ہوتی تھیں نثار امیدیں

کبھی بانو، کبھی کلثوم کو سمجھاتے تھے نظریں لیلیٰ سے جو مل جاتی تو شرماتے تھے
اُمِ فروہ کی طرف دیکھ کے رہ جاتے تھے دیکھ کر ضبطِ رباب اور بھی گھبراتے تھے
صبر و دل جوئی کے زینب سے سخن کرتے رہے
اور سکینہ کو منانے کے جتن کرتے رہے
صابرہ بی بیوں سے بولے یہ آخر حضرت ہم بھی تم لوگوں سے ہونے ہی کو ہیں اب رخصت
جس کا کوئی بھی نہیں اُس کا ہے ربُّ العزّت دیتے ہیں اُس کی حفاظت میں ہم اپنی عترت
چھوڑتے ہیں تمھیں زینبؑ کی نگہبانی میں
وہی کام آئیں گی اب دُکھ میں پریشانی میں
کہہ کے یہ ثانیِ زہرا کی طرف پلٹے امام رازدارانہ بہن سے کیے حضرت نے کلام
آئے اِن باتوں میں ایسے بھی کئی سخت مقام رو پڑی چیخ کے بنتِ اسدِ ذوالاکرام
صبر کا فضل و شرف اُن کو بتایا ہوگا
کوفہ و شام کا احوال سنایا ہوگا
باتیں کرتے ہوئے کچھ آگیا حضرت کو خیال رُک کے بانو سے یہ فرمایا کہ اے نیک خصال
میرے عابد، میرے سجاد کا ہے اب کیا حال بولیں شدّت کی حرارت سے ہے بیمار نڈھال
غش پہ غش آتے ہیں، تن ضعف سے تھرّاتا ہے
آپ کو پوچھنے لگتے ہیں جو ہوش آتا ہے
ہم تو صحت سے ہیں، سہہ لیں گے حضور آپ کا غم فکر کچھ کیجیے بیمار کی اے شاہِ امم
آپ کے بعد جفا ڈھائیں گے کیا اہلِ ستم بیٹھ سکتے نہیں وہ، کیسے اُٹھائیں گے قدم
در پے آئیں نہ کہیں اُن کی عیادت کے لیے
قتلِ بیمار بھی آساں ہے شقاوت کے لیے
سن کے یہ کانپ گیا صابر و مظلوم پدر پونچھے رومال سے پلکوں پہ جو تھرّائے گہر
کہا بانو سے، ہے اُن کا بھی محافظ داور کٹ نہیں سکتا کبھی نورِ نبوت کا شجر
دہر میں ہیں وہ محمدؐ کی وصایت کے لیے
حق اُنھیں رکھے گا محفوظ امامت کے لیے

امتحانِ رسن و دار سے ہوں گے وہ جواں    آبلے دشتِ اسیری کے کریں گے درماں
بارِ غم بانٹنے کو آئے گی زنجیرِ گراں    طوق آئے گا تو آجائے گی تاب اور تواں
کرنی ہے قافلۂ غم کی قیادت اُن کو
حشر تک سونپی گئی حق کی سیادت اُن کو

اُٹھے مسند سے یہ کہتے ہوئے سلطانِ مبیں    خیمۂ عابدِ بیمار میں آئے شہِ دیں
دیکھا سجاد ہیں غش میں تو ہوئے اور حزیں    اشک امڈے ہوئے تھے، بیٹھے جو بالیں کے قریں
آنسوؤں نے تپِ ہجراں کی مسیحائی کی
کُھل گئی آنکھیں رُخِ شاہ کے شیدائی کی

دیکھا سجاد نے بیٹھا ہے سرہانے کوئی    جسم سے آتی ہے خوشبوئے رسولِ عربیؐ
لیکن آنکھوں کے لیے شکل ہے انجانی سی    جھرّیاں چشم کے گرد اور ہے عارض پہ نمی
گردن و دست میں رعشہ ہے کمر میں خم ہے
تن ہے آغشتۂ خوں، دیدۂ حیراں نم ہے

تیر پیوستِ بدن، زخموں سے جاری ہے لہو    گرد آلودہ ہیں پیشانی و ریش و ابرو
پیرہن چاک، عبا خستہ، پریشاں گیسو    اور چھلک پڑنے کو بےتاب ہیں آنسو اِک سو
کہا سجادؑ نے مادر سے، یہ کون آیا ہے
کیا مرے باپ کا پیغام کوئی لایا ہے

ماں نے حسرت سے سوئے سیدِ والا دیکھا    مُنہ سے کچھ کہہ نہ سکیں، دل پہ لگا نیزہ سا
روک کر آنسوؤں کو شاہ نے خود فرمایا    باپ کو تم نے بھی اے لال نہیں پہچانا
دیدنی ابن محمدؐ کی زبوں حالی ہے
شکل بھی میری مصائب نے بدل ڈالی ہے

کہا سجادؑ نے گھبرا کے نثار آپ پہ جاں    جنگ کیا چھڑ گئی اے قبلۂ دین و ایماں
ناز تھا جن پہ وہ اصحاب و اعزہ ہیں کہاں    کیسے اس حال کو پہونچے ہیں امامِ ذی شاں
چند ساعات میں کیا حال ہوا ہے بابا
پیرہن آپ کا کیوں لال ہوا ہے بابا

ہے کہاں فوج، رفیقانِ دلاور ہیں کدھر　　قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ سے غضنفر ہیں کدھر
وارثِ دبدبۂ حمزہؑ و جعفرؑ ہیں کدھر　　رلعتِ حق کے امیں، آپ کے حیدر ہیں کدھر
بولے شبیرؑ کہ ہم رہ گئے تنہا بیٹا
مرگئی فوج، علمدار سدھارے بیٹا

پوچھا سجادؑ نے گھبرا کے، کہاں ہیں اکبرؑ　　بولے شبیرؑ کہ نیزے سے چھدا اُن کا جگر
وہ تو وہ مرگئے اصغرؑ بھی میرے ہاتھوں پر　　ہم ابھی آئے ہیں جنگل میں اُنھیں دفنا کر
اب جوانوں میں ہو تم، عمر رسیدوں میں حسینؑ
تن بہ تقدیر ہے اب لاکھوں یزیدوں میں حسینؑ

سُنا بیمار نے جب قتلِ عزیزاں کا حال　　زرد چہرے پہ جھلکنے لگی سُرخیِ جلال
اُٹھیں اک بار نگاہیں سوئے میدانِ قتال　　لے کے انگڑائی اُٹھا فاتحِ خیبر کا لال
بولے مادر سے، مری تیغ منگا دیجیے آپ
کہیے بابا سے، مجھے اذنِ وغا دیجیے آپ

لڑکھڑانے لگے اُٹھنے میں تو ماں نے روکا　　اُٹھ کے خود سیدِ مظلوم نے بازو تھاما
حسرت و یاس سے سجادؑ نے سب کو دیکھا　　اشک اُمڈے ہوئے تھے، دل میں تھا طوفاں ٹھہرا
بولے دل پر جو گزرتی ہے بیاں کیا کیجیے
زندگی بھی ہوئی اب کارِ زیاں کیا کیجیے

ماں نے سمجھایا کہ اے لال ہو تم تو بیمار　　کانپتے ہاتھوں سے کس طرح اُٹھے گی تلوار
تندرست اور توانا ہیں ہزاروں اسوار　　کس طرح زغۂ اعدا میں کرو گے پیکار
زندگی زہر سہی، زہر بھی پینا ہوگا
حکم دیتے ہیں وہ جینے کا تو جینا ہوگا

پاس بیمار کو بٹھلا کے یہ بولے سرور　　جن کو جانا تھا، وہ جا بھی چکے سوئے کوثر
منتظر ہوگا مرا دیر سے میرا لشکر　　تم سے رخصت کے لئے آیا ہے زہراؑ کا پسر
ختم ہے میری امامت ہی پہ شمشیرِ جہاد
کرنی ہے تم کو نئے طور سے تفسیرِ جہاد

زندہ رہنا ہے تمھیں، حق کی حمایت ہے یہی حکمِ قرآں و تقاضائے رسالت ہے یہی
اقتضائے سفرِ کشتیِ امت ہے یہی بعدِ عصر اُٹھے نہ تلوار، امامت ہے یہی
صبر ہی تیغ ہے اب سارے اماموں کے لیے
چھوڑ دو جنگ کے ہتھیار غلاموں کے لیے

جان لو ظالم و جابر کی اطاعت نہیں صبر جھوٹ کے دور میں چُپ رہنے کی عادت نہیں صبر
قید و رسوائی و زندانِ مصیبت نہیں صبر ظلم امت پہ جو ہو، ضبط کی خصلت نہیں صبر
صبر ترکِ عمل و گوشہ نشینی بھی نہیں
ترکِ دنیا بھی نہیں، خانہ نشینی بھی نہیں

زرگری جبر کی بیعت کو کہا کرتی ہے صبر بزدلی خوفِ حکومت کو کہا کرتی ہے صبر
مصلحت قتلِ صداقت کو کہا کرتی ہے صبر گوشہ گیری غمِ عزت کو کہا کرتی ہے صبر
صبر ہے عینِ عمل، روحِ عمل، جانِ عمل
صبر اثباتِ خودی، صبر ہے ایمانِ عمل

کذب کے سامنے اعلانِ صداقت بھی ہے صبر ظلم حاکم ہو تو انکارِ حکومت بھی ہے صبر
جراتِ نطق بھی، پیغامِ بغاوت بھی ہے صبر منزلِ دار و رسن بھی ہے شہادت بھی ہے صبر
صبر سے جیتنا ہے تم کو لڑائی حق کی
لبِ ظالم سے بھی منواؤ بڑائی حق کی

منتقل ہونے کو ہے میری امامت تم پر ڈالنے والا ہے رب بارِ قیادت تم پر
منحصر آج سے احمدؐ کی ہے عترت تم پر فرض ہے خونِ شہیداں کی اشاعت تم پر
تم نہیں جنگ کے، ہو طوق و سلاسل کے امام
ہو ابد تک کے لیے صبر کی منزل کے امام

یہ تو سچ کہتے ہو، جینے سے ہے مرنا آساں منتخب کرتے ہیں دشوار ہی کو منتخباں
مجھ کو تو کرنا ہے اتمامِ شہادت بری جاں میں اگر مرنے نہ جاؤں تو ہے یہ حق کا زیاں
ہے یقیں مجھ کو کہ تم میرا کہا مانو گے
میرے مرنے ہی کو اب حق کی رضا جانو گے

بعد میرے تمھیں ہوگا نہ میسر بستر    خیمے جل جائیں گے لُٹ لُٹ کے بکھر جائے گا گھر
اُترے گی زینبؑ و کلثومؑ کے سر سے چادر    بچوں کے ہاتھوں سے چھن جائیں گے سوکھے ساغر
کوفۂ و شام میں تشہیر تمہاری ہوگی
رسنِ غم میں اسیر آل ہماری ہوگی
نہ جُھکے سر، تمھیں پہنائیں جو زنجیرِ گراں    ہے یہی زیورِ مردانِ خود آگاہ یہاں
صبر کرنا جو مری لاش کو دیکھو عریاں    غم نہ کرنا، نہ ہو گر دفن کا میرے ساماں
چھوڑ کر جاؤ گے بس جسم یہاں پر میرا
ساتھ ساتھ آئے گا سر نوکِ سناں پر میرا
کہا سجاد سے، کیوں رنج سے ہے قلب دونیم    ہے شہادت سے بڑا رتبۂ صبر و تسلیم
تم کو جو کرنا ہے وہ کام بھی ہے ذبحِ عظیم    پھر کیے آپ نے اسرارِ امامت تعلیم
اُن کو شبیرؑ نے جب حق کی امانت دے دی
غم کو اللہ نے بھی صبر کی دولت دے دی
کئی پہروں میں اُٹھائے تھے جو سرورؑ نے ستم    ایک ہی لمحہ میں عابدؑ ہوئے اُن کے محرم
عصر تک جمع کیا جتنا بھی سرمایۂ غم    دے گئے بیٹے کو جاتے ہوئے سب شاہِ امم
ایک ایک غم سے گزرنا نہیں دشوار اتنا
بوجھ اک ساتھ اُٹھاتا ہے یہ بیمار اتنا
صبرِ سجادؑ نے عاشور کے غم اپنائے    جان کر دولتِ جاں رنج و الم اپنائے
جو مصائب بھی پڑے، مثلِ کرم اپنائے    جن سے سرورؑ تھے گریزاں وہ ستم اپنائے
تیغ کا نام نہیں، طعنہ و دشنام نہیں
لبِ صابر کو بجز شکر کوئی کام نہیں
جان شبیرؑ نے دی، شکر کیا عابدؑ نے    آگ خیموں میں لگی، شکر کیا عابدؑ نے
بیڑی پیروں میں پڑی، شکر کیا عابدؑ نے    رسّی ہاتھوں میں بندھی، شکر کیا عابدؑ نے
لُٹ گئی عترتِ شبیرؑ، مگر صبر کیا
چھن گئی چادرِ تطہیر، مگر صبر کیا

صبح جب شامِ غریباں کی کُھلے سر آئی — روزِ عاشور کی ہر موت پلٹ کر آئی
ایک آفت نئی مظلوموں کے سر پر آئی — یاد مجبوروں کو چھنی ہوئی چادر آئی
سر سے کرنوں نے اندھیرے کی بھی چادر چھینی
دولتِ صبر نئے تیر لگا کر چھینی

اپنے کشتوں کو کیا اہلِ ستم نے یکجا — قبریں کھودی گئیں اور غسل کا سامان ہوا
زر کے بندوں نے جماعت کا کیا فرض ادا — پڑھ کے مُردوں پہ نمازیں اُنہیں مدفون کیا
دیں کفن باپ کو، عابدؑ کو یہ مہلت نہ ملی
دفن کردیں شہدا کو، یہ اجازت نہ ملی

جیسے ہی چوٹ پڑی کوچ کے نقارے پر — عازمِ کوفہ ہوا ایک کے بعد اک لشکر
اونٹوں کی پشت پہ بیٹھے صدفِ حق کے گُہر — بیڑیاں پہنے چلا ابنِ محمدؐ کا پسر
نہ عماری تھی، نہ ہودج نہ کجاوہ کوئی
بی بیاں ڈرتی تھیں، گر جائے نہ بچہ کوئی

ساربانوں کو ہوا حکم چلیں مقتل سے — تا کہ آل اپنے عزیزوں کے جنازے دیکھے
گزرے جب گنجِ شہیداں سے حرم کے ناقے — سربریدہ نظر آئے غربا کے لاشے
خود کو مظلوموں نے ناقوں سے گرایا اک بار
عرش کو بچوں کے نوحوں نے ہلایا اک بار

دیکھ کر لاشوں کو پھٹنے لگا قلبِ سجادؑ — باپ کا دفن و کفن ہوتا ہے فرضِ اولاد
بیٹے کو فرصتِ گریہ نہیں دیتے جلاد — ہیں کفن کے لیے محتاج شہِ عرش نہاد
وارثِ غم پہ قیامت کی گھڑی آئی تھی
سفرِ صبر میں منزل یہ کڑی آئی تھی

دلِ ایوبؑ بھی ہوجاتا الم سے پامال — ہوتے یعقوبؑ و براہیمؑ بھی صدمے سے نڈھال
نگہِ رحمتِ عالمؐ کو بھی آجاتا جلال — خود حسینؑ ابنِ علیؑ دیکھ نہ سکتے یہ حال
عابدؑ اس مرحلۂ صبر سے آساں گزرے
ڈگمگائے نہ قدم، غم کے بیاباں گزرے

ہر قدم پیروں سے لپٹی رہی زنجیرِ گراں ہر قدم سُنتے رہے عورتوں بچوں کی فغاں
ہر قدم دل سے گزرتے رہے لاکھوں طوفاں ہر قدم تھے شہدا ساتھ سرِ نوکِ سناں
رہروِ صبر رہے ظلم وستم کے قیدی
مسجدِ کوفہ میں لائے گئے غم کے قیدی
اٹھا خطبے کے لیے بعدِ نماز ابنِ زیاد منبرِ صدقِ محمدؐ پہ گیا کذب نہاد
مسندِ نورِ ولایت پہ چڑھا تیرہ نژاد آیۂ جبر کی تاویل میں تھا ظلم ایجاد
اسی عنواں سے لیا کذب نے شبیرؑ کا نام
ظلم کو اپنے دیا عدل کی شمشیر کا نام
بولا واجب ہے اولی الامر کی طاعت سب پر جو نہ بیعت کرے حاکم کی، وہ ہے تیرہ نظر
باغیِ تخت ہے، اسلام کی حد سے باہر قتل غداروں کے جائز ہے بحکمِ داور
دیکھ لو تختِ حکومت کا سزاوار ہے کون
ہوگئے قتل جو باغی تو خطاکار ہے کون
سرکشی اُٹھی تھی انکارِ حکومت کے لیے قتل شبیر ہوئے تختِ خلافت کے لیے
ہیں اسیر آج جو اُٹھے تھے بغاوت کے لیے قید ہے آلِ علیؑ دیدۂ عبرت کے لیے
اُن کو اللہ نے خواری، ہمیں عزت بخشی
مل گئے خاک میں وہ، ہم کو حکومت بخشی
ایک گوشہ میں تھے سجادؑ جھکائے ہوئے سر جھوٹ جب بڑھنے لگا اپنی حدوں سے باہر
صبر خاموشی سے بولا کہ سن اے تیرہ نظر شرم کر، نامِ خدا لیتا ہے تو بانیِ شر
کون اولی الامر ہے قرآن و محمدؐ سے پوچھ
کون باغی ہے، خلیفہ کے اب و جد سے پوچھ
پوچھ قرآن سے، کس سینے پہ قرآں اُترا پوچھ ایمان سے، کس گھر میں کُل ایماں اُترا
کس کی خاطر عملِ خیر کا عنواں اُترا کس کی تردید کو اللہ کا فرماں اُترا
صاحبِ امر ہیں وہ جو ہیں رسالت کے حلیف
سرکش و مرتد و باغی ہیں حکومت کے حلیف

آج اُسے کہتا ہے اے ابنِ خطا تو باغی	جن کو کہتا تھا نبیؐ حق کا حسینؑ منی
لیتا ہے بے ادبی سے وہی لب نامِ علیؑ	جس نے کی غصبِ خلافت کے لیے فوج کشی
دیکھ تو دیدۂ عبرت سے گرفتاروں کو
سجدہ کر جُھک کے محمدؐ کے جگر پاروں کو

تو جسے کہتا ہے خواری، ہے وہی تو عزت	تو ہے نازاں کہ ملی تجھ کو ستم کی دولت
رب نے فرعون کو نمرود کو بخشی طاقت	دیا موسیٰؑ و براہیمؑ کو دشتِ غربت
پوچھ تاریخ سے، دی حق نے فضیلت کس کو
کس پہ لعنت ہے، ملی دل کی حکومت کس کو

نام حکام کے لکھے گئے غداروں میں	شاہ شامل ہوئے ذلت کے طلبگاروں میں
بے وطن مانے گئے حق کے طلبگاروں میں	شہدا زندہ رہے مر کے بھی تلواروں میں
رفتہ شاہوں کی طرح ظالم و غدار ہے تو
تیرا حاکم ہے ذلیل اور گرفتار ہے تو

پوچھا ظالم نے تیرا نام ہے کیا اے باغی	بولا مظلوم، علی ابنِ حسین ابنِ علی
کہا ظالم نے کہ وہ قتل ہوئے کھا کے انی	بولے عابدؑ، سرے ہم نام تھے ہم شکلِ نبیؐ
ظلم سے تیرے ہی جلادوں نے سر کاٹا ہے
ظلم نے نخلِ محمدؐ کا ثمر کاٹا ہے

بولا ظالم کہ ہے موت امرِ خدائے قہار	خیر و شر، قدر و قضا اُس کی رضا کے اسرار
آدمی امرِ مشیت ہی کا ہے تابع کار	ہم ہیں مجبور، ہے افعال کا خالق مختار
کی ہے تعمیلِ مشیت کی فقط ہم سب نے
سچ تو یہ ہے کہ اُنہیں قتل کیا ہے رب نے

بولا مظلوم کہ یہ جھوٹ ہے اے ظلم شعار	حق نے دی عقل، کیا فعل کا ہم کو مختار
اگر انسان ہے تقدیر کے آگے ناچار	کیوں عمل پر ہی سزا اور جزا کا ہے مدار
عدلِ رب حریتِ فعل عطا کرتا ہے
پھر وہی فیصلۂ حق و خطا کرتا ہے

حق کی آیات نہیں جور و جفا کا پردہ آیۂ جبر نہیں جرم و خطا کا پردا
صاحبِ قدر اُٹھاتے ہیں ریا کا پردا مسلکِ جبر ہے مکر اور دغا کا پردا
قتل سے تیغ سبک دوش نہیں ہو سکتی
کوئی تاویل بھی خوں حق کا نہیں دھو سکتی

سچ کی تلوار سے ظالم کی زباں قطع ہوئی صبر کے ہونٹوں کی تقریر دلوں میں اُتری
آئی ظالم کو نظر کربِ قیامت کی گھڑی مسجدِ کوفہ عزا خانۂ شبیرؑ بنی
اک مؤذن سے کہا حق کا بیاں قطع کرے
نامِ اللہ سے قرآں کی زباں قطع کرے

بولے عابدؑ کہ بڑائی ہے اُسی کو زیبا دی مؤذن نے صدا سب سے ہے اللہ بڑا
بولے عابدؑ، یہی لا ریب ہے ایماں اپنا کہا اُس نے، نہیں معبود کوئی رب کے سوا
نامِ حق وِرد بنا جب لبِ گمراہی کا
سچ پکارا کہ ہے انکار یہی شاہی کا

بولے عابدؑ کہ ہیں بے شک وہ رُسُل کے سردار نام آیا جو محمدؐ کا اذاں میں اک بار
کہا عابدؑ نے یہی نام ہے حق کی تلوار دوسری بار رسالت کا ہوا جب اقرار
بوسے لب لیتے ہیں باہم جو لیا نام اُن کا
حق تو یہ ہے کہ خدا اُن کا ہے اسلام اُن کا

رُک کے بتلا دے ذرا کون محمدؐ کی ہے جاں دی مؤذن کو صدا، ہو چکا حق کا اعلاں
کون ہیں جن کی محبت ہے اصولِ ایماں شان میں کس کی ثناخواں ہے محمدؐ کی زباں
آلِ اطہار کا قرآن میں رتبہ کیا ہے
آیۂ اجرِ مودّت کا تقاضہ کیا ہے

حق کا ہے حُکم، محمدؐ ہی سے ہے آلِ عبا سر جھکایا جو مؤذن نے تو مجمع چیخا
جو محمدؐ کا ہے عاشق، وہ ہے عاشق اِن کا جن کے مولا ہیں نبیؐ، اُن کے ہیں یہ بھی مولا
بولے سجادؑ کہ جو کہتے ہو، ایماں ہے یہی
حُکم احمدؐ کا یہی، معنیٔ قرآں ہے یہی

کس کی عترت ہے اسیروں کی طرح پیشِ نظر　　تم کو معلوم بھی ہے نیزوں پہ ہیں کِن کے سر
جن کے مرنے کا ہے یہ جشن تھے وہ خیرِ بشر　　کِس کی رسوائی کا ساماں ہے سرِ بام و در
قتلِ امامت کو کیا، اجرِ رسالت ہے یہی؟
آل ہے قید، تقاضائے مودّت ہے یہی؟
ضبط کرنے پہ بھی ہونٹوں سے نکل آئی فغاں　　مجمعِ شہر و بازار میں اُٹھا طوفاں
کوئی بولا کہ ہیں سر کِن کے سرِ نوکِ سناں　　کوئی چلّایا کہ ہے آلِ محمدؐ کی کہاں
سب پکارے کہ کچھ اے سیّدِ ذیشاں کہیے
آپ ہیں کون یہ سر کِن کے ہیں عریاں کہیے
سر بہ زانو تھی جہاں عترتِ سلطانِ نجف　　دیکھا سجادؔ نے دروازۂ مسجد کی طرف
عَرَقِ شرم میں ڈوبے ہوئے تھے دُرِّ شرف　　تھے تماشائی در و بام پہ باندھے ہوئے صف
بولے عابدؔ ہدفِ طنز و تماشا ہے آج
آلِ احمدؐ ہی اسیرِ غم و رسوا ہے آج
کوئی شبیرؔ کی جاں ہے، کوئی احمدؐ کا لہُو　　وہ جو اطفال ہیں گُل پیرہن و غنچہ رُو
کوئی بیٹی ہے علیؑ کی، کوئی زہراؑ کی بہُو　　وہ جو ہیں بی بیاں بے مقنع و سر در زانُو
نام گِنواؤں میں کِس کِس کے حیا آتی ہے
وہ نواسی ہے محمدؐ کی جو شرماتی ہے
ہیں وہ سب سلسلہ دارانِ شفیعِ محشر　　نیزوں سے ظلم کی جانب نگراں ہیں جو سر
وہ میرا باپ ہے اور احمدِ مرسلؐ کا پسر　　جس کے رخسارہ پہ ہے گرد، جبیں خون میں تر
فاطمہؑ نے اُسے پالا تھا بڑے نازوں سے
دُور رکھا تھا اُسے رونے کی آوازوں سے
کربلا میں اُسے دیتے رہے جلّاد ایذا　　صبح تا عصر رُلاتے رہے اُس کو اعدا
کوئی بیٹا، نہ بھتیجا نہ برادر ہی بچا　　قتل کر ڈالے گئے اُس کے عزیز و رفقا
میں تھا بیمار تو زنجیر پنھائی مجھ کو
اور رسوائی یہاں کھینچ کے لائی مجھ کو

وہ جو نیزے پہ ہے اک حُسن کا بدرِ تاباں — اُس کے قالب میں پھر اک بار محمدؐ تھے جواں
وہ جو شرماتا ہے اک سمت، ہلالِ زرفشاں — چھ مہینے کا تھا وہ غنچہ لب و تشنہ دہاں
دونوں شبیرؑ کے بیٹے ہیں، برے بھائی ہیں
مائیں دونوں کی یہاں بن کے اسیر آئی ہیں

نام کس کس کے میں لوں اور کروں کس کا بیاں — ان میں اصحاب نبیؐ کے ہیں، علیؑ کے اعواں
کوئی ہے ابنِ حسنؑ، کوئی ہے زینبؑ کی جاں — کوئی ہے فاطمہ زہراؑ کی دعاؤں کا نشاں
جس کا شہرہ تھا بہت، اِن میں وہ جرّار بھی ہے
سرِ نیزہ پسرِ حیدرِ کرّارؑ بھی ہے

کیسی بستی کو اُجاڑا ہے ستم گاروں نے — گھر کو احمدؐ کے لُٹایا ہے جفا کاروں نے
کاٹے سر نور کے ظلمت کے پرستاروں نے — چھین لی چادرِ تطہیر بھی غداروں نے
کوفے آتے تھے کہ حائل ستم ایجاد ہوئے
ہم تمہارے لیے بے خانماں برباد ہوئے

حق یہ ہے مستحقِ اجرِ رسالت ہم ہیں — فرضِ اسلام پہ ہے جن کی مودّت ہم ہیں
دہر میں رحمتِ عالمؐ کی امانت ہم ہیں — حیف ہے تم پہ، تکمیلِ لبِ بیعت ہم ہیں
ہم نے کٹوا دیے سر حق کی حفاظت کے لیے
بیڑیاں پہنی ہیں آزادیِ امت کے لیے

حرفِ حق تیر بنا، بن گئی تلوار نظر — سُرخ دیکھی جو ستم گار نے بیمار نظر
آئے جابر کو بغاوت کے سب آثار نظر — دیکھی پتھر میں بھی ہوتی ہوئی بیدار نظر
بولا خدّام سے قیدی کی زباں بند کرو
جہاں دیکھے نہ کوئی، اِن کو وہاں بند کرو

شمر نے بڑھ کے کیا طوقِ گلوگیر کو تنگ — دستِ ظالم نے کیا حلقۂ زنجیر کو تنگ
نیزوں نے اُٹھ کے کیا نائبِ شبیرؑ کو تنگ — تازیانوں نے کیا صاحبِ تطہیر کو تنگ
اہلِ کوفہ سے کہا کچھ نہ علیؑ زادے نے
بس مدینے کی طرف دیکھا نبیؐ زادے نے

کھینچ کے لائی گئی صحن سے آلِ اطہار صبر کے جرم میں ماخوذ ہوئی زینبؑ زار
پیار سے سہلانے لگی بالی سکینہ رخسار خوں میں ڈوبے ہوئے مسجد سے چلے سجدہ گزار
حق کی آیات ہوئیں کذب کی دیوار میں قید
صبر کے ہونٹ ہوئے جبر کی سرکار میں قید

(حصۂ دوم)

صبرِ عابدؑ نے زباں کھولی جفا کاروں میں　　تیغ زینبؑ کی چلی ظلم کے بازاروں میں
دھوم حق کی ہوئی باطل کے طلبگاروں میں　　کربلا زندہ ہوا قید کی دیواروں میں
قلعۂ شر کو کیا عابدِؑ بیمار نے سر
دل کے قلعوں کو کیا عترتِ اطہار نے سر

دوڑے ہرکارے خبر لے کے سوئے حاکمِ شام　　قید میں آلِ نبیؐ ہے تو پریشاں ہیں عوام
پیدا کوفہ میں ہیں اسباب بغاوت کے تمام　　دیر کی تو نے تو برہم ہے حکومت کا نظام
جلد اس بات میں احکام امیروں کو ملیں
یا تو پروانے رہائی کے اسیروں کو ملیں

آیا دربارِ خلافت کی طرف سے فرماں　　قافلہ قیدیوں کا شام کی جانب ہو رواں
سرِ شہیدوں کے بھی اسباب کے ساتھ آئیں یہاں　　فتح کے جشن سے کرنا ہے دلوں کو شاداں
ننگے اونٹوں پہ خلافت کے طلبگار آئیں
سر کھلے باغی و مقتول کے غمخوار آئیں

نوکِ نیزہ پہ بنِ احمدِ مختارؐ آئے　　بے عماری و ردا عترتِ اطہار آئے
طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے بیمار آئے　　پا پیادہ خلفِ حیدرِ کرارؑ آئے
دیکھنے والوں کی تفریح کا ساماں کردو
راہ کے قریوں میں راتوں کو چراغاں کردو

حاکمِ کوفہ نے کی اپنی طرف سے تعجیل　　بیڑیاں پہنے چلا نازشِ اولادِ خلیلؑ
قریہ در قریہ ہوئی حکمِ ستم کی تعمیل　　ہے اسیری کا سفر کرب و بلا کی تفصیل
روح پر جہلِ تماشا سے تعب ہوتا ہے
گریہ بھی موردِ آفات و غضب ہوتا ہے

کوس غربت کے کڑے ہیں، سفرِ غم ہے طویل ٹھوکریں کھاتا ہوا چلتا ہے کانٹوں پہ علیل
نہ غذا ہے نہ دوا اور نہ پانی کی سبیل ہوتا جاتا ہے گراں طوقِ ستم میل بہ میل
گر پڑیں تھک کے تو نیزوں سے اُٹھاتے ہیں اُنھیں
بیٹھنا بھی جنھیں مشکل ہے بھگاتے ہیں اُنھیں

دیکھ کر بھیڑ تماشائیوں کی غم سے نڈھال نظروں کے تیروں سے گھبراتی ہے شبیرؑ کی آل
عورتیں مُنہ کو چُھپا لیتی ہیں بکھرا کر بال اونٹ جب بھاگتے ہیں، گرتے ہیں کم سن اطفال
منزل آتی ہے تو آلام سمٹ جاتے ہیں
بچے ڈر ڈر کے بزرگوں سے لپٹ جاتے ہیں

ظلم کے نیزے جو ظلمت میں چمک جاتے ہیں ماؤں کی گود میں اطفال دبک جاتے ہیں
ڈھونڈنے نکلیں جو پانی تو بھٹک جاتے ہیں پڑ کے سو رہتے ہیں رستے میں جو تھک جاتے ہیں
عیش سے خیموں میں کرتے ہیں ستم گر آرام
قیدیوں کو نہیں ملتا کہیں دم بھر آرام

راہ میں چین نہ منزل پہ سکوں کے اسباب شام کا رستا ہے طولِ شبِ ہجراں کا جواب
دن میں نظروں کے ستم، رات میں زخموں کا حساب راہ میں دھوپ کے، منزل پہ اندھیروں کے عذاب
جیسے غربت میں اسیروں کو وطن یاد آئے
اِنھیں کوفے ہی کا زندانِ محن یاد آئے

قریوں میں راہ کے میلوں کا سماں مِلتا ہے جشن اسیروں کو بہ اندازِ فغاں مِلتا ہے
عیش کو شمعیں، اُنھیں غم کا دھواں مِلتا ہے رنج ارزانیِ عشرت میں گراں مِلتا ہے
زندگی ہے کہ سفر درد کی بیتابی کا
موت بھی خواب ہوئی دیدۂ بے خوابی کا

ڈرتے ہیں راہ کی آبادیوں سے خانہ خراب دن کے اندیشے رکھا کرتے ہیں شب کو بے خواب
کاٹنے آتا ہے صحراؤں میں پیاسوں کو سراب رات کے خوف رکھا کرتے ہیں دن کو بے خواب
حلقہ کس طرح سے زنجیرِ سفر کا ٹوٹے
کچھ بھی ہو، سلسلہ یہ شام و سحر کا ٹوٹے

مدتیں گزریں کہ ہے دُور وطن سے بیمار    تنگ ہے سختیِ زنجیر و رسن سے بیمار
تھک چکا ہے سفرِ رنج و محن سے بیمار    چل نہیں سکتا ہے زخموں کی جلن سے بیمار
اے قلم ختم کر اس آبلہ پیائی کو
منتظر شام ہے صبحوں کی پذیرائی کو

ٹھہر جاؤ، نظر آثارِ دمشق آتے ہیں    دیکھنے آل کو بازارِ دمشق آتے ہیں
باہیں کھولے در و دیوارِ دمشق آتے ہیں    دید کو مسجد و مینارِ دمشق آتے ہیں
سرِ شبیرؑ کو تکتے ہیں نخیل اُٹھ اُٹھ کر
پائے بیمار پہ جھکتی ہے فصیل اُٹھ اُٹھ کر

پتیوں پھولوں سے گلزار ہے باب الساعات    ٹھہرے گا یاں چمنِ شاہِ رفیع الدرجات
ہے اُترنے کو یہیں قافلۂ اہلِ نجات    داخلِ شہرِ ستم ہوگی یہیں روحِ حیات
بیڑیاں دینے کو تعظیم جُھکی جاتی ہیں
بُرجیاں بھی پے تسلیم جُھکی جاتی ہیں

قافلہ آیا اسیروں کا، ہوئی شہر میں دھوم    ہر طرف سے اُمڈ آیا ہے تماشے کو ہجوم
بالوں سے ڈھانپے ہیں مُنہ زینبؑ وامِ کلثومؑ    ماؤں کی گودیوں میں روتے ہیں ڈر کر معصوم
بھیڑ اتنی ہے کہ دم سب کا گھٹا جاتا ہے
دامنِ صبر بھی ہاتھوں سے چھٹا جاتا ہے

آئے ہیں اسلحے سج سج کے بدن پر بدکار    عورتیں آئی ہیں بن ٹھن کے کیے سولہ سنگھار
ظلم زادوں کے لباسوں میں مچلتی ہے بہار    شور باجوں کا ہے اور خوانچے والوں کی پکار
ناچتا ہے کوئی کرتب کوئی دکھلاتا ہے
کوئی روباہ صفت شیر بنا آتا ہے

طبل اور دف کی صداؤں سے پھٹے جاتے ہیں کان    ہاتھ تلوار کے دکھلاتے ہیں بدمست جوان
شورِ تحسیں میں کوئی دیتا ہے نیزے کو اُٹھان    ہر تماشائی کی سج دھج ہے نرالی، نئی شان
روزن و در ہیں کھُلے چشمِ نظارا بن کر
آئے ہیں خود بھی تماشائی تماشا بن کر

کوئی باندھے ہوئے جوشن، کوئی سلکِ شہوار  کوئی پہنے ہوئے پشواز کوئی پھولوں کے ہار
کوئی دکھلاتا ہے اندازِ زنانِ بازار  پیروں سے اُٹھتی ہے گھنگھرو کی کہیں پر جھنکار
ظلم مسرور ہے، مظلوم کو شرم آتی ہے
بے حسی ہنستی ہے اور غم پہ گھٹا چھاتی ہے

بزدلی رقص میں ہے، ہنستا ہے مُردہ احساس  نشۂ فتح سے مختل ہیں حکومت کے حواس
گیت گاتے ہیں مسرّت کے کہیں بدانفاس  کہیں بٹتی ہے مٹھائی، کہیں زرتار لباس
ساغرِ آب بھی ملتا نہیں معصوموں کو
پیاس یاد آتی ہے شبیرؑ کی مظلوموں کو

بعدِ عاشور بھی بھوکی ہے محمدؐ کی عیال  کھانے پینے کو ہیں ترسے ہوئے اب تک اطفال
رحم کھا کر کوئی کچھ دے تو تڑپ جاتی ہے آل  امّ کلثوم سے دیکھا نہیں جاتا ہے یہ حال
کہتی ہیں مانگ کے کھاتے نہیں اچھے بچے
صبر کر لیتے ہیں زہراؑ و علیؑ کے بچے

راہوں، بازاروں، دُکانوں پہ ہے اک جمِ غفیر  آیا فرمان کہ اب شہر میں داخل ہوں اسیر
منتظر ہیں سرِ دربار ممالک کے سفیر  بولا سجادؑ سے چلنے کے لیے شمرِ شریر
کہا زینبؑ نے تماشائیوں سے بچ کے چلو
نہ ہو جن راستوں میں بھیڑ، اُدھر ہی سے چلو

شمر بولا، اسی دروازے سے چلنا ہے تمھیں  لوگ ہر رستے پہ ہیں جمع کہ تم کو دیکھیں
قیدیوں کے لیے پہلے سے ہیں طے سب راہیں  بولا سجادؑ سے چلنے میں نہ تاخیر کریں
کہا زینبؑ نے کہ اس در سے تو جائیں گے نہ ہم
مجمعِ عام کو حال اپنا دکھائیں گے نہ ہم

تازیانہ لیے شمر آیا قریبِ سجادؑ  ہو کہ مغلوبِ غضب، چیخ اٹھا ظلم نہاد
کہو زینب سے کریں وقت نہ میرا برباد  بولے سجادؑ پھوپھی سے کہ عبث ہے فریاد
کون سی راہ میں رسوائی کے اسباب نہیں
چلیے، دزدوں سے الجھنے کی مجھے تاب نہیں

آ گیا دخترِ حیدرؑ کو بھی اِک بار جلال بول اُٹھی فاطمہؑ کے لہجے میں وہ صبر خصال
بچو فریاد کرو، بی بیو تم کھولو بال میں دعا کرتی ہوں، آمین کہے حق کی آل
ظلم کی حد سے بھی جلاّد بڑھے جاتے ہیں
صبر ہم کرتے ہیں، یہ شیر ہوئے جاتے ہیں

میری مادر کو بھی اک بار جلال آیا تھا بد دعا دینے کا زہرا کو خیال آیا تھا
زلزلہ عرش پہ، دنیا پہ وبال آیا تھا سینۂ بحر میں غصے سے اُبال آیا تھا
پیشِ قہار میں فریاد و بکا کرتی ہوں
ظلم کے مٹنے کی میں آج دُعا کرتی ہوں

بد دعا کے لئے اُٹھے ہی تھے دستِ زینب کہ نظر اُٹھی سوئے فرقِ شہنشاہِ عرب
دیکھا، آنسو ہیں رواں، کہتے ہیں کچھ صبر کے لب کہا بھائی سے کہ ہے روح پہ کیا بارِ تعب
بولے عابد کہ امامِ دو جہاں روتے ہیں
ناریوں کے لئے سردارِ جناں روتے ہیں

سنتا ہوں میں کہ وہ کہتے ہیں، بہن، صبر کرو سہہ لو اُمت کے لئے یہ بھی محن، صبر کرو
بد دعا دنیا نہیں حق کا چلن، صبر کرو غم ہے میراثِ رسولانِ زمن، صبر کرو
سلسلہ ظلم سے حجت کا مکمل کر دو
جاؤ سامان شفاعت کا مکمل کر دو

حکمِ شبیر نے پھر باندھ دیے دستِ دعا جھک گیا پھر سرِ تسلیمِ بناتِ زہرا
کام اُمت کے فدائی نے کیا اُمت کا صبر کا ٹھہرا ہوا قافلہ آگے کو بڑھا
بے ردائی سے کہیں ہوتی ہے عصمت عریاں
سرِ زینب نہیں عریاں، ہے شقاوت عریاں

آئے ہیں ظلم کے دربار میں یوں قیدیِ شام اک رسن میں ہیں بندھے بارہ گلوئے اسلام
پوچھا جب لوگوں نے، تھا سب سے کڑا کون مقام صبرِ عابد نے بھی رو کر کہا الشام، الشام
رسنِ ظلم کی تنگی سے گلا گھٹتا ہے
بچے اُٹھ جاتے ہیں اوپر، جو کوئی اُٹھتا ہے

تخت کے پیچھے ہیں صف بستہ اسیرانِ ظلوم　　گرد استادہ ہیں افواجِ رے و مصر و روم
سر برہنہ ہیں کھڑی زینب و اُمِ کلثومؑ　　طشتِ زر میں ہے دھرا فرقِ حسینِ مظلومؑ
بارِ رسوائی عترت دلِ صابر پہ ہے
قاتلِ سبطِ نبیؐ تختِ جواہر پہ ہے
اک طرف باندھے ہوئے صف ہیں کھڑے تیر انداز　　اک طرف گرز و تبر، ایک طرف تیزے باز
کہیں ریشمیں، کہیں لہرائے ہوئے طرۂ ناز　　پے خوشنودیِ حاکم ہیں زبانیں بھی دراز
کھینچی ہے آہنی دیوار زرہ پوشوں نے
خود سے چہرے چھپائے ہیں ستم کوشوں نے
در پہ استادہ ہیں ماہی و مراتب بردار　　حبشی دستوں کے ہاتھوں میں ہے زنگی تلوار
ظلم کے گرد ہے افواجِ محافظ کا حصار　　جام در دست کنیزانِ رے و روم و تتار
رقص کرنے کو حسینوں کے پرے اُترے ہیں
عجم و قاف کی پریوں کے پرے اُترے ہیں
آئینہ خانہ بنا رکھا ہے ظالم نے مکاں　　ایک اِک ظلم کے ہیں سینکڑوں چہرے رقصاں
ایک کے سَو نظر آتے ہیں ستم کے عنواں　　صبر کے آئینے سے عکسِ نبیؐ کا ہے عیاں
ستم عیش و طرب میں کوئی غم خوار نہیں
کوئی بھی خونِ شہیداں کا خریدار نہیں
غم اسیروں نے چھپائے ہیں خزینوں کی طرح　　لاکھوں یادیں ہیں دبی دل میں دفینوں کی طرح
پلکوں پہ ٹھہرے ہوئے درد سفینوں کی طرح　　آنکھیں اُمڈی ہوئی بارش کے مہینوں کی طرح
نظر اُٹھے تو اُلجھ جاتی ہے ہتھیاروں میں
آہ بھی ڈھونڈھتی ہے راستا دیواروں میں
قہقہہ زار ہے خاموشیِ غم کا مقتل　　شاخیں شمشیر کی، گرز اور سِناں کے جنگل
تیروں کی پنکھڑیاں، ڈھالوں کے گُل، نیزوں کے پھل　　آدمی ایک نہیں، اسلحوں کے دل کے دل
سنگ و فولاد کی ہر سمت گھٹا چھائی ہے
عترتِ خیرِ بشر ہے، غمِ تنہائی ہے

چہرے فولاد کے ہیں، ماتھے ہیں زنجیروں کے　　پاؤں نیزوں کے ہیں اور ہاتھ ہیں شمشیروں کے
چشم و مژگاں ہیں کہ ترکش ہیں بھرے تیروں کے　　سنگ ہیں قلب جوانوں کے، جگر پیروں کے
نظروں کے اُٹھنے میں ہے تیروں کا چلنے کا اثر
سانس لینے میں ہے شمشیروں کے چلنے کا اثر

شہر میں پتھروں کے دیدۂ نم ہے تنہا　　قید میں آہن و فولاد کی غم ہے تنہا
دشت میں پیاس کے دریائے کرم ہے تنہا　　ظلم کی آندھیوں میں شمعِ حرم ہے تنہا
بار عابد پہ ہے انسان کی تنہائی کا
قرض کرتا ہے ادا صبر و شکیبائی کا

اے قلم! نیزۂ و شمشیر کے پہرے سے نکل　　سر جھکائے ہوئے بیمار کے قدموں سے چل
اشک ہوں روشنیِ چشمِ اسیراں میں حل　　سنگ و فولاد کی دیوار کو کاغذ میں بدل
قفلِ لب، شاہرہِ فکر و نظر کھل جائے
یا علیؑ کہتے ہی دیوار میں در کھل جائے

خامۂ قسمتِ عالم کا نگہ دار اُٹھے　　عارفِ لوح و قلم، صاحبِ کردار اُٹھے
تیغِ حق، تیشۂ فرہادِ گرفتار اُٹھے　　مرضیِ ایزدِ باری کا خریدار اُٹھے
قہرِ قہارِ حقیقی کی گواہی کے لیے
ذو الفقار اُترے یزیدوں کی تباہی کے لیے

نقرئی مسندوں پر بیٹھی ہے مروان کی آل　　ہیں غلاموں کے جلو میں اُمرا و عمال
صف بہ صف ہیں سفہا وَ جُہلا و قتال　　غرق آہن میں ہیں فولاد دل و سنگ خصال
شمعِ بیمار پہ ہر تیرہ نظر خنداں ہے
کوئی نظروں کو جھکا لے تو یہی احساں ہے

کُل قبیلوں کے شیوخ و علما آئے ہیں　　مختلف مذہبوں کے راہ نما آئے ہیں
مصر و ایران و حبش سے زعما آئے ہیں　　دوُر کے ملکوں سے اُن کے سُفرا آئے ہیں
سارے عالم کا تماشا ہے نبیؐ کی اولاد
مجرموں کی طرح آئی ہے علیؑ کی اولاد

سرنگوں خاک پہ ہے عرشِ الٰہی کی بہار    بے ردا بی بیوں میں فاطمہ زہرا کا وقار
نائبِ صاحبِ معراج کے رُخ پر ہے غبار    آنکھیں حیدر صفت اور چہرہ محمدؐ آثار
رُعب سے حق کے ہنسی ہونٹوں پہ رُک جاتی ہے
نگہِ ظلم بھی اُٹھتی ہے تو جُھک جاتی ہے

کھیلتی ہے لبِ شبیر سے حاکم کی چھڑی    چلتی ہے ثانیِ زہرا کے کلیجے پہ چُھری
دیدنی ہے پسرِ ہندہ کی خونخوار خوشی    سُنتا ہے کذب کی تقریر کو قرآنِ نبی
حرفِ حق آج ہے محتاجِ بیانِ زینب
بول اُٹھا خونِ شہیداں بہ زبانِ زینب

کرتا ہے قاتلِ حق نشے میں لاف اور گزاف    انتقامِ اُحد و بدر سے دل ہے ناصاف
تیغِ حیدرؑ کے قتیلوں کے ہیں لب پر اوصاف    کرتی ہے بے ادبی فرقِ حسینؑ کا طواف
کرنے کو جھوٹ کا رد تیغِ نبی اُٹھتی ہے
بن کے قرآں کی زباں بنتِ علیؑ اُٹھتی ہے

غیظِ زینب سے لرز جاتا ہے دربارِ ستم    پردۂ کذب اُٹھا دیتی ہے تطہیرِ قدم
سر جھکا لیتے ہیں شرما کے غلامانِ درم    لبِ صابر کی خموشی سے ہے ظالم برہم
ابو برزہ کو محمدؐ کا خیال آتا ہے
سرِ دربار صحابی کو جلال آتا ہے

صبرِ سجاد نے دی جد کے صحابی کو زباں    بول اُٹھے وہ کہ ہٹا اپنی چھڑی اے ناداں
بوسہ گاہِ نبویؐ تھے یہی لب اور دنداں    حشر کا خوف بھی تجھ کو نہیں اے تیرہ دہاں
لعنتِ دہر ہے اس بے ادبی کی پاداش
ابدی آگ ہے بیعت طلبی کی پاداش

دیکھ کر غیظ سے دربار کو، کہتا ہے امیر    دیکھ لیں دیدۂ عبرت سے کبیر اور صغیر
قتل کرواتی ہے طمع و طلبِ تاج و سریر    سرکشی گھر کو لٹا دیتی ہے مثلِ شبیرؑ
مرتکبِ جُرمِ بغاوت کا سزا پاتا ہے
قیدِ رسوائی میں خود آل کو دے جاتا ہے

مُڑ کے پھر زر کے غلاموں کی طرف بے توقیر    بولا کیا مشورہ دیتے ہیں حکومت کے مُشیر
ہو بغاوت بھی فرو، پائیں سزائیں بھی اسیر    قیدیوں کے لئے تجویز کرو کُچھ تدبیر
طمعِ زر بولی، انہیں دار پہ کھنچوا دیجے
عورتوں بچوں کو دیوار میں چُنوا دیجے

یاس سے بچوں نے دیکھا صفِ اعدا کی طرف    بی بیاں ڈر کے بڑھیں عابدِ تنہا کی طرف
ہاتھ زینب کے اُٹھے عرشِ معلّا کی طرف    دیکھا سجاد نے تختِ ستم آرا کی طرف
نظروں کو پھیر لیا ڈر کے ستم کوشی نے
سی دیے ظلم کے لب صبر کی خاموشی نے

گوشۂ خاک سے زنجیر کی جھنکار اُٹھی    ہتھکڑی تھامے ہوئے دستِ عزادار اُٹھی
بیڑی پکڑے قدمِ عابدِ بیمار اُٹھی    طوق کے حلقے سے آواز کی تلوار اُٹھی
اُٹھے سجاد تو خود احمدِ مختارؐ اُٹھے
تیغ کو تولے ہوئے حیدر کرارؑ اُٹھے

روحِ سقراط ہوئی شانِ اسیری پہ فدا    دار سے عیسیٰ مریمؑ نے کہا صلِّ علیٰ
بولے گوتم کہ ہے نروان انہی کا صدقا    آئی آوازِ نبی تجھ پہ فدا صبر و رضا
انبیاؑ کو بھی یہ شوکت یہ سعادت نہ ملی
شہدا کو بھی یہ رتبہ، یہ شہادت نہ ملی

ایک بے مایہ سے پسپا ہے غرورِ دولت    ایک بیمار سے بگڑی ہے ستم کی صحت
ایک تنہا سے ہراساں ہے جفا کی کثرت    ایک قیدی کا گرفتار ہے زعمِ طاقت
طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا غم اُٹھتا ہے
ہتھکڑی پہنے شہیدوں کا علم اُٹھتا ہے

فوجِ صابر کا علم چادرِ تطہیر کا غم    ان کے لشکر کا نشاں ہے سرِ شبیرؑ کا غم
ان کی تلوار دلِ زینبِ دل گیر کا غم    ان کے تیر اور کماں مادرِ بے شیر کا غم
وقت مرکب ہے، عناں صبر، زباں ہے مہمیز
راکبِ حق کو اسیروں کی فغاں ہے مہمیز

حاکمِ شام سے فرمایا کہ او تیرہ قبا　　اپنے خدام سے تو مشورہ کرتا ہے کیا
قتل شبیرؑ ہوئے، قید ہوئی آلِ عباؑ　　مطمئن اب بھی نہیں ہوتے ہیں تیرے وزرا
زندگی تیرے لئے موت کا اِک سایا ہے
عیش سمجھا ہے جسے، درد کا سرمایا ہے
سُن لیا تو نے کہ کیا کہتے ہیں اصحابِ جلیل　　پوچھتا کیا ہے غلامانِ تملُّق سے ذلیل
مشورہ تیرے مشیروں کا ستم کی ہے دلیل　　ظلم سے ظلم کی کرتے ہیں ستم گر تاویل
اِن کے عقل و دل و ایمان پہ بندش ہے تری
نام اللہ کا لیتے ہیں، پرستش ہے تری
بندے فرعون کے بہتر تھے وزیروں سے ترے　　اس کے دربار میں جب موسیٰؑ وہارونؑ پہنچے
سوچا مغرور نے سر قطع کرے دونوں کے　　بولے ظالم سے مُشیر اُسکے وہ ایسا نہ کرے
بات کرتے ہیں ترے دل کی مصاحب تیرے
بولتے ہیں ترے سرچڑھ کے معائب تیرے
کہتے ہیں خود کو مسلماں تیرے منظورِ نظر　　عہدِ وحشت کے درندے بھی تھے ان سے بہتر
تیغ کفار بھی اُٹھتی نہیں بیواؤں پر　　کوئی وحشی بھی نہیں کاٹتا بچوں کے سر
آج تک ہم پہ ہوئی جو بھی جفا، کافی ہے
تیری رسوائی کو بس کرب و بلا کافی ہے
شہر میں تیرے ہوئی آلِ محمدؐ رسوا　　تڑپے گی روحِ نبیؐ، یہ بھی نہ تو نے سوچا
کھینچتے لائے ہیں بازار سے مجھ کو اعدا　　نہیں مفرور غلاموں پہ بھی ظلم ایسا روا
قرشی خوں کی حمیت بھی نہیں ہے تجھ میں
بدوؤں کی سی شرافت بھی نہیں ہے تجھ میں
سوچ فرعون سے طاقت نہیں تیری بڑھ کر　　رتبے ہیں موسیٰؑ و ہارونؑ سے ہمارے برتر
خون اطفال و حرم کا تو نہ لے گردن پر　　کُچھ تو انجامِ حکومت پہ بھی رکھ اپنی نظر
خوں کی اک بوند بھی ٹپکی تو قیامت ہوگی
مُلک تو مُلک ترے گھر میں بغاوت ہوگی

کتنے نمرود و سکندر ہیں زمیں کے پیوند خاک کے کیڑوں کو سرتاج وروں کے ہیں پسند
تخت دیمک کی غذا، قصر قضا کی ہیں کمند قبر کرتی نہیں تفریقِ نگوں سار و بلند
لقمے کی طرح سے قاروں کو نگل لیتی ہے
قبر بھی قے کی طرح زر کو اُگل دیتی ہے
ایک سے ایک بڑے لشکر و سلطاں اُٹھے فوج کے ساتھ شہنشاہ بھی خوں میں ڈوبے
طنطنے خاک، حشم گرد، علم سرد ہوئے ریت کی طرح اُڑیں سلطنتیں جھونکوں سے
مثل خاشاک کے فرعون بھی بہہ جاتا ہے
تخت ہر جائی ہے، دنیا ہی میں رہ جاتا ہے
اقتدار آیا اگر ہاتھ تو اِترانا کیا طاقت اک موجِ ہوا، موج کا ہاتھ آنا کیا
جو کسی کی نہیں، اس کے لئے یک جانا کیا خس و خاشاک کا طوفان سے ٹکرانا کیا
جلتا ہے کس کا دیا وقت کے طوفانوں میں
بے کسی روتی ہے شاہوں کے شبستانوں میں
ہے حکومت تیرے پاس آج تو کل اور کے پاس ریت کی لہروں پہ ہے قصرِ مظالم کی اساس
بھیک منگواتا ہے در در کی ہوس کا افلاس کام آئے گا کفن کے بھی نہ زر تار لباس
تخت جس روز کسی اور کے گھر جائے گا
چھوڑ کر تجھ کو ہر اک بندۂ زر جائے گا
عمرِ انساں ہے شجر اور حجر سے بھی حقیر قبرِ معمار کے کام آئی ہے خشتِ تعمیر
معدنِ سنگ بھی ہے شاہی خزانوں سے امیر خاک سے مانگتے ہیں رزق شہنشاہ و فقیر
ایک دو گھونٹ سے تو نشے میں چُور اتنا ہے
صرف دو روزہ حکومت پہ غرور اتنا ہے
ہم ہیں وہ، قید رہیں یا کہ ہوں مقتولِ جفا ابدیت ہے ہر اک حال میں خاکِ کفِ پا
رزق دیتا ہے شہیدوں کو عدم میں بھی خدا زندگی بھی ہے تری قید، قضا بھی ہے سزا
چاہیے آبِ بقا خون کو دھونے کے لئے
عمر مہلت بھی نہ دے گی تجھے رونے کے لئے

چیخ اُٹھا پاگلوں کی طرح یزیدِ بد گو سامنے سے مرے لے جائے کوئی قیدی کو
آلِ شبیر کے ساتھ اس کو بھی محبوس کرو ہونٹ بھی کُھل نہ سکیں، تنگ جگہ ایسی ہو
چابکوں نیزوں کے سایے میں سرافراز گئے
سوئے زنداں ابد انجام، ازل آغاز گئے
سفرا سکتے میں، حیراں تھے نصاریٰ و یہود اب ہوا علم کے مارے گئے وہ صاحبِ جود
جن سے قائم ہے زمانے میں محمدؐ کا وجود جن پہ اللہ نے بھیجے ہیں سلام اور درود
کیسی امت ہے ، مثالی ہے جو آثارِ نبیؐ
شرم ہے، قید میں ہے عترتِ اطہارِ نبیؐ
سخنِ صبر نے دی فکر و نظر کو دعوت اپنے شرمندہ ہوئے، غیر غریقِ حیرت
پہلے سرگوشیوں میں، پھر ہوئی کُھل کر لعنت پہلے سینوں میں، پھر امصار میں بھڑکی نفرت
قریہ قریہ ستم و جور کی شہرت پھیلی
شہر کی آگ کے مانند بغاوت پھیلی
لب بہ لب سینہ بہ سینہ ہوا غم کا چرچا سخنِ زینب و سجاد اکارت نہ گیا
طشت از بام ہوا سانحۂ کرب و بلا ذکر سے قیدیوں کے دارِ خلافت گونجا
شرَ کا جشن کے خود اپنے سے شرمانے لگے
قید خانے کی زیارت کو ہجوم آنے لگے
قید خانہ ہے کہ اک نقطے پہ سمٹی ہوئی رات ایک در، بند ہے وہ بھی صفتِ بابِ نجات
پست چھت اتنی ہے جس طرح جفا کی اوقات ایسی تنگی ہے کہ جیسے کسی مُجرِ رس کی ذات
وہ سیاہی ہے دلِ شمر کا عالم جیسے
گھر میں بوجہل کے ایماں کا گھٹے دم جیسے
سنگ ہائے دلِ قتال سے ترشی دیوار شہرِ ساکت کی طرح بند دریچوں کی قطار
لبِ مفسد کی طرح زہر بھرے کژدم و مار چشمِ حاسد کی طرح پھیلا ہے کینے کا غبار
جرم کے بوجھ سے چٹخی ہوئی شہتیریں ہیں
کچے دھاگے سے لٹکتی ہوئی شمشیریں ہیں

لبِ کاذب کی طرح صدق کا دروازہ بند    ذہنِ جاہل کی طرح نور کا ہر رستا بند
چشمِ ظالم کی طرح آنسوؤں کا جادہ بند    دلِ مجرم کی طرح خیر زبون و پابند
دھوپ اُترتی ہے نہ آتے ہیں ہوا کے جھونکے
در سے ٹکرا کے پلٹتے ہیں صبا کے جھونکے

قیدیوں کے لیے خورشید ہے اِک اِک روزن    چشمِ نم کو نہیں مِلتا ہے ہوا کا دامن
رکھتی ہے جاڑے میں گرم آہوں کو سینے کی جلن    پلکوں سے چھنتے ہیں، آ جائے بھٹک کر جو کرن
فرش و دیوار ہیں سیلے ہوئے، برفیلی چھت
توشک اینٹوں کی، رضائی کی جگہ گیلی چھت

سقف و دیوار و در و فرش سے آنچ آتی ہے    آئے گرمی تو پسینے کی قبا لاتی ہے
حبس سے سانس بھی سینے ہی میں رک جاتی ہے    دن کے انگاروں کو شب اور بھی دہکاتی ہے
اشک بھی ٹپکے تو دامن سے دھواں اُٹھتا ہے
بوند سے سینۂ تنور کہاں بجھتا ہے

ابر دو چار گھڑی روئیں تو چھت رات تمام    آئے بارش تو برستے ہیں فلک سے آلام
دن کو معدوم سکوں، رات کو آرام حرام    فوجیں کیڑوں کی اُبلتی ہیں زمیں سے سرِ شام
وئی موسم ہو، کوئی رُت ہو، مہینا کوئی
نظر آتا نہیں جینے کا قرینا کوئی

تنِ لاغر کو کیا شدتِ گرما نے نزار    جسمِ بیمار پہ سردی نے کیے لاکھوں وار
عورتوں بچوں کی تکلیف سے ہے قلب فگار    مینہ کے چھینٹوں سے کچھ اور بھڑک اُٹھا بخار
سلسلہ شام و سحر کا بھی ہے زنجیر کی قید
کس مشقت کی سزا ہے فلکِ پیر کی قید

بیڑیاں پہنے، اُٹھائے ہوئے زنجیر کا بار    درِ زنداں پہ کھڑا رہتا ہے دن بھر بیمار
گھومتے پھرتے ہیں آزاد صغار اور کبار    ہونٹوں پر شکرِ خدا، سامنے ہنستا بازار
صرف اک جراتِ اظہار نہیں ہے آزاد
غمِ اُمت کا گرفتار نہیں ہے آزاد

راہگیر آتے ہیں، رُکتے ہیں، گزر جاتے ہیں پہرے داروں کی نظر دیکھ کے ڈر جاتے ہیں
جن میں ہے ذوقِ تجسس وہ ٹھہر جاتے ہیں جن میں جرات ہے وہ دو باتیں بھی کر جاتے ہیں
دست و پا بستہ ہیں، پر ہونٹ گرفتار نہیں
دلِ آزاد کو خوفِ رسن و دار نہیں
جاننے والے نظر آئیں تو گھبراتے ہیں پوچھتا ہے جو کوئی نام تو شرماتے ہیں
نام لینے میں گھرانے کا جھجک جاتے ہیں کوئی پوچھے جو وطن، سوچ کے فرماتے ہیں
درِ زنداں کے سوا اب کوئی در یاد نہیں
خاندان اور وطن کیا، ہمیں گھر یاد نہیں
زلفیں اُلجھی ہوئی، رخسارِ بہار آلودہ رات دن جاگنے سے چشم خمار آلودہ
پیرہن چاک ہے عمامہ غبار آلودہ خون سے ہے قدمِ عرش وقار آلودہ
چہرہ خود اپنے بزرگوں کا پتا دیتا ہے
کس گھرانے سے ہیں، لہجہ ہی بتا دیتا ہے
کوئی کہتا ہے پیمبر سے ہے شاید قربت کہتے ہیں سوچ کے ہاں، میں بھی ہوں فردِ اُمت
کوئی کہتا ہے علی سے ہے مشابہ صورت کہتے ہیں نام کو میرے ہے اُنہی سے نسبت
طرزِ اخلاق بتاتا ہے اب وجد کا نشان
فقر کی شان سے ملتا ہے محمد کا نشان
پھوپھیاں گھبرا کے پکاریں تو پلٹ جاتے ہیں بہنیں باہوں سے لپٹ جائیں تو تھرّاتے ہیں
بچے مچلیں تو اُنہیں گود میں لے آتے ہیں لے کوئی نام سکینہ کا تو غم کھاتے ہیں
قید میں گھٹتی تھی شبیر کی پیاری بیٹی
باپ سے ملنے سوئے خُلد سدھاری بیٹی
جرمِ گریہ کی سزا پاتی رہی غنچہ دہن غسل دینے میں کُھلا یہ کہ ہے مجروح بدن
جسم سے اُترا نہیں خوں سے بھرا پیراہن تن سے چپکا ہوا ملبوس بنا اُس کا کفن
کُنجِ زنداں میں وہ سوتی ہے، جگائیں کیسے
ہوں رہا بھی تو اُسے چھوڑ کے جائیں کیسے

اک برس ہونے کو آیا ہے سکینہؑ کو گئے ہو چکا سال سے اوپر شہدا کو گزرے
دن مہینوں میں بدلتے رہے، موسم بدلے گرمی و سردی و باراں کے ستم جھیل لیے
پیرہن کی طرح قیدی کے سلاسل بدلے
گزرا وقت اتنا کے جلادوں کے بھی دل بدلے
فتح کے جشن نے فاتح سے نگاہیں پھیریں وقت کی چلتی ہوئی تیغ نے نظریں بدلیں
عرقِ شرم میں ڈوبی ستم آلودہ جبیں ساغرِ عیش میں زہراب کی بوندیں ٹپکیں
انتقامِ شہدا بھیس بدل کر نکلا
تعزیہ خانہ جفاکار کا خود گھر نکلا
کوئی زنداں میں جو اشکوں کے گُہر بوتا ہے شب کو اُٹھ اُٹھ کے ستمگر بھی لہو روتا ہے
ضبط سے بوجھ ندامت کا فزوں ہوتا ہے شرم کے اشکوں سے دامن کو شقی دھوتا ہے
قید خانے سے جو آوازِ بکا آتی ہے
دلِ قاتل سے بھی ماتم کی صدا آتی ہے
بھیجتا ہے بنِ مرجانہ پہ دشنام ذلیل اب بھی جُرم اپنا نہیں مانتا بے حجت و حیل
اوروں کے ظلم سے کرتا ہے ستم کی تاویل بے گناہی کے لئے لاتا ہے غفلت کی دلیل
اب بھی سینے میں ہے وہ آگ جلا دے کعبہ
کرے پامال مدینے کو تو ڈھا دے کعبہ
عذر کرتے ہیں بہی خواہِ ستم گر اب بھی حاکمِ شام ہے قتلِ بنِ زہرا سے بری
ابن مرجانہ ہے قاتل تو سزا دی ہوتی کئی صوبوں کی حکومت اُسے پھر کیوں بخشی
روئے یا عذر کرے قاتلِ اسلام یزید
دونوں دنیاؤں میں ہے قابلِ دشنام یزید
کہتے ہیں لوگ علانیہ کہ ظالم ہے یزید حکم نے اُس کے کیا ابنِ محمدؐ کو شہید
قیدِ عترت ہے خود اس جرم و خطا کی تائید گر ندامت ہے تو کیوں آل پہ ہے ظلم مزید
پھنس گیا آپ ہی گردابِ جفا کاری میں
قصر قاتل کا بھی ڈوبا ہے عزاداری میں

مکّے سے ابنِ زبیر اُٹھے خلافت کے لیے    لوگ کوفے میں ہیں آمادہ بغاوت کے لیے
جلسے ہوتے ہیں اسیروں کی حمایت کے لیے    مضطرب اہلِ مدینہ ہیں امامت کے لیے
گردنِ ظلم کو خود پکڑے نہ زنجیر کہیں
ہر شکن تیغ کی بن جائے نہ شمشیر کہیں

لاکھ بندش ہو، مگر صبح سے لے کر تا شام    دیکھنے آتے ہیں عابد کو خواص اور عوام
عورتیں زینبؑ و کلثومؑ کو کرتی ہیں سلام    بچے اطفالِ محمدؐ کے لیے لاتے ہیں جام
پہرے داروں کا بھی وہ رعب نہیں، داب نہیں
سختیاں کرنے کی جلاّدوں میں بھی تاب نہیں

مشورے کرتا رہا اپنے غلاموں سے یزید    رائگاں ہو گئے انعام کے سب وعد و وعید
ظالموں سے بھی مدد کی نہ رہی جب اُمید    آخر اک روز رہائی کی اُٹھائی تمہید
قیدیوں کے لئے دل جوئی کے پیغام گئے
درِ زنداں پہ غلامانِ شہِ شام گئے

ہتھکڑی کھولی گئی بیڑیاں کٹوائی گئیں    لپٹیں قدموں سے اُترنے کے لئے زنجیریں
طوق نے چوما گلو ہو کے جدائی سے حزیں    ساتھ بیمار کا چُھٹتا ہے، سلاسل ہیں غمیں
خلعتِ شاہ سے ہے فقرِ حشم کو انکار
نئی پوشاک پہننے سے ہے غم کو انکار

ہوئی دربار میں بیمارِ ستم کی طلبی    تخت سے اُٹھی ادب کے لیے خود بے ادبی
آیا غاصب کو خیالِ شرفِ آلِ نبی    ایک مسند پہ امامؑ، ایک پہ ہے بولہبی
نام مقتول کا قاتل بہ ادب لیتا ہے
پُرسا مظلوم کو خود ظلم کا لب دیتا ہے

حاکمِ شرع ہے پہنے ہوئے ملبوس نیا    بر میں عابد کے ہے اب بھی وہی زخموں کی قبا
سرِ اقدس پہ وہی سبز عمامہ غم کا    ہے رفیقِ سفرِ صبر وہی کفشِ پا
وہی شان اور وہی شوکت جو اسیری میں بھی تھی
وہی چہرے پہ جلالت جو اسیری میں بھی تھی

شکر ہر بات پہ کرنے میں پیمبر کی شان　　تخت اور تاج کو ٹھکرانے میں حیدرؑ کی شان
حلم اور عفوِ خطاپوش میں شبّر کی شان　　سر بلندی میں شہیدانِ دلاور کی شان
خامشی میں ہے شہیدِ ازلی کا لہجہ
بات فرمائیں تو یاد آئے علیؑ کا لہجہ

وہی حاکم، وہی دربار، وہی ہیں امرا　　وہی سجاد، وہی غم، وہی یادِ شہدا
مگر آتی ہے نظر بدلی ہوئی آج فضا　　سرنگوں نیزے، کمانوں کا ہے چلّا اُترا
کرسیاں دینے کو تعظیم جُھکی جاتی ہیں
ہو کے خم تیغیں بھی تسلیم بجا لاتی ہیں

جرم کہتا ہے کہ اے سیدِ عالی اوصاف　　قتلِ شبیر ہوئے میری ہدایت کے خلاف
بھول تھی میری، جو نشے میں کیے لاف وگزاف　　درگذر کیجیے گنہ گار کو تقصیر معاف
آپ کی قید نے دل کو میرے بے چین کیا
راتیں شاہد ہیں کہ خاطی نے بہت بین کیا

آپ ہی وارثِ فرزندِ نبیؐ و زہراؑ　　آپ ہی قافلہ سالارِ اسیرانِ بلا
خوں بہا لیجیے، کر دیجے بحل میری خطا　　پیشِ خدمت ہے جواہر سے بھرا طشتِ طلا
مانگنے میں کوئی منصب بھی نہ شرمایئے آپ
جو علاقہ ہو پسند آپ کو، فرمایئے آپ

سر جھکائے ہوئے سنتے رہے عابد یہ کلام　　خوں بہا کا جو ہوا ذکر، تو کانپ اُٹھے امام
بات پر منصب و جاگیر کی لرزے اندام　　دیکھا نظروں سے ملامت کی سوئے حاکمِ شام
صبر کے لب سے کہا تیرے ستم بھی ہیں گراں
اور الطاف و عنایات و کرم بھی ہیں گراں

خوں بہا دیتا ہے فرزندِ نبی کا مجھے کیا　　کرتا ہے منصب و جاگیر سے خوں کا سودا
خونِ شبیرؑ سے آلودہ ہے یہ طشتِ طلا　　سرِ شبیرؑ کی قیمت نہیں ساری دنیا
خوں بہا بیٹے کا محشر میں نبیؐ کو دینا
طشتِ زر حشر میں زہراؑ وَ علیؑ کی دینا

کہتا ہے تو بنِ مرجانہ ہے شہ کا قاتل     عذر یہ روزِ جزا کی جیو پیشِ عادل
بصرہ و کوفہ میں ہے اب بھی وہ تیرا عامل     عمر و شمر ہیں اب بھی امرا میں شامل
قاتلوں کو دیے منصب، ہمیں غم دیتا ہے
نئی تکلیف ہمیں تیرا کرم دیتا ہے

تیرے جاگیر و مناصب ہیں ندیدوں کے لیے     کھول دوکانِ طلا نقرہ گزیدوں کے لیے
تخت اور تاج مبارک ہوں یزیدوں کے لیے     دولتِ فقر ہی کافی ہے شہیدوں کے لیے
تیرا احسان بھلا اہلِ عطا کیوں لیں گے
شاہ کونین کے جاگیر خطا کیوں لیں گے

محسنِ فقر سے بے شرم کو بھی شرم آئی     سر جھکا کر کہا اے سیّدی و مولائی
آپ کے صبر نے ہر بات بری ٹھکرائی     کوئی بخشش بری منظور نہیں فرمائی
مجھ سے کچھ لیجے، نہ لیجے، مجھے اصرار نہیں
اپنے سامان کے لینے سے تو انکار نہیں

کہا عابدؑ نے کہ منگوا دے ہمارا اسباب     حشر میں پنجتنِ پاک کو دینا ہے حساب
اس میں ہے پیرہنِ سیّدۂ عرش مآبؑ     اس میں تطہیر کی ہیں چادریں، عصمت کی نقاب
علَمِ ابنِ علی، تیغِ جگر بندِ نبی
تکیۂ فقرِ علی، مسندِ فرزندِ نبی

کہا شامی نے کہ منگواتا ہوں اسباب تمام     دل جہاں آپ کا چاہے، وہیں فرمائیں قیام
آپ کے واسطے حاضر ہیں محلاتِ شام     اور جانا ہے مدینے کو تو دیجے احکام
محملیں ناقوں پہ تیار ہیں عترت کے لیے
فوج موجود ہے ہمراہیِ حضرت کے لیے

بولے سجادؑ کہ میں مشورہ سب سے کرلوں     پھوپھی زینب ہیں بزرگ اُن سے تو میں پوچھ آؤں
اُن کا جو حکم ہو، تجھ تک ابھی پہونچاتا ہوں     کہہ کے یہ مسندِ شاہی سے اٹھا صبر و سکوں
کرسیاں چھوڑ کے تعظیم کو دربار اُٹھا
اپنے قیدی کے لیے تخت سے غدار اُٹھا

لوٹ کر خانۂ زنداں میں گرفتار آیا     ہجرِ شبیر کے بیماروں میں بیمار آیا
سر جھکائے ہوئے بادیدۂ خونبار آیا     بنتِ عصمت کے قریں صبر کا سالار آیا
بولے، ہم آج ہوئے قیدِ جفا سے آزاد
آپ ہیں بندشِ فریاد و بکا سے آزاد
چاہیں گر آپ تو اس شہر میں کچھ روز رہیں     بار رُکنا ہے اگر یاں تو مدینے کو چلیں
بولی زینبؑ، ہے مناسب یہیں کچھ دن ٹھیریں     ملے گر ایک مکاں مجلسِ شبیرؑ کریں
رونے کی طرح شہیدوں کو نہیں روئے ہیں
ایک شب چین سے بچے بھی نہیں سوئے ہیں
ہو مُناسب تو ستمگر سے یہ کہدو بیٹا     بھیج دیں ہم کو شہیدوں کے سر اربابِ جفا
اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں سے تو مل لیں ورثا     فاطمہ زہراؑ کو دیں اُن کے پسر کا پُرسا
کر لیں پیاسوں کی عزاداری و ماتم، رولیں
ہے یہی عیش بڑا، کھول کے جی ہم رولیں
ہوا آراستہ عترت کے لیے ایک مکاں     آیا لوٹا ہوا اسباب، بچھا فرشِ فغاں
پردے در اور دریچوں پہ ہوئے آویزاں     بیٹھے آرام سے اک گوشے میں سب دل زدگاں
خاص و عام آن لگے تعزیتِ غم کے لیے
حرمِ قصرِ شہی جمع ہیں ماتم کے لیے
خندۂ جبر کی آنکھوں میں بھرے ہیں آنسو     طمعِ جاہ و حشم و زر نے بکھیرے گیسو
عیشِ دو روزہ کے دامن سے ٹپکتا ہے لہو     صبر کی کرتے ہیں تلقین جفا جو بدخو
صبر کے نام سے زینب کا جگر پھٹتا ہے
پُرسا دیتے ہیں ستم گار تو دل کٹتا ہے
ضبطِ سجاد کی آنکھوں سے ہیں آنسو جاری     سیدِ قافلۂ صبر پہ ہے غم طاری
عورتوں بچوں کی اب تک رہی ذمّے داری     بارِ زنجیر سے رسوائی کا غم تھا بھاری
اب کہیں رخصتِ اظہارِ الم پائی ہے
بعد اک سال کے اشکوں کی گھٹا چھائی ہے

گر کوئی کہتا ہے صبر اے شہہ ذیشاں کیجیے — کہتے ہیں سیّدِ سجادؑ عجب حسرت سے
بھائی کچھ سوچ، کچھ انصاف سے بھی کام تو لے — ایک یوسفؑ سے جدا حضرت یعقوبؑ ہوئے
علم تھا زندہ ہیں، پھر بھی نہ گھٹا غم اُن کا
بِل کے بیٹے سے بھی رونا نہ ہوا کم اُن کا

میں نے اک روز میں کھوئے ہیں بہتر یوسف — کم سِن اور بوڑھے، جواں اور دلاور یوسف
خوش رُخ وخوش سخن وخوش خو وخوشتر یوسف — صف شکن، صاحبِ شمشیر، غضنفر یوسف
ایک یوسفؑ کا تو قرآن بھی نوحا لکھے
اتنے یوسفؑ جو بچھڑ جائیں تو غم کیا لکھے

احمدؐ وحیدرؑ و زہرؑا کے دل و جاں تھے سب — عرشِ اسلام کے خورشیدِ درخشاں تھے سب
شرف وفضل میں رشکِ مہ کنعاں تھے سب — صدقِ پیغمبرؐ اخلاص کے قرآں تھے سب
صبر کیسے کریں ایسوں کو گنوانے والے
میرے یوسف تو پلٹ کر نہیں آنے والے

کس طرح اشک تھمیں، اکبرؑ واصغرؑ بچھڑے — لال زینبؑ کے گئے، قاسمِ شبّرؑ بچھڑے
علَمِ عشق گرا، نائبِ حیدر بچھڑے — ایک ہی دہر میں تھے سبطِ پیمبرؐ، بچھڑے
بچھڑے سب بھائی بر ے اور چچا قتل ہوئے
رو کے ہر اک کو امامِ دو سرا قتل ہوئے

سُن کے دشمن بھی یہ حسرت کا بیاں روتے ہیں — سینہ زن عورتیں ہیں، پیر و جواں روتے ہیں
دوست کرتے ہیں بکا، دشمنِ جاں روتے ہیں — پھیر کر چہروں کو قتالِ جہاں روتے ہیں
گھر میں زینب نے بچھائی ہیں صفیں ماتم کی
سینۂ شام میں اُتری ہیں شعاعیں غم کی

صفِ ماتم سے اُٹھیں کانپ کے زینب اک بار — دل کو تڑپانے لگا بھائی کا شوقِ دیدار
کہا لائی نہ خزاں کیوں مرے سرہانے بہار — کب سے بے تاب ہے دیدار کو آلِ اطہار
دوڑے خدام کہ ایمان کے ہدیے لائیں
کربلا میں جو ہوئے نذر وہ فدیے لائیں

منتظر ہیں حرمِ پاک کہ آتے ہیں حسین    باہیں پھیلائے ہیں مائیں کہ ملیں نورالعین
بھائیوں کے لئے بہنوں کی وفا ہے بےچین    وارثوں کے لئے بیواؤں کے لب پر ہیں بین
اپنے پیاروں کے سب اوصاف بیاں کرتی ہیں
بی بیاں کھول کے بالوں کو فغاں کرتی ہیں

در پہ شور اُٹھا کہ سرہائے شہیداں آئے    راستا دو کہ سرِ سیّدِ ذی شاں آئے
جھکے تعظیم کو غم، شاہِ غریباں آئے    اُن کے ہمراہ عزیزاں و رفیقاں آئے
ہر طرف ہائے حسینا کی صدا آتی ہے
صاف اس شور میں زہرا کی صدا آتی ہے

کہیں بچھڑے ہوئے یوں آ کے نہ ملتے ہوں گے    غمِ فرقت نے یہ نظارے نہ دیکھے ہوں گے
چھوڑ کر جسموں کو سر گھر میں نہ آئے ہوں گے    ایسے تابوت کہیں پر بھی نہ اُٹھے ہوں گے
کرتے ہیں صبر زدہ اپنے شہیدوں پہ فغاں
یاس کرتی ہے محبت کی امیدوں پہ فغاں

گود میں ماں کی ہے رکھا ہوا شش ماہے کا سر    تشنگی ہے متبسّم کہ ہیں لب خون میں تر
کہتی ہے اتنے دنوں سے تھے کہاں تم اصغرؑ    ڈھونڈنے تم کو گئی خلد تمہاری خواہر
کہیں دیکھا ہو تو بتلاؤ سکینہؑ ہے کہاں
اُن سروں میں سرِ سلطانِ مدینہ ہے کہاں

شاہ نے خود ہی بنائی تھی تمہاری تربت    گھر میں آئے تھے سُلا کر تمھیں گریاں حضرت
باپ ماں کوئی نہ تھا پاس تو ہوگی وحشت    شام ہوتے ہی بڑھی ہوگی لحد کی ظلمت
ماں کے ساتھ آنے کو کٹوا دیا کیوں سر بیٹا
ماں نثار، آئے بہت دوُر سے چل کر بیٹا

ہم لیلیٰ سے بہت دن میں ملے ہیں اکبر    کہتی ہیں چاند برے، تجھ کو لگی کس کی نظر
کس نے چھیدا مرا دل زینبِؑ مضطر کا جگر    منتظر ہوگی مدینے میں ابھی تک خواہر
چھن گئی ماں کی ردا، تم نے بچایا بھی نہیں
آ کے سجادؑ کو زنداں سے چھڑایا بھی نہیں

صبحِ عاشور کی آتی ہے اذاں اب بھی یاد    غش سے اُٹھ کر تمھیں ڈھونڈا کیے پہروں سجاد
ماں کا کیا ذکر کہ ہونا ہی تھا اُس کو برباد    پوچھتے حال پھوپھی کا تو مرے نیک نہاد
لینا تھا بالی سکینہ کی خبر تو بیٹا
جاتے صغرا کے لئے لوٹ کے گھر تو بیٹا

سرِ عباس لیے بیٹھی ہیں کلثومِ حزیں    سر کو نیوڑھائے ہوئے روتی ہے بیوہ غمگیں
بین کرتے ہیں یہ رو رو کے لب صبر آگیں    آپ کے ہجر میں دنیا سے گئے سرورِ دیں
اتنے دن گزرے مگر نامہ نہ پرچا بھیجا
پیاری تھی صرف سکینہ، اُسے بُلوا بھیجا

سرِ قاسم پہ بیاں کرتی ہے ماں چلّا کر    مجھ کو تم بھول گئے تو نہیں شکوہ دل پر
یہ گلہ ہے کہ دُلہن کی بھی نہ لی تم نے خبر    بین کرنا بھی نہیں جانتی وہ خستہ جگر
تم جو ہوتے اُسے ظالم نہ پریشاں کرتے
تم پہ واجب تھا کہ پردے کا تو ساماں کرتے

گود میں بیوۂ مسلم کے ہیں دو بچوں کے سر    باہوں میں زوجۂ عباس کی ہے فرقِ پسر
کچھ سروں پر ہیں کنیزانِ حرم نوحہ گر    سر پہ مہمانوں کے روتی ہیں رفیقانِ سفر
بھائی کے سر کو نہیں چھوڑتی دُکھیا زینب
چومتی ہے کبھی گیسو، کبھی چہرا زینب

کہتی ہے لے کے بلائیں مرے شاکر بھیا    ستم و ظلم میں خواہر رہی صابر بھیا
بننے پائی نہ میں تربت کی مجاور بھیا    کربلا جاؤں گی اب بن کے میں زائر بھیا
آپ کا حکم تھا کوفے سے کُھلے سر گزری
ہم پہ کیا کیا سرِ دربار ستم گر گزری

چین پایا ہے بڑی آبلہ پائی کے بعد    آپ آئے ہیں بہت دن کی جدائی کے بعد
مشورہ دیجے کہاں جائیں رہائی کے بعد    گھر بھی زندان ہے اُمت کے فدائی کے بعد
قبر کو پیاسی سکینہؑ کی میں کیوں کر چھوڑوں
آپ کی بیٹی کو زندان میں کس پر چھوڑوں

کسی عورت نے یہ زینبؑ کے قریں آ کے کہا　　بین ہر سر کے لیے کرتے ہیں اُن کے ورثا
دو سر ایسے ہیں نہیں کرتا کوئی جن پہ بُکا　　شاید اِن بچوں کی مادر بھی نہیں ہے زندہ
صابرہ بولی کہ ہیں یہ مرے دلبر لوگو
میں ہی اِن دونوں غریبوں کی ہوں مادر لوگو

دیکھا بچوں کو تو دل ہو گیا ماں کا بے تاب　　دوڑ کر دونوں کے سر لے لیے گودی میں شتاب
بولیں پوچھیں بن جعفر تو میں کیا دوں گی جواب　　اُن دنوں آئی تمھیں موت جب آنا تھا شباب
باپ کے واسطے پیغام زبانی دے دو
گھر کو ماں جاتی ہے کچھ اپنی نشانی دے دو

بھائی کو روتی تھی میں، کرتی تھی اکبر پہ فغاں　　میں نے دیکھا نہیں، تم ماں کی طرف ہو نگراں
غم ہزاروں تھے، تمھیں یاد بھی کرتی تو کہاں　　یہ نہ سمجھو کہ تمھیں بھول گئی دُکھیا ماں
سونے کو لیٹوں تو سینے میں دھمک ہوتی ہے
دونوں ہی پہلوؤں میں اب بھی کسک ہوتی ہے

سوچتی تھی مجھے بیٹوں کا سہارا ہے بہت　　جب چھنی سر سے ردا تم کو پکارا ہے بہت
یہ نہ سوچو مجھے اکبر ہی دُلارا ہے بہت　　خواب میں بیٹوں کا گیسو بھی سنوارا ہے بہت
روٹھے ہو کس لیے بے جرم و خطا مادر سے
کیا علم کے لیے ہو اب بھی خفا مادر سے

سُن کے دُکھیوں کی فغاں سیدِ سجاد آئے　　دیکھ کر بی بیوں کا حال بہت گھبرائے
ضبط کی پلکوں پہ خورشید و قمر تھرائے　　کہا اس غم کے سوا اب نہ خدا رُلوائے
جذب سینے میں ہر اک اشکِ الم کرتے ہیں
خشک سجاد ہر اک دیدۂ نم کرتے ہیں

صبرِ زینب کا سہارا ہے ثباتِ عابد　　ناخدا غم کے سفینے کی ہے ذاتِ عابد
سفرِ ضبط مسلسل ہے حیاتِ عابد　　ناخدا ہے غمِ انساں کی نجاتِ عابد
اور کرنا ہے سفرِ غم کی قیادت کے لیے
کربلا جانا ہے قبروں کی زیارت کے لیے

کربلا ڈھونڈتا ہے اِن کے قدم کے آثار    لینے آئے گا انھیں اُٹھ کے شہیدوں کا غبار
راستہ دیکھتا ہے کب سے مدینے کا دیار    منتظر قبر ہے زہراؑ کی، محمدؐ کا مزار
چلیے بیمار بہن کو بھی سہارا دیجے
مادرِ حضرتِ عباسؑ کو پُرسا دیجے

سفرِ سیدِ سجادؑ بہت لمبا ہے    کہیں جنگل ہے، کہیں آنسوؤں کا دریا ہے
کہیں کوفہ ہے کہیں شام، کہیں صحرا ہے    اک قدم کرب و بلا، ایک قدم بطحا ہے
انقلاب اُٹھیں گے ہر نقشِ قدم پر اِن کے
حشر تک ہوں گے نہ پسپا کبھی لشکر اِن کے

ضامنِ صحتِ جاں ہے یہی بیمار اب بھی    اس کے ہونٹوں سے ہے گویا لبِ اظہار اب بھی
یہ گرفتار ہے آزادوں کا سالار اب بھی    گلہ گو اِس کے ہیں طوق و رسن و دار اب بھی
حق کو بے باک کیا ظلم کی سرکاروں میں
عام کی حریتِ فکر عزاداروں میں

(24 جنوری، 1977 کو آغاز ہوا اور 6 مارچ، 1977 کو مکمل ہوا)

**وحید اختر** بنیادی طور پر فلسفے کے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنا ادبی سفر ترقی پسند ادبی تحریک کے عروج کے زمانے میں شروع کیا لیکن بہت جلد ترقی پسند ادبی نظریہ سازوں کی انتہاپسندی سے بد دل ہوکر جدیدیت کی طرف مائل ہو گئے اور ان کی تحریروں نے جدیدیت کے فروغ و استحکام میں اہم رول ادا کیا۔ وہ اردو کے کلاسیکی ادبی سرمایے پر گہری نظر رکھتے تھے اور جدید ادبی سرمایے پر بھی۔ فارسی ادب سے بھی ان کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ ان کا شمار اردو کے اہم جدید شعرا میں ہوتا ہے۔ گذشتہ دہائیوں میں وحیداختر کی نظمیں بطور خاص موضوع بحث رہیں ہیں۔ وحیداختر کے مراثی کا حوالہ بھی اکثر آتا رہا ہے۔ ان کے تمام شعری مجموعے کی دستیابی اب آسان نہیں۔ اس لیے ان کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان کی شاعری کا یہ انتخاب ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے کیا ہے جو کلیات وحیداختر (نثر) کی چھ جلدیں ترتیب دے چکے ہیں۔ سرورالہدیٰ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں دیوان اشرف علی خاں فغاں، دیوان امداد امام اثر، محمد حسن: نقاد اور دانشور، شہریار اور پروفیسر مینیجر پانڈے کی کتاب کا اردو ترجمہ 'ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر' وغیرہ شامل ہیں۔ وہ شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ISBN 978-93-5160-197-5
9 789351 601975

فروغ اردو بھون
NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی-110025

قیمت -/215 روپے